جلد ۲۳ و قد اخذ میثاقکم ان کنتم مومنین عدد ۲ تا ۷

ماہنامہ

میثاق

لاہور

اشاعت خصوصی ، مشتمل بر رپورتاژ و مقالات

تیسری سالانہ

قرآن کانفرنس

۲۱ تا ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء ـــــ ٹاؤن ہال ○ لاہور

مدیر مسئول

ڈاکٹر اسرار احمد

یکے از مطبوعات

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

۱۲۔ افغانی روڈ ، سمن آباد ۔ لاہور

چندہ سالانہ ۔/۱۵ (فون : ۴۱۳۹۴۵) قیمت فی نسخہ ۔/۶

الحمد للہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی دو مایۂ ناز تصانیف جو کچھ عرصہ سے دستیاب نہ تھیں
دوبارہ طبع ہو گئی ہیں :

—— (۱) ——

دعوتِ دین

اور اس کا طریقِ کار

۱۸ X ۲۲/۸ کے ۲۱۲ صفحات ، مضبوط جلد اور خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ
ہدیہ : ۱۰/-

—— (۲) ——

اسلامی قانون کی تدوین

۱۸ X ۲۲/۸ کے ۹۶ صفحات ، مضبوط جلد اور خوشنما ڈسٹ کور کے ساتھ
ہدیہ : ۶/-
(ہم سے براہ راست طلب فرمانے پر پندرہ فی صد رعایت)

—— شائع کردہ :——
مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور
۱۲- افغانی روڈ ، سمن آباد - لاہور (فون : ۴۱۳۹۴۵)

فہرست مضامین

- تذکرہ وتبصرہ ..... اسرار احمد ۲
- رپورتاژ تیسری سالانہ قرآن کانفرنس ..... قاضی عبدالقادر ۹

مقالات

- ★ مسلمانوں کے قرآن حکیم سے بُعد و بیگانگی کے اسباب ..... پروفیسر یوسف سلیم چشتی ۳۳
- ★ اقبال اور وجودِ مصدّقہ ..... خواجہ غلام صادق ۴۷
- ★ "ہر فرد ہے ملّت کے مقدر کا ستارا" ..... جناب خالد ایم اسحٰق ۵۹
- ★ قرآن مجید کی معجزانہ تاثیر ..... ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک ۷۰
- ★ اعجازِ قرآن ..... مولانا محمد مالک مدظلہٗ ۷۷
- ★ فضیلتِ قرآن ..... مولانا سید حامد میاں مدظلہٗ ۹۹
- ★ شاہ ولی اللہ دہلوی اور علوم القرآن ..... مولانا ڈاکٹر محمد مظہر بقا ۱۱۱
- ★ قرآن اور تصورِ ملکیت ..... مولانا محمد طاسین صاحب ۱۳۸

رفتارِ کار، دعوت رجوع الی القرآن

- ★ روداد کراچی ..... ناظم ذیلی دفتر کراچی ۱۶۷
- ★ روداد سکھر ..... جناب نجیب صدیقی ۱۷۷

یادِ رفتگاں

- ★ "اِک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی" ..... اسرار احمد ۱۸۴
- ★ مولوی محی الدین سلفی مرحوم ..... " " ۱۸۵

خطوط و نکات

- ★ مکتوب گرامی ڈاکٹر نثیر بہادر خاں پٹنی، ایبٹ آباد ۱۹۵
- ★ اقتباسات از مکتوب گرامی زبیر عمر صدیقی، مکہ مکرمہ ۱۹۷

ضمیمہ: اسلام کی نشاۃ ثانیہ کا ایک اہم سنگ میل: قرآن اکیڈمی ..... ڈاکٹر فہیم الدین خواجہ ۱۸۱

اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

تذکرہ و تبصرہ

ویسے تو پابندی و باقاعدگی اشاعت کے اعتبار سے 'میثاق' کی کیفیت کبھی بھی قابلِ رشک نہیں رہی، تاہم اس بار ایک نہ دو پورے چھ ماہ کا جو وقفہ پڑا ہے وہ اس کے باوجود کہ بالکل ناگہانی بھی تھا اور خالص اضطراری بھی، تاہم قارئینِ 'میثاق' کی طرح ہم پر بھی نہایت شاق گذرا ہے ـــــ بقولِ عدم

گذر تو خیر گئی ہے عدم حیات مگر ستم ظریف بڑی بے رُخی سے گذری ہے!

جیسے کہ 'میثاق' کے مستقل خریدار حضرات کو مطلع بھی کر دیا گیا تھا، ہوا یہ کہ 'میثاق' کے ناشر مولوی محی الدین سلفی مرحوم کا ۸ جنوری ۷۶ء کو جدّہ میں اچانک انتقال ہو گیا۔ مرحوم اواخر ۷۵ء میں حجاز روانہ ہونے سے قبل 'میثاق' کے ڈیکلریشن کی راقم الحروف کے نام منتقلی کے کاغذات مکمل کر کے دے گئے تھے اور اس سلسلے میں دفتری کارروائی کا آغاز بھی اُسی وقت سے کر دیا گیا تھا۔ تاہم خیال یہ تھا کہ جب تک منتقلی کی رسومات (FORMALITIES) پُوری ہوں، پرچہ اُن ہی کے نام کی پرنٹ لائن کے ساتھ چھپتا رہے گا لیکن ع "ما در چہ خیالیم و فلک در چہ خیال"! کے مصداق قضائے الٰہی سے مولوی صاحب اچانک راہیِ عالمِ آخرت ہو گئے۔ لہٰذا اب ڈیکلریشن کی باضابطہ منتقلی کے بغیر اشاعت خارج از بحث ہو گئی۔ چنانچہ امکان بھر بھاگ دوڑ کی گئی تو اس کے باوجود کہ کوئی غیر معمولی رکاوٹ کسی مرحلے پر پیش نہیں آئی، محض سُرخ فیتے کے تقاضے پورے ہونے میں کم و بیش چھ ماہ صرف ہو گئے۔

تاہم یہ بھی اللہ تعالیٰ کی خاص حکمت ہی کے تحت ہوا کہ مولوی صاحب مرحوم انتقالِ ڈیکلریشن کے کاغذات از خود مکمل کر کے دے گئے تھے، بغیر اس کے کہ راقم کے دل یا دماغ کے کسی بھی گوشے میں اس کا خیال تک آیا ہو ـــــ ورنہ اگر معاملہ بالکل نئے

ڈیکلریشن کا ہونا تو شاید ابھی چھ ماہ اور صرف ہو جاتے بلکہ پتہ نہیں کہ ڈیکلریشن منظور ہوتا بھی یا نہیں!

بہرحال اب جب کہ اللہ تعالیٰ نے اپنے فضل و کرم سے 'میثاق' کی کشتی کو اس بھنور سے نکال ہی دیا ہے تو اُسی سے دعا ہے کہ وہ اسے اپنے دین کی خدمت کے لیے قبول فرمالے اور ہماری حقیر سی مساعی میں برکت پیدا کرے اور ہمیں خلوص و اخلاص سے نوازے ـــــ ع "شاہاں چہ عجب گر بنوازند گدا را!"

'میثاق' کا یہ غیر معمولی ضخامت کا حامل شمارہ اگرچہ کئی ماہ کی اشاعتوں کے قائم مقام ہے تاہم اس پر ماہِ اشاعت کے طور پر جولائی ۱۹۷۶ء درج ہے۔ اس طرح یہ گویا راقم الحروف کے زیرِ ادارت 'میثاق' کا دسواں 'سالگرہ نمبر' ہے، اس لئے کہ راقم کے زیرِ ادارت 'میثاق' کا پہلا شمارہ جولائی ۱۹۶۶ء میں شائع ہوا تھا۔

اِس اشاعت کی دُوسری خصوصیت یہ ہے کہ اس پر 'میثاق' کی سترہ سالہ زندگی کے گوناگوں اَدوار میں سے ایک اہم دَور اختتام کو پہنچ رہا ہے اور اِن شاء اللہ العزیز آئندہ اشاعت سے 'میثاق' نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم کے الفاظ مبارکہ :-
"اِسْتَدَارَ الزَّمَانُ كَهَيْئَتِهٖ يَوْمَ خَلَقَ اللّٰهُ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضَ" کے مصداق اپنے اصل مقصدِ اجراء کے ساتھ کامل ہم آہنگی اختیار کر لے گا!

تفصیل اِس اجمال کی یہ ہے کہ 'میثاق' کے اجراء کی اصل غرض و غایت نہ تو یہ تھی کہ دین کی محض علمی خدمت کی جائے نہ یہ کہ دینی صحافت کے حلقے میں ایک ماہنامے کا اضافہ ہو جائے بلکہ اس کی اشاعت سے اصل مقصود ایک نئی دینی **دعوت** کا آغاز تھا۔

۵۷-۱۹۵۶ء میں جو لوگ جماعتِ اسلامی سے پالیسی کے اختلاف کی بناء پر علیحدہ ہوئے تھے ان کے حلقے میں ۵۸-۱۹۵۷ء کے دوران میں ایک نئی دینی تنظیم کے قیام کی کوششوں کا بازار پوری طرح گرم رہا تھا۔ ان مساعی کے بڑے مراکز دو

تھے: ایک لائل پور جہاں مولانا حکیم عبدالرحیم اشرف مدیر 'المنبر' ایسی فعّال اور متحرک شخصیت موجود تھی اور دوسرے منٹگمری (حال ساہیوال) جہاں ان سطور کا راقم اقامت پذیر تھا، اور جن مرکزی شخصیتوں کے گرد یہ مساعی گھوم رہی تھیں ان میں اوّلین حیثیت حاصل تھی مولانا امین احسن اصلاحی مدّظلہٗ کو اور دوسرے نمبر پر تھے مولانا عبدالغفار حسن مدّظلہٗ۔

تقریباً دو سال تک یہ کوششیں پورے شدّ و مدّ سے جاری رہیں لیکن افسوس کہ جیسے جیسے وقت گذرا یہ مرحلہ کٹھن سے کٹھن تر ہوتا نظر آنے لگا ——— تا آنکہ اواخر ۱۹۵۸ء میں سفرِ حج سے واپسی پر مولانا امین احسن اصلاحی نے احباب کے ایک اجتماع میں اپنی اس رائے کا اظہار فرمایا کہ محض جماعتِ اسلامی سے سابقہ تعلق کی منفی اساس پر کوئی نئی تعمیر نہ عملاً ممکن ہے نہ اُصولاً درست۔ اس کے برعکس میں چاہتا ہوں کہ ایک ماہنامے کے ذریعے نئی دینی دعوت کا مکمّل ہیولیٰ اور اس کے لائحۂ عمل کا مفصّل نقشہ پیش کر کے لوگوں کو اُس میں شمولیت کی دعوت دوں لہٰذا اوّلاً ایک نئے ماہنامے کے اجراء کی سبیل پیدا کی جانی چاہیئے۔ احباب کے لیے ظاہر ہے کہ، اعتراض یا اختلاف کی کوئی گنجائش ہی نہ تھی۔ چنانچہ وہیں کچھ رقم جمع ہوئی اور 'میثاق' کے اجراء کا فیصلہ ہو گیا ——— الحمدللہ کہ ان سطور کے راقم کو بھی اس اہم اجتماع اور اُس ابتدائی رقم کی فراہمی میں شمولیت کا شرف حاصل ہے۔

ابتدائی انتظامات کے مراحل طے کر کے ——— جون ۱۹۵۹ء میں 'میثاق' کا پہلا شمارہ مولانا اصلاحی صاحب کے زیرِ ادارت شائع ہوا جس میں مولانا نے اس کے مقصدِ اشاعت کی وضاحت کے لیے ایک مفصّل تحریر[1] سپردِ قرطاس کی جس کا لُبِّ لُباب یہ ہے:

"اس رسالے کا نام 'میثاق' محض اتفاق سے نہیں رکھ لیا گیا ہے۔ بلکہ یہ نام سوچ سمجھ کر انتخاب کیا گیا ہے۔ یہ نام بڑی حد تک اس مقصد کو تعبیر کرتا ہے جو اس کے نکالنے سے پیشِ نظر ہے۔

[1] صفحہ ۲۰۰ پر دیکھئے

لُغت میں 'میثاق' سے مراد وہ عہد و پیمان ہوا کرتا ہے جو شعور اور ارادے کے ساتھ پورا کرنے کے لیے باندھا جائے۔ قرآن و حدیث میں اس کا مفہوم اس سے بہت بلند ہے اور چونکہ وہی مفہوم اس نام میں ہمارے پیشِ نظر ہے اس وجہ سے اس کو سمجھ لینا ضروری ہے۔

قرآن مجید میں اس سے مراد وہ عہد و پیمان ہے جو خدا اور اس کے بندوں کے درمیان ہوا ہے۔ قرآن میں اس قسم کے دو میثاقوں کا ذکر ہے .....

اوپر کی تفصیلات سے یہ بات واضح ہو گئی ہو گی کہ اس رسالہ کی اصل دعوت 'تجدیدِ میثاق' کی دعوت ہے۔ دوسری چیزیں، جن کا میں نے حوالہ دیا ہے یا جو آئندہ اس کے صفحات میں آئیں گی سب اسی مقصد کے تحت اور اسی کی توضیح و تائید کے لیے آئیں گی۔ اس دعوت کے لیے خود قرآن اور پیغمبر صلی اللہ علیہ وسلم کا بتایا ہوا ایک مخصوص نظام اور پروگرام بھی ہے جو مجھے واضح کرنا ہوگا۔"

لیکن بعد میں اللہ ہی بہتر جانتا ہے کہ کیا وجہ ہوئی۔ آیا مولانا نے اس دعوتی کام کو اپنی علمی وجاہت کے منافی جانا یا "دعوتِ دین اور اُس کا طریق کار" ایسی معرکۃ الآراء کتاب کے مؤلف و مصنف نے خود اپنے آپ کو دعوت کے میدان کا مرد نہ پا کر اس بھاری پتھر کو چوم کر چھوڑ دینے ہی میں عافیت سمجھی، یا کوئی خارجی سبب (مثلاً ایوب خاں مرحوم کا لایا ہوا فوجی انقلاب) آڑے آ گیا، بہرحال ہوا یہ کہ 'میثاق' کے اجراء کا مقصدِ اصلی تو پسِ منظر میں غائب ہوتا چلا گیا اور اس نے رفتہ رفتہ ایک خالص علمی ماہنامے کی صورت اختیار کر لی۔

اب ظاہر ہے کہ کسی خالص علمی جریدے کی اشاعت کے جاری رہنے کی دو ہی صورتیں ممکن ہوتی ہیں: ایک یہ کہ کوئی سرکاری یا نیم سرکاری ادارہ اُس کی پشت پر ہو جس کو سالانہ گرانٹ کی صورت میں خطیر رقوم ملتی ہوں، یا وہ کسی مضبوط مذہبی فرقے یا گروہ کا حلقہ بگوش ہو تاکہ مسلسل چندے ملتے رہیں، اور دوسری یہ کہ اس کی پشت پر کوئی زوردار دعوت موجود ہو جو اپنا ایک حلقہ پیدا کرتی چلی جائے۔ اور 'میثاق' کے معاملے

میں نہ پہلی صورت موجود تھی نہ دوسری، لہٰذا ابتدائی جوش و خروش کے تحت کوئی دو سال کے لگ بھگ تو پرچہ پوری آن بان اور شان و شوکت کے ساتھ چلتا رہا لیکن پھر اس کی سٹیم ختم ہوتی محسوس ہوئی اور اُس نے ہچکولے کھانے شروع کر دیئے چنانچہ اشاعت بے قاعدہ ہوگئی اور طویل وقفے پڑنے شروع ہوگئے، درمیان میں ایک مرحلے پر (مئی ۱۹۶۳ء میں) چند ہم خیال لوگوں نے آگے بڑھ کر "مجلسِ انتظامیہ، ماہنامہ 'میثاق' لاہور" کے نام سے منظم ہو کر سہارا دینے کی کوشش بھی کی، لیکن تا بہ کے ؟ آخر کار وسط ۱۹۶۵ء میں پرچہ بالکل بند ہوگیا۔ اور اس طرح 'میثاق' کا دورِ اوّل چھ سال کے مختصر عرصے میں عروج و زوال کے جملہ مراحل سے گذر کر اختتام کو پہنچ گیا۔

ادھر اوائل ۱۹۶۶ء میں راقم الحروف تقریباً بارہ سال کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ وارد لاہور ہوا اور اس نے بخیالِ خویش اس اصل تحریکِ اسلامی کے احیاء کا بیڑا اٹھایا جس کا آغاز برِّصغیر پاک و ہند میں ۱۹۴۱-۴۰ء میں جماعتِ اسلامی نے کیا تھا اور جس سے قیامِ پاکستان کے بعد وہ خود منحرف ہوگئی تھی، تو اس نے اوّلاً اپنی تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی : ایک تحقیقی مطالعہ" شائع کی اور ثانیاً "الرّسالہ" کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن بھی حاصل کر لیا ——— لیکن جب اس کا علم مولانا اصلاحی صاحب کو ہوا تو انہوں نے فرمایا کہ :- "میثاق بند پڑا ہے اور مجھے اِس کے نام سے ایک ذہنی اور قلبی تعلّق ہے، بجائے کسی نئے پرچے کے اجراء کے تم کیوں نہ اسی کو اپنے ہاتھ میں لے لو۔ اس طرح کم از کم اس کا نام تو زندہ رہے گا!" راقم کے لیے تو مولانا کا یہ فرمانا حُکم کے درجے میں تھا ہی 'میثاق' کے ناشر مولوی محیّ الدّین سلفی مرحوم کے بھی گویا یہ دل کی آواز تھی ——— چنانچہ جولائی ۱۹۶۶ء سے 'میثاق' کے دوسرے دَور کا آغاز ہوگیا۔

گذشتہ دس سالوں کے دَوران راقم کے زیرِ ادارت بھی 'میثاق' کئی مراحل سے گذر چکا ہے :

اوّلاً ـــــ ۶۷-۱۹۶۶ء کے دوران میں اصل زور اس پر رہا کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدہ ہونے والے لوگ ایک نظم میں منسلک ہو کر اسی مقصد کے لیے کام کریں جس کے لیے وہ جماعت میں شامل ہوئے تھے اس لیے کہ جماعت سے علیحدگی صرف پالیسی سے اختلاف کی بنا پر ہوئی تھی۔ اس زوردار للکار کے نتیجے میں اِس حلقے کی باسی کڑھی میں واقعۃً اُبال کی سی کیفیت پیدا ہو گئی۔ چنانچہ اواخر ۱۹۶۷ء میں "قراردادِ رحیم آباد" اور "اجتماع رحیم یار خاں" کا نتیجہ "ایک نئی اسلامی تنظیم کے قیام کا فیصلہ" کی صورت میں برآمد ہوا، جس کا نام مولانا امین احسن اصلاحی نے باصرار "تنظیم اسلامی" رکھوایا ـــــ لیکن ایک بار پھر محسوس ہوا کہ محض کسی سابق تعلق کی بنیاد پر جمع ہونے کی کوشش بے سُود ہے۔ چنانچہ وہی ہوا جو ہونا چاہیئے تھا، یعنی ؏

"اُڑنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے!"

اِس ناکامی کے بعد جب راقم الحروف نے طے کیا کہ اب اپنی ہی حقیر سی صلاحیت اور استعداد کے بل پر ایک نئی دینی دعوت کا اجراء کرنا ہوگا۔ تو چونکہ اُسے راقم نے ابتداءً "دعوتِ رُجوع اِلَی القرآن" کی شکل دی اور اپنی ساری قوتوں اور توانائیوں کو مجالسِ درسِ قرآن مجید اور حلقہ ہائے مطالعۂ قرآنِ حکیم کے قیام و تنظیم پر مرتکز کر دیا لہٰذا ۶۹-۱۹۶۸ء کے دوران 'میثاق' میں ایک خلا سا رہا اور وہ بس : ؏
"خط لکھیں گے گرچہ مطلب کچھ نہ ہو!" کے سے انداز میں ایک نیم دینی، نیم علمی اور نیم سیاسی ماہنامے کی حیثیت سے شائع ہوتا رہا۔

لبعد ازاں جب اللہ تعالیٰ کے فضل و کرم سے اِس "دعوتِ رُجوع اِلَی القرآن" نے ایک چھوٹی سی تحریک کی صورت اختیار کر لی تو 'میثاق' بھی اُس کا آرگن بن گیا۔ اور اگرچہ پہلے تین سال یعنی ۱۹۷۰ء سے ۱۹۷۲ء تک یہ راقم کے ذاتی ادارے "دارالاشاعت الاسلامیہ" کے تحت شائع ہوا اور بعد کے تین سال یعنی از جنوری ۷۳ء تا امروز باقاعدہ "مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور" کے تحت، تاہم ان پورے چھ سالوں کے دوران میں اس کی اصل حیثیت اِسی "دعوتِ رُجوع اِلَی القرآن" کے نقیب

ترجمان کی رہی۔

جیسا کہ 'میثاق' کے اکثر قارئین کے علم میں ہے راقم نے ماہ جولائی ۱۹۷۴ء ہی میں "دعوتِ رجوع اِلی القرآن" سے بڑھ کر ایک ہمہ گیر دینی دعوت کے آغاز اور اُس کے لیے ایک باقاعدہ دینی جماعت کے قیام کا فیصلہ کر لیا تھا۔ تاہم اللہ کا شکر ہے کہ راقم نے جلد بازی سے کام نہیں لیا بلکہ "سہج پکے سو میٹھا ہو" کے اصُول کے تحت دھیمی رفتار اختیار کی۔ چنانچہ ۱۲ر جولائی ۱۹۷۴ء کو بیس روزہ قرآنی تربیت گاہ کے اختتام پر اپنے متذکرہ بالا عزم کا اظہار کر کے راقم نے احباب و رفقاء کو بھی مزید غور کر لینے کی مہلت دی اور خود بھی دو قریبی رفقاء کے ساتھ حجِ بیتُ اللہ کے لیے روانہ ہو گیا۔ اس لیے کہ بقولِ حضرتِ اکبر :

یہ عزم ترا سعی سے دمساز ہو کیونکر؟ اسباب نہ ہوں جمع تو آغاز ہو کیونکر؟
اسباب کرے جمع خدا ہی کا ہے یہ کام! طالب ہو خدا سے تو دعا ہی کا ہے یہ کام

اور دُعا کے لیے ظاہر ہے کہ رُوئے ارض پر حرمین شریفین اور میدانِ عرفات سے زیادہ موزوں مقام اور کوئی نہیں!

بہرحال ۲۷، ۲۸ر مارچ ۱۹۷۵ء کو لاہور میں تنظیمِ اسلامی کا قیام عمل میں آگیا یا صحیح تر الفاظ میں تنظیمِ اسلامی کا احیاء ہو گیا اس لیے کہ راقم نے نہ صرف یہ کہ مولانا اصلاحی کے تجویز کردہ نام اور اجتماعِ رحیم یار خاں کی منظور شدہ قراردادِ تاسیس کو مع توضیحات جُوں کا توں برقرار رکھا بلکہ تنظیمِ اسلامی کی دعوت کی تعبیر کے لیے جو الفاظ اختیار کیے وہ بھی گویا 'میثاق' کے پہلے اداریے ہی سے ماخوذ ہیں یعنی :

"تجدیدِ ایمان - توبہ - اور تجدیدِ عہد"

تنظیم کے قیام کے بعد سابقہ تجربات کی بنا پر پہلے سال کے لیے راقم کا فیصلہ یہ تھا کہ نہ اُس کا زیادہ چرچا کیا جائے اور نہ ہی کوئی بہت لمبی چوڑی اُمیدیں وابستہ کی جائیں بلکہ اگر وہ چند ساتھی جو اس عظیم مقصد کے لیے جمع ہوئے ہیں فوراً منتشر نہ ہو جائیں بلکہ باہم جُڑے رہ جائیں تو اسی کو بڑی کامیابی سمجھا جائے، اللہ تعالیٰ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ

بقیہ صفحہ ۱۶۶ پر

تیسری سالانہ قرآن کانفرنس

۲۱ تا ۲۳ مارچ ۱۹۷۶ء ——— ٹاؤن ہال • لاہور

• ایک رپورتاژ •

از قلم ——— قاضی عبدالقادر ——— کراچی

گاڑی ایک جھٹکے کے ساتھ رکی ' لاہور اسٹیشن آگیا تھا۔ بیس گھنٹے سے زائد طویل سفر کے بعد ۔ منزل پر پہنچنے سے قبل ہی ساتھیوں نے سامان پیک کر لیا تھا۔ کچھ ساتھی نیچے اُتر گئے اور کچھ ڈبے میں رہ گئے! اور ذرا سی دیر میں سب سامان نیچے اتار لیا گیا ۔ میں اپنے ساتھیوں کے چہرے دیکھ رہا ہوں جو خوشی سے دمک رہے ہیں ——— منزلِ مقصود پر پہنچنے کی خوشی میں ——— اور منزلِ مقصود بھی کون سی ! ——— نہ کسی عزیز سے ملاقات' نہ کوئی کاروباری مصروفیت ' نہ کوئی تفریحی سفر ——— یہاں پہ عزیز ہیں تو اپنے رفقا ہیں ' ایک ہی منزل کے راہی ' یہاں اگر کوئی کاروباری مصروفیت ہے تو اس کاروبار کی جو عذابِ الیم سے چھٹکارا دلا دے ——— یہ سفر دین کے لئے ہے ' اس عظیم مقصد کے لئے ہے جس سے بہتر کوئی مقصد نہیں ۔

ہم سترہ ساتھی ایک دن قبل پونے دس بجے عوامی ایکسپریس کی بوگی ۱۳۱ سے کراچی سے روانہ ہوئے تھے ۔ عجب اتفاق ہے کہ پچھلے سال بوگی ۱۳۱ میں ریزرویشن ہوا تھا اور اس سال بوگی ۱۳۱ میں ۔ شاید اگلے سال ۱۳۱ ہماری قسمت میں لکھی ہو ۔ جہاں اتنے ساتھی ہوں وہاں سفر کا کیا پتہ چلتا ہے ۔ راستے میں آپس میں تفصیلی تعارف ہو رہا ہے ۔ اپنی زندگی کے اہم واقعات سنائے جا رہے ہیں ۔ رفقا بتا رہے ہیں کہ وہ کون سا موڑ تھا جو انہیں کھینچ کر تحریک رجوع الی القرآن کی جانب لایا ۔ اس طرح مل بیٹھنے کے موقعے پھر کہاں ملتے ہیں ۔ ہر رفیق دوسرے رفیق کو زیادہ سے زیادہ آرام پہنچانے کی فکر میں ہے ۔ امیرِ سفر شیخ جمیل الرحمٰن صاحب رفقا کو ہدایات دے رہے ہیں ۔ سفر کے آداب بتا رہے ہیں ۔ دینی مسائل پہ تبادلۂ خیال ہو رہا ہے ۔ حالاتِ حاضرہ کا تجزیہ ہو رہا ہے ۔ غرضیکہ یہ ایک ایسا سفر ہے کہ جی چاہتا ہے جاری رہے ۔ ہمارے ایک نئے رفیق بھائی محمد نقی نے سفر سے ایک ہفتہ قبل ہی نوٹس دے دیا تھا کہ سفر کے دوران تمام رفقا کے کھانے کا اہتمام وہ

کریں گے ۔ وہ بہت ہی پُرتکلف کھانا پکوا کر لائے ۔ دوپہر کا کھانا ، رات کا کھانا ، صبح کا ناشتہ اور اس کے بعد بھی کافی بچ گیا ۔ ان کے گھلانے کا انداز بھی نرالا تھا ۔ ایک ایک رفیق کا ہاتھ پکڑ پکڑ کر کہہ رہے تھے کہ بھائی کھاؤ ، بھائی اور کھاؤ ۔ ان کا پُرتکلف کھانا اور پھر کھلانے کا انداز معدے اور دل دونوں کو موہ رہا ہے ۔

سفر کے بیس گھنٹے گویا پلک جھپکنے میں گذر گئے ۔ اور لاہور کا اسٹیشن آگیا ۔ رفقاء کے چہروں پر تھکن کے کوئی آثار نہیں ، ایسے چاق و چوبند ہیں جیسے رات بھر کی نیند کے بعد ابھی بیدار ہوئے ہوں ۔

—— یہ ہیں جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب چند رفقاء کے ساتھ پلیٹ فارم پر اپنے تلے قدم رکھتے ہوئے تشریف لا رہے ہیں ۔ ڈاکٹر صاحب کو اسٹیشن پہنچنے میں ذرا سی دیر ہو گئی تھی لہٰذا آتے ہی سراپا معذرت بن گئے اور اپنے رفقاء سے —— ان سے جو ان کی قیادت میں دین کی راہ میں اپنا سب کچھ نچھاور کر دینا چاہتے ہیں —— اس طرح معذرت کر رہے ہیں جیسے کوئی بڑا بھاری قصور سرزد ہو گیا ہو ۔

—— ابھی تین روز قبل ہی کی تو بات ہے ، میں نے لاہور ٹیلیفون کیا تھا تو پتہ چلا تھا کہ ڈاکٹر صاحب بیمار ہیں ، اور ان کو ایک سو دو سے زائد ٹمپریچر ہے ۔ دل کو ایک دھچکا لگا —— میرے مولا رحم کر ، شفا تیرے ہی ہاتھ میں ہے ، دل سے ڈاکٹر صاحب کے لئے دعائیں نکلیں —— خدشہ تھا تو یہ کہ کل تین روز قرآن کانفرنس میں رہ گئے ہیں اور ڈاکٹر صاحب علیل ہیں ۔ اب کیا ہوگا ؟ تھوڑے بہت ٹمپریچر کو تو ڈاکٹر صاحب خاطر ہی میں نہیں لاتے ۔ ذہن میں بار بار یہ سوال گردش کرتا تھا کہ کیا ڈاکٹر صاحب کی شرکت کے بغیر قرآن کانفرنس کامیاب ہو سکے گی ؟ وہ تو اللہ تعالیٰ نے فضل کیا اور اس نے ہماری دعائیں سن لیں کہ ڈاکٹر صاحب کی طبیعت نسبتاً بہتر ہو گئی لیکن نقاہت چہرے سے اب بھی نمایاں ہے ۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض بھی کیا کہ آپ کی طبیعت ٹھیک نہیں ، پھر چند گھنٹے بعد قرآن کانفرنس کا آغاز ہونے والا ہے ۔ یہ آپ کی شدید معروفیت کا وقت ہے ۔ آپ یہاں کیوں تشریف لے آئے ؟ —— لیکن میرے سوال کا جواب ڈاکٹر صاحب کی ہلکی سی مسکراہٹ تھی جو زبانِ حال سے کہہ رہی تھی کہ میرے رفقاء ، میری زندگی کے ساتھی ، میرے دین کے سپاہی ، اتنا طویل سفر طے کر کے میرے شہر کی دہلیز پر قدم رکھیں اور میں ان کے خیر مقدم کو نہ آؤں ، یہ ناممکن ہے ۔ میں ان ہی خیالات میں گم تھا کہ ڈاکٹر صاحب کی آواز نے مجھے چونکا دیا ۔ وہ فرما رہے تھے کہ سب رفقاء اپنا اپنا سامان اٹھا لیں اور باہر چلیں ، کیا دیکھتا ہوں کہ اتنا کہہ کر ڈاکٹر صاحب نے بھی —— شدید نقاہت کے باوجود —— ایک رفیق کا سامان اٹھا لیا ۔ بھلا ہو ایک ساتھی کا کہ اس نے ڈاکٹر صاحب

سے وہ سامان لے لیا بلکہ لے کیا لیا چھین لیا۔ تھوڑی دیر میں ہم باہر تھے جہاں تین گاڑیاں جو ڈاکٹر صاحب ساتھ لے کر آئے تھے ہمارا انتظار کر رہی تھیں۔ ڈاکٹر صاحب نے سب رفقاء کا سامان رکھوایا، سب کو گاڑیوں میں سوار کرکے خود آخر میں بیٹھے۔

اور اب تینوں گاڑیاں منزل پر پہنچ چکی ہیں۔ ہم سمن آباد میں ہیں۔ ۲-۱۲ افغانی روڈ گیلپ ہے۔ ڈاکٹر صاحب کی جانب سے "آرڈر آف دی ڈے" ملا۔ کہ جو حضرات چالیس سال سے کم عمر کے ہیں وہ دوسری منزل پر قیام کریں گے اور جن کی عمر چالیس سے زائد ہے وہ یہیں نیچے رہیں گے۔ ذہن میں سوال ابھرا، درمیانی منزل کس کے لئے ہے؟ پتہ چلا کہ درمیانی منزل ان مقالہ نگار اور مقررین کے لئے مخصوص ہے جو بیرون لاہور سے تشریف لائیں گے۔

۱۲ افغانی روڈ سے منی بس میں سوار ہو کر اب ہم لوگ ٹاؤن ہال پہنچ گئے ہیں۔ پچھلے سال کی طرح اس سال بھی لاہور کے رفقاء نے ہمارے سہولت اور آرام کے لئے منی بس کا انتظام کیا ہے۔ ایک سوزوکی دین بھی ہے۔ تینوں دن یہ گاڑیاں ہمارے استعمال میں رہیں گی۔ لاہور کے رفقاء کی اپنی گاڑیاں ان پر مستزاد ہیں۔ وہ بھی باہر سے آئے ہوئے رفقاء کو لانے لیجانے میں اور دیگر انتظامات میں لگی ہوئی ہیں۔ باہر سے آنے والے تمام رفقاء کے قیام و طعام وغیرہ کا انتظام حسب سابق لاہور کے مہمان نواز رفقاء کی جانب سے ہے۔ کراچی کے علاوہ اب تک پنجاب اور سندھ کے مختلف شہروں کے بہت سے رفقاء کانفرنس میں شرکت کے لئے پہنچ چکے ہیں اور کچھ حضرات ابھی پہنچنے والے ہیں۔

اور لیجئے یہ ٹاؤن ہال آگیا۔ ہال کے دروازہ پر مقامی رفقاء خیر مقدم کے لئے کھڑے ہوئے ہیں۔ گیٹ میں داخل ہوتے ہی پہلی نظر مکتبہ پر پڑتی ہے۔ جہاں مرکزی انجمن خدام القرآن کی مطبوعات اور دیگر دینی کتب سلیقہ کے ساتھ ترتیب دی گئی ہیں۔ پچھلے سال مکتبہ اوپر کی منزل میں ہال کے باہر راہداری میں تھا۔ لیکن اس سال سامعین کے لئے راہداری میں مزید جگہ نکالنے کے لئے مکتبہ کو نیچے لے آیا گیا ہے۔

سیڑھیاں چڑھ کر پہلی منزل پر، ہم ہال میں داخل ہو چکے ہیں۔ نو بجنے میں چند منٹ باقی ہیں۔ قرآن کانفرنس کا پہلا اجلاس نو بجے شروع ہونا ہے۔ ہال تقریباً بھر چکا ہے اور لوگ ہیں کہ چلے آرہے ہیں۔ کارکن جلدی جلدی مزید کرسیاں لگا رہے ہیں۔ راہداریوں میں بھی کرسیاں بچھا دی گئی ہیں۔ قرآن کانفرنس کے ناظم جناب ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ نہایت مصروف نظر آرہے ہیں۔ ہر کام میں سلیقہ اور نفاست نظر آرہی ہے۔ جو ان کا طرۂ امتیاز ہے۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے

بڑے صاحب زادے عزیزم عارف رشید اسٹیج کے قریب ایک میز پر ٹیپ ریکارڈرز کو ہر طرح "تیار" رکھے ہوئے بیٹھے ہیں کہ ادھر سوئچ آن ہو اور ادھر ان کا کام شروع ہو جائے۔ لاؤڈ اسپیکر اور مائک پر چوہدری حبیب اللہ صاحب کی ڈیوٹی ہے۔ وہ ہر طرح سے اس بات کا اطمینان کر رہے ہیں کہ لاؤڈ اسپیکروں کی پوزیشن اس طرح ہو کہ آواز ہال میں، راہداریوں میں، خواتین کے حصہ میں اور نیچے سڑک پر ہر جگہ پہنچے اور صاف سنائی دے۔ ایک جانب کی پوری گیلری خواتین کے لئے ہے جہاں پردہ کا پورا انتظام ہے۔

اسٹیج کے اوپر ایک بہت بڑا بینر لگا ہوا ہے جس پر سورۃ جمعہ کی دوسری آیت نہایت ہی خوشخط تحریر ہے۔

"هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"

اس آیت میں نبی اکرمؐ کا طریق کار بیان کیا گیا ہے۔ مجھے یاد آیا پچھلے سال اسی جگہ جو بینر لگا تھا اس پر سورۃ صف کی آیت ۹ تحریر تھی جس میں نبی اکرمؐ کا مقصد بعثت بیان ہوا ہے۔ یعنی

"هُوَ الَّذِي أَرْسَلَ رَسُولَهُ بِالْهُدَىٰ وَدِينِ الْحَقِّ لِيُظْهِرَهُ عَلَى الدِّينِ كُلِّهِ وَلَوْ كَرِهَ الْمُشْرِكُونَ"

ہال میں قرآنی آیت کا ایک اور بینر بھی لگا ہے جس میں انسانوں اور جنوں کی تخلیق کی غرض و غایت بیان کی گئی ہے۔

وَمَا خَلَقْتُ الْجِنَّ وَالْإِنسَ إِلَّا لِيَعْبُدُونِ

آیات قرآنی کے ساتھ ہی علامہ اقبال کے اشعار کے دو بینرز بھی لگائے گئے ہیں۔ جو یہ ہیں:

گر تو می خواہی مسلماں زیستن — نیست ممکن جز بہ قرآں زیستن

بمصطفےٰ برساں خویش را کہ دیں ہمہ اوست
اگر بہ او نہ رسیدی تمام بولہبی است

ارے! یہ کون نوجوان ہے؟ مختار حسین فاروقی؟ کاموں میں اتنا مصروف کہ تن بدن کا ہوش نہیں۔ ابھی ۱۲ مارچ کو اس نوجوان کی شادی ہوئی ہے اور آج ۲۱ مارچ ہے۔

اور وہ کانفرنس میں ہمہ تن مصروف ـــــ گویا وہ بات نہیں شادی والی ـــــ جیسے یہ اس کی دوسری شادی ہو۔ جی ہاں، پہلی شادی تو وہ کبھی کی کر چکا ہے ـــــ اپنے عظیم مقصد کے ساتھ۔ اس مقدس اور حسین صداقت کے ساتھ جس کا علمبردار اگر طاغوت کے ساتھ پنجہ آزمائی کرتے ہوئے دنیا میں زندہ ہے تو غازی کہلائے اور نقد جان ہتھیلی پر رکھ کر سر کٹا دے تو شہید کہلائے :۔ ذٰلِكَ فَضْلُ اللّٰهِ يُؤْتِيهِ مَنْ يَشَآءُ!

نو بجے ڈاکٹر صاحب مائک پر تشریف لائے۔ وہ کہہ رہے ہیں "حضرات! ہمیں افسوس ہے کہ بعض انتظامی وجوہات کی بنا پر ہم اپنا یہ اجلاس ٹھیک نو بجے شروع نہیں کر پا رہے۔ انشاءاللہ یہ اجلاس پورے سوا نو بجے شروع ہو جائے گا۔ اور واقعی پہلے اجلاس کی کارروائی ٹھیک سوا نو بجے شروع ہو گئی۔ اور ڈاکٹر صاحب نے اللہ تعالیٰ کی حمد و ثنا اور حضورؐ پر درود و سلام کے بعد کارروائی کے آغاز کا اعلان کر دیا۔ ہال بالکل بھر چکا ہے، راہداریاں بھی بھر گئی ہیں۔ اور اب اسٹیج کے قریب اور کرسیوں کے درمیان فرش بچھایا جا رہا ہے تاکہ لوگ فرش پر بیٹھ سکیں۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں "ہم ہر سال کسی بڑی جگہ کے بارے میں سوچتے ہیں۔ لیکن کوئی معقول بندوبست نہیں ہو پاتا اور ہم ہر پھر کر اسی ٹاؤن ہال میں کانفرنس منعقد کرنے پر مجبور ہو جاتے ہیں۔ مجھے اس کا شدید احساس ہے کہ آپ میں سے بہت سے لوگ کھڑے ہیں۔ ہم نے یہاں اوپر مزید گنجائش نکالنے کے لئے اس سال مکتبہ بھی نیچے لگایا ہے۔ بہرحال یہ ذوق و شوق مبارک ہے اور ہمارے لئے نہایت حوصلہ افزا"

پروگرام کے مطابق اجلاس اوّل میں سب سے پہلے حسنِ قرأت کا ایمان افروز اور روح پرور پروگرام ہوا۔ جس کی صدارت قاری حسن شاہ صاحب بخاری نے فرمائی۔ ابتدا میں ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے مختصر الفاظ میں اس کی غرض و غائیت بیان کی۔ آپ نے نبی اکرمؐ کی حدیث سنائی کہ "قرآن کو اپنی آوازوں سے مزین کرو" اور آپؐ کا حضرت ابوموسیٰ اشعریؓ سے یہ فرمانا کہ "ابوموسیٰ تمہیں آلِ داؤد کے سازوں میں سے حصہ ملا ہے"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ خود نبی اکرمؐ صحابۂ کرامؓ سے قرآن کریم سنا کرتے تھے۔ اس سلسلہ میں آپ نے حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کا مشہور واقعہ بیان کیا۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ عربی سے ناواقفیت کا پردہ حائل نہ ہو تو قرآن کریم کے متن ہی میں وہ تاثیر ہے کہ جس کے بعد کسی درس قرآن کی ضرورت نہیں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن کریم کے اثرات کو ترجمہ میں منتقل نہیں کیا جا سکتا چاہے ترجمہ کتنا ہی اعلیٰ اور معیاری کیوں نہ ہو۔ لہٰذا ہم میں سے ہر شخص کو اتنی عربی تو جاننا چاہیئے کہ قرآن کا اثر ہمارے دل پر براہِ راست ہو سکے۔

حسنِ قرأت اور حسنِ تجوید کے اس پروگرام میں جن قراء کرام نے حصہ لیا ان کے اسمائے گرامی درج ذیل ہیں :۔

۱۔ قاری محمد شاکر انور صاحب (سورۃ آل عمران کا پہلا رکوع)
۲۔ قاری احمد میاں صاحب تھانوی (سورۃ بنی اسرائیل کی آیات)
۳۔ قاری عاکف سعید (ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے فرزند) (سورۃ شوریٰ کی ابتدائی آیات)
۴۔ استاذ محمود خلیل مصری کا ٹیپ (سورۃ شوریٰ کی آخری آیات و سورۃ والنّٰزعات)
۵۔ قاری محمد آصف صاحب (سورۃ توبہ کی آیت ان اللہ اشتریٰ.....)
۶۔ قاری مرتضیٰ حسین صاحب (سورۃ بقرہ کی آیات)
۷۔ قاری عبدالواحد صاحب (سورۃ البلد)
۸۔ قاری عبدالقیوم صاحب (سورۃ بقرہ ۔ ابتدائی آیات)
۹۔ قاری عبدالباسط صاحب کا ٹیپ (سورۃ یٰسین)
۱۰۔ قاری رحیم بخش صاحب (استاذ قرأت جامعہ اشرفیہ) (سورۃ قیامۃ)
۱۱۔ آخر میں صدر جلسہ جناب قاری حسن شاہ صاحب بخاری نے حسن قرأت کا ایمان افروز مظاہرہ فرما کر اس بابرکت نشست کو اختتام تک پہنچایا۔

مطبوعہ پروگرام کے مطابق صبح کا یہ اجلاس صدر دفتر مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے ہفت روزہ درس قرآن کی اس نشست کے قائم مقام ہوا جو اتوار کی صبح مسجد شہداء (لیگل چوک لاہور) میں منعقد ہوتی ہے۔ اور جس میں ہر اتوار کو پابندی کے ساتھ پانچ چھ سو حضرات شرکت کرتے ہیں۔ مطبوعہ پروگرام کے مطابق سورۃ آل عمران کے پہلے رکوع کا درس آج کے اس اجلاس میں ہونا تھا۔ لیکن بیماری کے بعد شدید نقاہت کی وجہ سے ڈاکٹر صاحب نے درس قرآن نہ دے سکنے کی معذرت کی۔ البتہ انہوں نے اپنی جگہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب کو دعوت دی تھی کہ وہ اپنے ارشادات سے حاضرین کو مستفید فرمائیں۔

پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب تشریف لے آئے ہیں۔ ان کو پروگرام کے مطابق اجلاس پنجم کی صدارت کرنا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے پروفیسر صاحب سے گذارش کی تھی کہ وہ تقریر کی بجائے مقالہ پڑھیں۔ چنانچہ انہوں نے "مسلمانوں کے قرآن مجید سے بعد و بیگانگی کے اسباب" کے موضوع پر مقالہ تحریر فرمایا ہے۔ موصوف کو یہ مقالہ اجلاس پنجم میں پڑھ کر سنانا تھا۔ اس کا آغاز انہوں نے اجلاس اول ہی میں کر دیا۔ پورا مقالہ تو انشاء اللہ "میثاق" کی زینت بنے گا۔ میں یہاں اس کی خاص خاص باتیں بیان کرنے کی جسارت کر رہا ہوں۔

پروفیسر صاحب نے فرمایا کہ قرآن کریم صرف ایک اخلاقی نظام ہی پیش نہیں کرتا ۔ اگر ایسا ہوتا تو میں شاید ہندوازم یا بدھ ازم اختیار کر لیتا ۔ بلکہ قرآن کریم کامل ضابطۂ حیات پیش کرتا ہے جسے نافذ کرنے کے لئے متکلمین کی نہیں مجاہدین کی ضرورت ہے ۔ آپ نے فرمایا کہ منطق، فلسفہ اور کلام میں انہماک سے انسان کی عملی قوت جو شرطِ جہاد ہے، بالکل مردہ ہو جاتی ہے ۔ یہی وجہ ہے کہ صحابہ کرامؓ نے نبی اکرمؐ سے کبھی کوئی منطقی کلامی، سائنسی یا فلسفیانہ بحث نہیں کی ۔ ——— بقول اکبر الٰہ آبادی

عقل کو کچھ نہ ملا علم میں حیرت کے سوا
دل کو بھایا نہ کوئی رنگ محبت کے سوا

صحابہ کرامؓ کے ایک ہاتھ میں قرآن ہوتا تھا تو دوسرے میں تلوار ۔ فلسفہ آدمی کی قوتِ عمل کو کمزور کر دیتا ہے ۔ اور قرآن کریم کی رو سے اللہ تعالیٰ ان لوگوں کو پسند کرتا ہے جو اس کی راہ میں سیسہ پلائی ہوئی دیوار بن کر قتال کرتے ہیں ۔ آپ نے اپنے مخصوص انداز میں فرمایا کہ دنیا جس پر تم ناز کرتے ہو ساری دھوکے کی ٹٹی ہے ۔ مبارک ہیں وہ لوگ جو مرنے سے پہلے اس دھوکہ سے نکل آئیں ۔

کھلے ہے مستقل یہ جہانِ نزار کو
دھوکا لگا ہوا ہے دلِ بیقرار کو

اللہ تعالیٰ فرماتے ہیں کہ اصل زندگی وہ ہے جو بعد میں آئے گی ۔ بس اس کے لئے کوشش کرو ۔ چشتی صاحب نے فرمایا کہ مسلمانوں سے یہود نے انتقام اس طرح لیا کہ ان کا رُخ کچھ شخصیات کی طرف موڑ دیا ۔ بجائے قرآن کے کچھ افراد مطمحِ نظر بن گئے اور مسلمانوں نے انہیں مقصود بنا لیا ۔ مجوسیوں نے انتقام اس طرح لیا کہ قرآن سے ہٹا کر مسلمانوں کی توجہ فلسفیانہ مسائل کی طرف مرکوز کر دی ۔ بقول " ہے یہی بہتر الٰہیات میں اُلجھا رہے "

پروفیسر چشتی صاحب بڑی باغ و بہار شخصیت کے مالک ہیں ۔ وہ مقالہ بھی پڑھتے ہیں تو تقریر کے انداز میں ۔ مقالے کا ایک جملہ پڑھتے ہی اس کی تشریح میں ان کی تقریر شروع ہو جاتی ہے ۔ اس اجلاس میں ان کے مقالہ کے چند ہی صفحات پڑھے جا سکے ۔

ایک بج رہا ہے ۔ پہلے اجلاس کا وقت ختم ہو گیا ۔ پروگرام کے مطابق ہال کے سامنے لان میں پونے پانچ بجے عصر کی نماز ہو گی اور پانچ بجے شام کے اجلاس کی کارروائی شروع ہو جائے گی ۔

اجلاس دوم

۱۵۔ افغانی روڈ پر دوپہر کا کھانا کھا کر اور کچھ دیر آرام کر کے عصر سے قبل ہم پھر ٹاؤن ہال پہنچ گئے ۔ عصر کی نماز باجماعت لان میں ادا کی ۔ بہت سے لوگ آ چکے

ہیں۔ پانچ بجے جب اجلاس شروع ہوا تو ہال اور گیلریاں بھر چکی تھیں اور لوگ ابھی مزید آ رہے تھے۔ اجلاس دوم کا عنوان ہے " عظمت و اعجاز قرآن "۔

اس اجلاس کی صدارت پروگرام کے مطابق مولانا شمس الحق افغانی مدظلہٗ سابق وزیر معارف ریاستہائے قلات و خاران اور سابق شیخ التفسیر جامعہ اسلامیہ بہاولپور کو کرنی ہے۔ جو ابھی تک نہیں پہنچے ہیں۔ مولانا موصوف ملتان سے بذریعہ ہوائی جہاز اس اجلاس کی صدارت کرنے تشریف لا رہے ہیں۔ ہمارے ایک رفیق انہیں لینے ایئرپورٹ پر گئے ہوئے ہیں۔

ٹھیک پانچ بجے تلاوت قرآن پاک کے ذریعہ اجلاس کی کارروائی شروع ہو گئی۔ جن حضرات نے اس اجلاس میں مقالے پڑھے ان کے اسماء گرامی درج ذیل ہیں۔

مولانا محمد حنیف صاحب ندوی رفیق ادارۂ ثقافت اسلامیہ لاہور۔

مولانا حافظ احمدیار صاحب شعبۂ معارف اسلامیہ جامعہ پنجاب۔

مولانا محمد موسیٰ خاں صاحب استاذ جامعہ اشرفیہ و خطیب جامع مسجد یونیورسٹی نیو کیمپس۔

مولانا ندوی صاحب نے قرآن مجید کی فصاحت و بلاغت کے موضوع پر ایک مطبوعہ مقالہ پڑھا جو حد درجہ فنی بھی تھا اور قدرے طویل بھی۔ تاہم حاضرین نے اسے نہایت صبر اور سکون کے ساتھ سنا۔ مولانا حافظ احمدیار صاحب نے اپنے مقالہ میں کہا کہ روٹی، کپڑا اور مکان کو زندگی کا مقصود قرار نہیں دیا جا سکتا۔ انسان اشرف المخلوقات ہے۔ اس کی زندگی کا ایک اعلیٰ مقصد ہے۔ اس کو عقل دی گئی ہے۔ تاکہ وہ اپنی حیوانی جبلت پر قابو پا سکے اور اپنے نفس کے منہ زور گھوڑے کو لگام دے سکے۔ آپ نے کہا کہ انبیاء کرامؑ دراصل ان حدود کی نشاندہی کرتے ہیں جن کے اندر رہ کر انسان نہ صرف یہ کہ اپنی فطری خواہشات کو پورا کر سکتا ہے بلکہ سلامتی کے راستہ پر بھی گامزن رہ سکتا ہے۔ آپ نے کہا کہ چونکہ نبی اکرمؐ آخری نبی اور رسول ہیں اس لئے آپؐ پر دین کی تکمیل ہو گئی اور آپ کے بعد احکامات الٰہی آنے کا سلسلہ بند ہو گیا۔ اس لئے اب آقائے دوجہاں کے فرمان پر عمل کرنا یا نہ کرنا ہی ایمان و کفر کی کسوٹی ہے۔

مولانا موسیٰ خاں صاحب نے ڈاکٹر صاحب کی فرمائش پر ایک اربعین (چہل حدیث) عظمت قرآن کے موضوع پر مرتب کی تھی۔ سبحان اللہ! بمصداق " قدر گوہر شاہ داند یا بداند گوہری " کے مصداق عظمت قرآن کا بیان مہبطِ قرآن صلی اللہ علیہ وسلم کی زبان مبارک سے، حاضرین گوش برآواز تھے اور اگرچہ مولانا افغانی مدظلہٗ کی آمد کے باعث اس اجلاس میں اربعین پوری بیان نہ ہو سکی۔ تاہم بعد میں ایک خصوصی نشست میں رفقاء نے مولانا سے وہ ساری احادیث درس کے انداز میں سنیں۔

مغرب کی نماز کے تھوڑی دیر بعد ہی ہال کے باہر سے نعرۂ تکبیر کی آوازیں آنی شروع ہوئیں جو لمحہ بہ لمحہ قریب آ رہی

ہیں۔ وہ دیکھئے! مولانا شمس الحق افغانی صاحب اپنے معتقدین کے جلو میں تشریف لا رہے ہیں اور ڈاکٹر صاحب اسٹیج سے اتر کر ان کا استقبال کر رہے ہیں۔ اور انہیں کرسیٔ صدارت پیش کر رہے ہیں۔

مولانا افغانی مدظلہٗ نے اپنی صدارتی تقریر کا آغاز اس آیت سے کیا "وَنُنَزِّلُ مِنَ الْقُرْاٰنِ مَا هُوَ شِفَآءٌ وَّرَحْمَةٌ لِّلْمُؤْمِنِيْنَ"۔ اور فرمایا کہ اس سلسلہ میں تین چیزیں پیش نظر رہنی چاہئیں۔ (۱) قرآن کی عظمت (۲) اعجاز القرآن (۳) عالمی ضرورت۔ مولانا افغانی نے فرمایا کہ اقوام عالم کو قرآن کریم کی آج جس قدر ضرورت ہے اتنی پہلے کبھی نہیں ہوئی۔ اور نہ شاید آئندہ ہو گی۔ یورپ کی مادہ پرستانہ تعلیم نے انسان کو اپنے مقام شرافت سے اس قدر گرایا کہ وہ مخلوق پرستی میں گم ہو گیا اور خالق حقیقی کو بھول گیا۔ آپ نے کہا کہ آج کا دور سابقہ ادوار سے کہیں زیادہ خدا فراموش ہے۔

مولانا افغانی نے فرمایا کہ انسانی حیات کے لئے تین اشیاء بہت ضروری ہیں۔ پانی، روشنی اور آکسیجن۔ آپ نے فرمایا کہ پانی کا سرچشمہ عالم بالا ہے۔ روٹی کا مسئلہ بھی پانی سے وابستہ ہے۔ وَجَعَلْنَا مِنَ الْمَآءِ كُلَّ شَيْءٍ حَيٍّ۔ آج پانی نہ ہو تو یہ دنیا لاشوں کا ڈھیر نظر آئے گی۔ مولانا نے فرمایا کہ پانی، روشنی اور ہوا جتنی ہماری زندگی کے لئے ضروری ہیں اتنی ہی وافر مقدار میں قدرت نے یہ ہمارے لئے مہیا کی ہیں۔ اگر یہ اتنی وافر مقدار میں نہ ہوتیں تو انسان ان کا راشن کر کے ایک دوسرے پر جو ظلم ڈھاتے اس کا تصوّر کرتے ہی سے رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ اعداد و شمار کی روشنی میں مولانا نے فرمایا کہ قدرت کی بے پایاں فیاضی کا اندازہ لگائیے۔ پانی ہی کو لیجئے، بارشیں ہوتی ہیں۔ جل تھل ایک ہو جاتے ہیں، اگر انسان چاہے کہ برصغیر پاک و ہند میں صرف دس منٹ ہی کے لئے مصنوعی بارش کرے تو اس کے لئے نوّے کھرب ٹن کوئلہ کی ضرورت پڑے گی۔ جس کی قیمت تقریباً ۶۳۰ کھرب روپے ہوتی ہے۔ جو ہند و پاکستان کی تیس ہزار سال کی آمدنی کے برابر ہے۔

روشنی کے بارے میں اعداد و شمار پیش کرتے ہوئے مولانا افغانی نے فرمایا کہ ایک رات کا بجلی کا خرچ ۴۴ کروڑ ڈالر ہے۔ جب کہ سورج سے ہمیں ۸۰،۴ من روشنی حاصل ہوتی ہے۔ واضح رہے کہ سورج زمین سے نو کروڑ تیس لاکھ میل دور ہے اور جو گرمی اور روشنی سورج سے ہم تک پہنچتی ہے وہ اصل گرمی و روشنی کا دو سو کروڑواں حصہ ہے۔

مولانا افغانی یہ تمام اعداد و شمار اپنی تقریر میں زبانی بیان فرما رہے تھے۔ اس پیری میں ان کا حافظہ واقعی قابل رشک ہے۔ دل سے ان کی درازیٔ عمر اور دین کے لئے ان کی جد و جہد اور قربانی کے لئے دعائیں نکلیں۔ (اگر اعداد و شمار میں کوئی غلطی ہو تو یہ راقم الحروف کی رپورٹنگ کی غلطی متصور کی جائے)

آکسیجن کے لئے مولانا نے فرمایا کہ یہ انسان کی حیات کے لئے بہت ہی ضروری چیز ہے۔ اس کے بغیر انسان زندہ نہیں رہ سکتا۔ آپ نے فرمایا کہ ایک آدمی کو ایک دن میں سانس لینے کے لئے چودہ ہزار گیلن ہوا کی ضرورت ہوتی

ہے اور وہ سب کو مل رہی ہے ؛ وافر مقداریں مل رہی ہے، بلاقیمت مل رہی ہے، کسی کے کنٹرول کے بغیر مل رہی ہے۔ اور یہ سب کچھ اس خالق کا عطیہ ہے جو بندوں پر نہایت ہی مہربان ہے۔ لیکن افسوس کہ مغربی تعلیم جو خدا فراموش ہے۔ اس نے مسلمانوں کو بھی خدا سے غافل کر دیا ہے اور مسلمان زبان سے تو اللہ پر ایمان رکھتے ہیں لیکن درحقیقت وہ بھی اس تعلیم کی بدولت مادہ ہی کو سب کچھ سمجھنے لگے ہیں۔ مولانا نے فرمایا کہ ہماری حیاتِ معنوی اسلام اور قرآن سے وابستہ ہے۔ آپ نے کہا کہ اگر برصغیر ہند و پاک میں ہمارے آباؤ اجداد اور مسلمان حکمران اسلام کے لئے کام کرتے تو متحدہ ہندوستان میں مسلمانوں کی اکثریت ہوتی اور اقلیت و اکثریت کا سوال ہی پیدا نہ ہوتا۔ آپ نے کہا کہ حد تو یہ ہے کہ اسلام کا علم بھی یورپی مستشرقین سے حاصل کرنے کی کوشش کی جاتی ہے جن کا وجود ہی دراصل اسلام اور مسلمانوں کے خلاف ایک گہری سازش کا حصہ ہے۔

تقریر ختم کرتے ہوئے مولانا افغانی نے زور دیا کہ ایک خدا ترس جماعت کو منظم ہونا چاہیئے۔ جو قرآن کریم کی روشنی میں تمام سیاسی گندگیوں اور آلائشوں سے پاک ہو کر نیکی کی دعوت دے، بھلائیوں کو پھیلانے اور برائیوں کو مٹانے کیلئے اپنے جسم و جان کی تمام قوتوں کو کھپا دے تاکہ اس کے نتیجے میں ایک اسلامی معاشرہ برپا ہو کیونکہ اسلامی نظام کے قیام کے لئے رجال کار اور اسلامی معاشرہ لابدی ہے۔

مولانا ممدوح کی تقریر کے بعد حاضرین نے عشاء کی نماز باجماعت ہال کے باہر لان میں ادا کی۔ بعد ازاں ہم اپنی قیام گاہ کی طرف روانہ ہو گئے۔

اجلاس سوم

آج ۲۲ مارچ ہے اور پیر کا دن" نوائے وقت" سامنے ہے۔ پہلے صفحہ پر قرآن کانفرنس کے آج کے اجلاس کا پروگرام شائع ہوا ہے۔ اس میں صبح کے اجلاس کی صدارت کے لئے مولانا محمد مالک شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور کا نام درج ہے۔ حالانکہ مطبوعہ پروگرام کی رو سے اس اجلاس کی صدارت مولانا امین احسن صاحب اصلاحی کو کرنا تھی۔ ماتھا ٹھنکا ضرور کوئی بات ہے۔

ٹھیک نو بجے ٹاؤن ہال میں تلاوت کلام پاک سے کانفرنس کے تیسرے اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہو رہا ہے۔ اس اجلاس کا عنوان ہے :-

"علوم القرآن اور اصولِ تفسیر"

کل کی نسبت آج حاضری کچھ کم ہے۔ ہال تقریباً بھر چکا ہے۔ گیلریاں البتہ ابھی خالی ہیں۔ وجہ اس کی غالباً یہ ہے کہ کل اتوار چھٹی کا دن تھا۔ اور آج پیر ہے اور دفاتر وغیرہ کھلے ہیں۔ پھر بھی بہت سے لوگ اپنے دفاتر

سے رخصت لے کر اور کاروبار کو چھوڑ کر یہاں آئے ہیں۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب مائک پر آئے ہیں۔ معذرت کر رہے ہیں کہ کل شام مولانا افغانی کی آمد پر مولانا محمد موسیٰ صاحب کا مقالہ نامکمل رہ گیا۔ مولانا اصلاحی صاحب کے آج تشریف نہ لانے کی وجہ سے جو سوالیہ نشان بہت سے ذہنوں میں ابھر آیا تھا۔ اس کی طرف اشارہ کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب اجمالی وضاحت فرما رہے ہیں۔ کہ کانفرنس کے انعقاد سے بہت پہلے میں نے انہیں اس اجلاس کی صدارت کی دعوت دی جسے انہوں نے قبول فرمالیا اور شرکت کا وعدہ کیا۔ لیکن افسوس کہ بعد میں کچھ لوگ، جنہیں ہمارے ساتھ ان کا کسی قسم کا تعلق پسند نہیں، ان پر اثر انداز ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب فرما رہے ہیں کہ مولانا محترم سے بعض مسائل پر اختلاف تو رکھتا ہوں لیکن انہوں نے قرآن حکیم کی جو علمی خدمت کی ہے اور مولانا فراہیؒ کے فکر کو جس طرح آگے بڑھایا ہے اس کا پہلے بھی معترف تھا اور اب بھی معترف ہوں۔ مولانا کی تفسیر یا کتابوں کی اشاعت کسی ذاتی تعلق کی بنا پر نہیں کی بلکہ اس وجہ سے کی گئی ہے کہ ان کے مطالعہ سے قاری کو قرآن حکیم کے ساتھ ذہنی مناسبت بھی حاصل ہو جاتی ہے اور قلبی موانست بھی۔ بنا بریں ان کے فکر کی اشاعت کو میں خدمتِ قرآن مجید کا ذریعہ سمجھتا ہوں۔ یہ بات پہلے بھی تھی اور انشاء اللہ آئندہ بھی قائم رہے گی۔ ڈاکٹر صاحب نے نہایت دلسوزی کے ساتھ فرمایا کہ "کسی جزوی معاملہ میں اگر اختلاف واقع ہو جائے تو ہمارے ہاں عام طور پر اتنی وسعت قلبی نہیں پائی جاتی کہ اسے اپنے مقام پر رکھتے ہوئے وسیع تر معاملات میں تعاون جاری رکھا جائے۔ ڈاکٹر صاحب نے بتایا کہ یہ کوئی ڈھکی چھپی بات نہیں کہ میرے بعض نظریات اور انجمن خدام القرآن اور تنظیم اسلامی کے قیام اور ان کی ہیئت تنظیمی سے مولانا محترم کو اختلاف تھا۔ بایں ہمہ مولانا کمال مروّت کے ساتھ میرے ساتھ تعاون فرماتے رہے۔ لیکن اب کچھ لوگوں نے اثر انداز ہو کر اس میں شدت پیدا کر دی ہے جس کا مجھے شدید قلق ہے۔ میرے نزدیک مولانا نے شرکت کا وعدہ کیا تھا لیکن وہ فرماتے ہیں کہ انہوں نے وعدہ نہیں کیا تھا بلکہ بعد میں جواب دینے کو فرمایا تھا۔ بہرحال میں نے انکار اور اپنا موقف سامنے رکھ دیا ہے۔ حقیقت کا علم اللہ ہی کو ہے۔ اس لئے کہ کھلی اور چھپی سرات کا جاننے والا صرف وہی ہے"۔

اس اجلاس میں جن حضرات نے مقالے پڑھے ان کے اسماء گرامی حسب ذیل ہیں:۔

مفتی محمد حسین نعیمی صاحب، مہتمم و صدر مدرس جامعہ نعیمیہ لاہور۔

مولانا ڈاکٹر محمد مظہر بقا صاحب شعبۂ معارف اسلامیہ، جامعہ کراچی۔

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صاحب شعبۂ عربی، جامعہ پنجاب لاہور۔

مولانا سید حامد میاں صاحب مہتمم و صدر مدرس جامعہ مدنیہ لاہور (یہ مقالہ خود ڈاکٹر صاحب نے پڑھ کر سنایا)۔

اس لئے کہ مولانا سیّد حامد میاں صاحب کسی اہم مصروفیت
کی بنا پر تشریف نہیں لا سکے تھے)

مجھے امید ہے کہ ان تمام مقالات کو جو اس کانفرنس میں پڑھے گئے "ماہنامہ "میثاق" میں ضرور شائع کیا جائے گا تاکہ قارئین "میثاق" بھی ان سے مستفید ہوں۔ اگر میں ان تمام مقالات کی تلخیص اپنے اس مضمون میں پیش کرنے کی کوشش کروں تو ڈر ہے کہ یہ اتنا طویل نہ ہو جائے کہ "میثاق" کی ضخامت، پر گراں گذرے۔ اس لئے میں اس سے پہلو تہی کر رہا ہوں۔

اس اجلاس کی ایک نمایاں بات یہ تھی کہ حسنِ اتفاق سے مولانا سعید احمد صاحب اکبرآبادی مدیر "برہان" دہلی اور رفیق ندوۃ المصنفین دہلی بھی اس اجلاس میں رونق افروز تھے۔ موصوف حکومت پاکستان کی دعوت پر بین الاقوامی سیرت کانگریس میں شرکت کرنے کے لئے بھارتی وفد کے رکن کی حیثیت سے پاکستان تشریف لائے ہوئے تھے۔ اور آج کل لاہور میں مقیم تھے۔ دوران اجلاس کسی نے ڈاکٹر صاحب کو بتایا کہ مولانا اس وقت قریب ہی یونیورسٹی سینیٹ ہال میں موجود ہیں۔ چنانچہ ڈاکٹر صاحب نے فوری طور پر پیغام بھجوایا اور مولانا ڈاکٹر صاحب کی درخواست پر کانفرنس کو خطاب کرنے تشریف لے آئے۔ انہوں نے فرمایا "میں قرآن مجید کی عظمت و اعجاز کے ذکر کو سننے اور کسب علم و حصول سعادت کے مقصد کے پیش نظر اس مجلس میں حاضر ہوا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب نے مجھے اس مجلس میں اظہار خیال کی دعوت دے کر مجھے ایک مزید سعادت بھی مرحمت فرمائی کہ میں "قرآن حکیم" کی شان میں اختصار و اجمال کے ساتھ اپنے خیالات بھی پیش کروں۔ واقعہ یہ ہے کہ آج پوری انسانیت انسان کے بنائے ہوئے نظامِ زندگی محرّف مذاہب کے رسم و رواج اور مادہ پرستی کے اندھیروں میں گھری ہوئی ہے۔ وہ ان "ظلمات" سے عاجز آ گئی ہے۔ نوعِ انسانی آج شعوری اور غیر شعوری طور پر نورِ ہدایت کی متلاشی ہے۔ نبوت کا دروازہ قیامت کے لئے بند کر دیا گیا ہے۔ نبوّت و رسالت نبی اکرمؐ پر ختم ہو گئی۔ لیکن خیر و شر اور حق و باطل کی کشمکش جاری ہے اور فی زمانہ خیر پر شر اور حق پر باطل غالب نظر آ رہا ہے۔ ایسی صورت میں اصلاح حال کا صحیح طریق کار اور منہج کیا ہے؟ یہ سوال ہر اس شخص کے ذہن میں پیدا ہونا ضروری ہے جو موجودہ زمانہ کے احوال و کوائف سے پریشان ہے۔ اس کا جواب مسلمانوں کے پاس موجود ہے۔ اور وہ یہ کہ نبی اکرمؐ کے وصال کے بعد خلق خدا کی رشد و ہدایت کی ذمّہ داری امّتِ مسلمہ کی طرف منتقل ہو گئی ہے۔ خلفاء راشدینؓ اور صحابہ کرامؓ نے اس ذمہ داری کو بحسن و خوبی ادا کیا اور فرمان ربّی کُنْتُمْ خَيْرَ أُمَّةٍ أُخْرِجَتْ لِلنَّاسِ تَأْمُرُونَ بِالْمَعْرُوفِ وَتَنْهَوْنَ عَنِ الْمُنْكَرِ وَتُؤْمِنُونَ بِاللهِ کے تقاضے پورے کئے۔ یہ تھا وہ منصب جو امتِ مسلمہ کو تفویض کیا گیا تھا۔ افسوس ہے کہ ہم نے اپنے اس منصب اور ذمہ داری کو بھلا دیا۔ جس کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہم بنی نوعِ انسان کی رشد و ہدایت کے فرضِ منصبی کو ادا نہ کرنے کی سزا کے

طور پر خود ہی دنیا میں مقہور و مغلوب ہو گئے۔ اب اگر ہمیں واقعی اپنی پستی، زوال، انحطاط اور ذہنی غلامی کا شعور و احساس ہو گیا ہے اور ہم چاہتے ہیں کہ مسلمان بحیثیت امت اپنے فرض منصبی کو جانیں، سمجھیں اور اس کو ادا کرنے پر کمربستہ ہوں تو اس کا طریقہ وہی ہے جو حضور اکرمؐ نے اختیار فرمایا تھا۔ اور جو سورۂ جمعہ کی اس آیت میں بیان کیا گیا ہے جو اسٹیج کے اوپر بیز پر تحریر ہے۔ "هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِّنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ"۔

مولانا نے تقریر جاری رکھتے ہوئے فرمایا کہ "مکی زندگی میں جو سورتیں نازل ہوئیں ان میں خطابت کا جوش و خروش ہے۔ اور آیات الٰہی کے ذریعے ایمان باللہ، ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی دعوت دی گئی ہے۔ دلوں کو ایمان سے منور کیا گیا اور فکر و نظر اور عمل و کردار کی گندگیاں دور کی گئیں اور صحابہ کرام کی وہ جماعت منظم فرمائی جن کا مقصد زندگی اللہ کے لئے جینا اور مرنا قرار پایا۔ چنانچہ اس مرحلہ کی تکمیل کے بعد ہجرت کا مرحلہ آیا اور پھر وہ نظام حیات عملاً برپا اور نافذ ہوا جو سید المرسلین خاتم النبیینؐ لے کر آئے تھے۔" مولانا موصوف نے مزید فرمایا "جس طرح زمین سے اناج اور فواکہات کے حصول کے لئے پہلے زمین کو ہل چلا کر ہموار کرنا ضروری ہے اسی طرح اسلامی نظام حیات کو عملاً قائم و نافذ کرنے کے لئے پہلے ایسی منظم جماعت اور معاشرہ ضروری ہے جس کے ہر ہر فرد کے کشت قلب میں ایمان باللہ ایمان بالآخرت اور ایمان بالرسالت کی تخم ریزی ہو چکی ہو۔ اس کے بغیر نہ حقیقی طور پر اسلامی نظام حیات قائم ہو سکتا ہے اور نہ نافذ رہ سکتا ہے۔ اور کشت قلوب میں ایمان کی تخم ریزی کا ذریعہ صرف قرآن حکیم اور سیرت مطہرہ یا بالفاظ دیگر سنت رسولؐ ہے۔ چنانچہ جب قرآن حکیم اور سیرت مطہرہ کے ذریعہ دلوں میں ایمان کا نور اور اعمال صالحہ کا داعیہ اور جہاد کا جذبہ پیدا ہو جائے گا اور ایک صالح معاشرہ وجود میں آئے گا تو ان شاء اللہ ظلمات کی بدلیاں چھٹ جائیں گی۔ اور آفتاب ہدایت کی روشنی سے پوری نوع انسانی فیضیاب ہو گی۔ لہٰذا مبارک ہیں وہ حضرات جو امت کو ایمان کے اصل منبع یعنی قرآن حکیم کی طرف رجوع کرنے کی دعوت دے رہے ہیں۔" اس اجلاس سے ایک نہایت معمر بزرگ مولانا عبداللہ عمرپوری نے خطاب فرمایا۔ ان کی تقریر صد درجہ ولولہ انگیز تھی جس نے " گرم ماؤ جوانوں کا لہو سوز یقیں سے!" کے مصداق حاضرین کی رگوں میں کم از کم وقتی طور پر گردش خون کی رفتار تیز کر دی۔

آخر میں صاحب صدر مولانا محمد مالک صاحب شیخ الحدیث جامعہ اشرفیہ لاہور نے بھی اپنا فاضلانہ مقالہ پڑھ کر سنایا اور پھر دعا پر اس اجلاس کا اختتام ہوا۔

اجلاس چہارم

آج بلدیہ لاہور کے ارباب حل و عقد نے ٹاؤن ہال کے باہر لان پر نماز پڑھنے پر پابندی لگا دی۔ شاید اس لئے کہ اس سے سبزہ زار کو نقصان پہنچتا تھا۔

چنانچہ عصر کی نماز کے لئے سڑک پر صفیں بچھا دی گئیں۔ اور پونے پانچ بجے نماز باجماعت ادا کی گئی۔ اس کے بعد تمام نمازیں باجماعت سڑک پر ہی ادا کی جاتی رہیں۔

گھنٹے نے پانچ بجائے اور کانفرنس کے چوتھے اجلاس کی کارروائی تلاوت قرآن پاک سے شروع ہوئی۔ اس اجلاس کا عنوان ہے "قرآن حکیم اور مسائل حاضرہ"

ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی (پی ایچ ڈی) ترکی ٹوپی پہنے صدارتی کرسی پر جلوہ افروز ہیں۔ اب تو خال خال ہی وہ شخصیتیں نظر آتی ہیں جو اپنی پرانی روایات کو سینہ سے لگائے ہوئے ہیں۔ ایک زمانہ تھا کہ ترکی ٹوپی عام طور پر پہنی جاتی تھی۔ جب مسلم لیگ کی تحریک ابھری تو جناح کیپ کا دور آیا، اور علی گڑھ یونیورسٹی میں بھی ترکی ٹوپی کی جگہ جناح کیپ نے لے لی اور وہ یونیفارم کا حصہ بن گئی اور اب تو ننگے سر رہنا فیشن کا ایک حصہ بن کر رہ گیا ہے۔ نتیجتاً صرف سر ہی ننگا نہیں ہوا۔ اعمال، کردار، اخلاق سب ہی برہنہ ہو گئے ہیں اور ہماری قوم کے نوجوان اس برہنگی پر فخر کرتے ہیں کہ ہم بھی اقوام عالم کے شانہ بشانہ قدم ملا کر چل رہے ہیں۔

تھا جو ناخوب بتدریج وہی خوب ہوا
کہ غلامی میں بدل جاتا ہے قوموں کا ضمیر

اس اجلاس میں جن حضرات نے تقاریر کیں یا مقالے پڑھے اُن کے اسمائے گرامی یہ ہیں :-

جناب خالد اسحٰق صاحب سابق ایڈووکیٹ جنرل حکومت پاکستان۔

مولانا محمد طاسین صاحب مجلس علمی کراچی۔

ڈاکٹر امان اللہ ملک صاحب شعبۂ معارف اسلامیہ جامعہ پنجاب۔

مرزا محمد منور صاحب شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لاہور۔

ڈاکٹر ابصار احمد صاحب ایم اے پی ایچ ڈی۔

جناب خالد اسحٰق صاحب اور مولانا محمد طاسین صاحب، ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دعوت پر خصوصی طور پر کراچی سے تشریف لائے تھے۔

جناب خالد اسحٰق صاحب ملک کے نامور وکیل اور علمی، ادبی، سیاسی اور دینی حلقوں کی جانی پہچانی شخصیت ہیں۔ ون یونٹ کے دور میں صوبہ مغربی پاکستان کی حکومت میں ایڈووکیٹ جنرل کے عہدہ پر فائز تھے۔ جس سے انہوں نے استعفیٰ دے دیا تھا اور پرائیویٹ پریکٹس شروع کر دی تھی۔ ان کا شمار اعلیٰ ماہرین قانون و دستور میں ہوتا ہے۔ مزید برآں ہر اس محفل میں جہاں قرآن و حدیث کے مطابق کام کرنے کا نقشہ بن رہا ہو گا، آپ خالد اسحٰق صاحب کو ضرور پائیں گے۔ چنانچہ موصوف کو جب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے قرآن کانفرنس میں مقالہ پڑھنے کی دعوت

دی تو فوراً تیار ہو گئے ۔ موصوف بڑی صلاحیتوں کے مالک ہیں ۔ دعا ہے کہ اللہ تعالیٰ انہیں سیاسی ہنگامہ آرائیوں سے بچا کر قرآن وحدیث کے علوم کی نشر واشاعت اور معاشرہ میں ان کے نفاذ کی جد وجہد کی توفیق عطا فرمائے ۔ آمین !

مولانا طاسین صاحب نے اس اجلاس میں جو مقالہ پیش کیا اس کا عنوان تھا " قرآن حکیم اور تصورِ ملکیت " یہ مقالہ چونکہ پہلے موصول ہو گیا تھا اس لئے انجمن خدام القرآن نے اس کو طبع کرا لیا تھا ۔ اور اب حاضرین میں تقسیم کر دیا گیا ۔ خواہش تو یہ تھی کہ تمام مقالے کانفرنس سے قبل موصول ہو جائیں تاکہ انہیں طبع کرا کے اجلاس کے دوران سامعین میں تقسیم کیا جا سکے لیکن بعض خواہشیں ایسی ہوتی ہیں کہ جن کو پورا ہونے میں بہرحال وقت لگتا ہے ۔ کانفرنس سے قبل صرف ایک مقالہ ہی موصول ہوا ۔ اس لئے سامعین میں تقسیم کرنے کے لئے صرف وہی طبع کرایا جا سکا ۔ مولانا طاسین صاحب کراچی کی معروف علمی و دینی شخصیت ہیں مجلسِ علمی کے مہتمم ہیں ۔ ممتاز عالم دین جناب مولانا محمد یوسف بنوری صاحب مدظلہ کے داماد ہیں ۔ قدیم و جدید علوم پر بڑی گہری نظر رکھتے ہیں ۔ طبیعت میں حد درجہ ملنساری اور حد درجہ انکساری ہے ۔ ہر ملاقاتی کے دل پر محبت کا گہرا نقش چھوڑتے ہیں ۔ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کا بہت احترام کرتے ہیں اور ڈاکٹر صاحب کی تحریک رجوع الی القرآن کے ساتھ ان کی پوری ہمدردیاں شامل ہیں ۔ راقم الحروف کے ساتھ اتنی محبت و شفقت سے پیش آتے ہیں کہ جب میں اپنے اعمال اور ان کے شفقت کو دیکھتا ہوں تو شرم محسوس ہونے لگتی ہے ۔

ڈاکٹر امان اللہ ملک صاحب (شعبۂ معارف اسلامیہ جامعہ پنجاب) نے " قرآن حکیم اور بلدیاتی حقوق " کے موضوع پر مقالہ پیش کیا اور مرزا محمد منور صاحب (شعبۂ اردو گورنمنٹ کالج لاہور) نے حسب معمول نہایت پُرسوز اور دلگداز تقریر کی ۔ اور ڈاکٹر ابصار احمد صاحب (ڈاکٹر اسرار احمد کے برادرِ خورد) نے " قرآن حکیم اور ایک جدید فلسفیانہ تحریک " کے موضوع پر مقالہ پڑھ کر سنایا ۔

صدرِ جلسہ ڈاکٹر برہان احمد صاحب فاروقی کی بصیرت افروز صدارتی کلمات کے بعد دعا ہوئی اور اس اجلاس کے اختتام کا اعلان کر دیا گیا ۔ عشاء کی نماز باجماعت ادا کر کے ہم لوگ اپنی قیام گاہ پر واپس آ گئے ۔ جہاں حاجی محمد یوسف صاحب کھانے پر ہمارا پہلے سے انتظار کر رہے تھے ۔ بیرون لاہور سے آنے والے رفقاء کے قیام و طعام کی ذمہ داری لاہور کے رفقاء نے سنبھالی تھی اور لاہور کے رفقاء کی جانب سے یہ ذمہ داری حاجی محمد یوسف صاحب کے سپرد تھی ۔ حاجی صاحب محترم ریلوے میں سینیئر اکاؤنٹس آفیسر کے منصب پر فائز ہیں ۔ مثلاً افغانی روڈ کی دوسری منزل پر جہاں کھانے کا انتظام ہے آپ صبح ناشتہ کے وقت اور دوپہر اور رات کھانے کے وقت اپنی ڈیوٹی میں مستعد نظر آتے ہیں اور اس وقت تک گھر واپس نہیں جاتے جب تک ایک ایک شخص کھانے سے فارغ نہ ہو لے اور دوسرے وقت کے لئے کھانے کا معقول انتظام نہ ہو جائے ۔ لاہور کے چند دیگر رفقاء اس کام میں حاجی صاحب کی معاونت کر رہے ہیں ۔ اللہ تعالیٰ ان سب کو اجر عطا فرمائے ۔

اجلاس پنجم

آج منگل ہے، مارچ کی ۲۳ تاریخ ہے اور یوم قرارداد پاکستان کی تقریب کے سلسلے میں عام تعطیل ہے۔ تمام سرکاری اور غیر سرکاری دفاتر بند ہیں۔ بازار بھی سونے پڑے ہیں۔ ہماری منی بس نے حسب معمول اجلاس کے وقت سے پہلے ہی ٹاؤن ہال پہنچا دیا۔ آج کے اس اجلاس کا جو قرآن کانفرنس کا پانچواں اجلاس ہے، عنوان ہے :-

"پاکستان، مصوّرِ پاکستان اور قرآنِ حکیم"

یعنی یہ اجلاس مصوّرِ پاکستان علامہ اقبال مرحوم کی نذر ہے۔ صدارت کی کرسی پر پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب رونق افروز ہیں۔

تلاوت کلام پاک سے ٹھیک نو بجے کارروائی کا آغاز ہوا۔ سب سے پہلے ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے اپنا مقالہ "اقبال اور ہم" پڑھ کر سنایا جو مطبوعہ شکل میں موجود تھا اور سامعین میں تقسیم کیا گیا۔ "کلام ڈاکٹر بزبان ڈاکٹر"۔ اس مقالے کو میں نے پہلے بھی کئی بار سنا تھا اور خوب محظوظ ہوا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کی زبان سے اس کو سننے کا لطف ہی کچھ اور تھا۔ پھر ڈاکٹر صاحب جو مختصر تشریح کرتے جاتے تھے اس نے اس مقالے کے حسن کو دوبالا کر دیا تھا۔

گذشتہ رات کے اجلاس میں ڈاکٹر برہان احمد فاروقی صاحب صرف صدارتی کلمات کہہ سکے تھے۔ انہوں نے جو مفصل مقالہ تحریر فرمایا تھا وہ اس نشست میں پڑھا۔ ان کے بعد خواجہ غلام صادق صاحب شعبہ فلسفہ جامعہ پنجاب نے "اقبال اور وجودِ مصدقہ" کے موضوع پر حد درجہ عالمانہ و فاضلانہ مقالہ پیش کیا۔

آخر میں صدرِ جلسہ پروفیسر یوسف سلیم چشتی صاحب نے اپنا مقالہ جس کا آغاز انہوں نے اجلاس اوّل میں کیا تھا پڑھ کر سنایا۔ حسب معمول ہر پیراگراف کی تشریح اس قدر کی کہ مقالہ اچھی خاصی تقریر بن گیا۔ نتیجہ یہ کہ اجلاس کا وقت ختم ہو گیا اور مقالہ ہنوز تشنۂ تکمیل رہا۔

اجلاس کے بعد ظہر کی نماز باجماعت ادا کی گئی اور لوگ اپنے گھروں کو رخصت ہوئے۔ اور ہم بھی حاجی محمد یوسف صاحب کی مہمان نوازی کے مزے لوٹنے اپنی قیام گاہ کو واپس آ گئے۔

اجلاس ششم

آج نہ جانے کیوں مجھے اپنے وہ رفقاء بہت یاد آ رہے ہیں جو بعض وجوہات کی بنا پر قرآن کانفرنس میں شرکت نہ کر سکے۔ ان میں وہ نوجوان رفیق بھی ہے جس کا نام بھی رفیق ہے اور جو گھر سے اجازت نہ ملنے کی وجہ سے شرکت نہ کر سکا۔ میرے نوجوان ساتھی آصف علی

رضوی بھی ہیں جنہیں دفتر سے رخصت نہ مل سکی ۔ میرے عزیز رفیق پروفیسر صلاح الدین اور بزرگ بھائی عبدالخالق بھی ہیں جو اپنے قریبی اعزہ کی علالت کی وجہ سے شرکت نہ کر سکے ۔ میں جانتا ہوں کہ وہ کراچی میں ہیں لیکن ان کے دل یہیں لاہور میں اٹکے ہوئے ہیں ۔ پچھلے سال مؤخر الذکر تین حضرات نے دوسری سالانہ قرآن کانفرنس میں شرکت کی تھی ۔ رفقاء کے درمیان بھائی عبدالخالق کی کمی تو بہت محسوس ہوئی محفل سُونی سُونی سی ہے ۔ بھائی عبدالخالق ہوتے ہیں تو گاہے گاہے محفل کو کشتِ زعفران بنا ڈالتے ہیں ۔

۔ ٹاؤن ہال کے باہر عصر کی نماز پونے پانچ بجے ادا کی گئی ۔ امامت کے فرائض جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دے رہے تھے ۔ پانچ بجے سے پہلے ہم اندر ہال میں تھے ۔ آج کے اجلاس کی حاضری معمول سے بہت زیادہ ہے ۔ اجلاس کے شروع ہونے سے قبل ہی ہال ، اس کی گیلریاں اور برآمدے سب بھر چکے ہیں اور لوگ ہیں کہ چلے آرہے ہیں ۔ اور آخر کیوں نہ آئیں ۔ آج کے آخری اجلاس میں داعیٔ تحریک رجوع الی القرآن اور صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن کا خطاب ہے ۔ مزید برآں کراچی سے ممتاز خطیب شاہ بلیغ الدین صاحب آئے ہوئے ہیں اور صدارت کی کرسی پر حیدرآباد (سندھ) کے ممتاز عالم دین اور مدرسۂ اسلامیہ کے مہتمم و صدر مدرس مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب رونق افروز ہیں ۔ جہاں یہ شخصیتیں یکجا ہو جائیں وہاں ان کے شیدائیوں کے سیلاب کو کون روک سکتا ہے ۔ مجھے بعد میں معلوم ہوا کہ بڑی تعداد میں لوگ ہال کے باہر میدان میں کھڑے ہوئے ہی ان محترم ہستیوں کے خیالات سے مستفید ہوتے رہے !

ٹھیک پانچ بجے تلاوت کلام پاک سے اس اجلاس کی کارروائی کا آغاز ہوا ۔ سب سے پہلے مائک پر کراچی کے ممتاز خطیب شاہ بلیغ الدین صاحب تشریف لائے ۔ آپ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی دعوت پر خصوصی طور پر کراچی سے لاہور تشریف لائے ہیں ۔ پہلے صرف کراچی کی ممتاز شخصیت تھے لیکن ریڈیو اور ٹیلی ویژن کے ذریعہ اب ملک کا بچہ بچہ آپ سے واقف ہے ۔ الفاظ کے انتخاب اور آواز کے زیر و بم سے سامعین کے دل اور دماغ پر ایک قیامت ڈھاتے ہیں ۔

اجلاس کے آغاز میں ایک عجیب اور دلچسپ واقعہ ہوا ۔ لیجئے آپ بھی دیکھ لیجئے ۔ وہ ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے سب سے چھوٹے صاحبزادے (عمر تقریباً چار سال) جو پابندی سے کانفرنس کے اجلاس میں آرہے تھے ، چڑھ کر کرسی صدارت پر بیٹھ گئے اور مصر ہیں کہ پہلے وہ صدارتی تقریر فرمائیں گے تو اجلاس کی کارروائی شروع ہوگی ۔ "قہرِ درویش بر جانِ درویش" ۔ اب ان سے درخواستیں کی جارہی ہیں کہ حضور یہاں سے ہٹیے ! اصل صاحب صدر کو کرسی پیش کی جاتی ہے ۔ لیکن ان کی کیفیت زمیں جنبد نہ جنبد گل محمد والی ہے ۔ آخر کار باپ کو بیٹے کے آگے ہار ماننی پڑی ہے اور مائک ان کے سامنے پیش کر دیا گیا ہے ۔ دو ایک منٹ میں "خطبۂ صدارت" (تعوذ اور بسم اللہ کی تلاوت) فرما کر ہمارے ان ننھے "صاحب صدر" آصف میاں نے اپنا قبضۂ غاصبانہ ختم کیا ہے ۔ اور اس طرح کرسی صدارت اصل صاحب صدر مولانا وصی مظہر صاحب ندوی کو پیش کی جا سکی ہے !

شاہ بلیغ الدین صاحب نے اپنے مخصوص انداز میں تقریر کرتے ہوئے فرمایا کہ ارض ہمالہ میں ہم نے برس ہا برس حکومت کی لیکن اپنے فریضہ ـــــــ فریضہ شہادت حق ـــــــ سے غفلت برتی۔ میں سوچتا ہوں کہ اگر اس سرزمین پر اولیاء کرام نہ ہوتے جن کی بدولت دین پھیلا، تو کیا حال ہوتا۔ آپ نے کہا کہ تبلیغ یہ ہی نہیں کہ غیر مسلموں کو مسلمان بنایا جائے بلکہ تبلیغ یہ بھی ہے کہ مسلمانوں کو حقیقی مسلمان بنایا جائے۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن کریم کے علاوہ کوئی اور الہامی کتاب ایسی نہیں جو اپنے دورِ نزول میں تحریر کر لی گئی ہو۔ صحابہ کرامؓ کا سب سے بڑا کارنامہ، قیامت تک قائم رہنے والا کارنامہ، قرآن کریم کو حفظ کرنا تھا اور تقریباً دس ہزار صحابہ کرامؓ حافظِ قرآن تھے۔ آپ نے کہا کہ جو لوگ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے لئے کام کرنا چاہتے ہیں انہیں معلوم ہونا چاہیئے کہ اسلامی تہذیب و ثقافت کیا ہے۔ آپ نے کہا کہ نبی اکرمؐ کا اسوۂ حسنہ، صحابہ کرامؓ کا عمل ہی ہماری ثقافت اور ہماری تہذیب ہے، اور جو لوگ اس کے علاوہ کسی اور چیز کو ہماری قومی ثقافت اور تہذیب بتلاتے ہیں وہ قوم کو گمراہ کر رہے ہیں۔ وہ قوم کو تباہی کے گڑھے کی طرف لے جانا چاہتے ہیں۔ آخر میں آپ نے نماز کی اہمیت پر روشنی ڈالی اور فرمایا کہ تزکیۂ نفس کے لئے اولین قدم نماز ہے۔ امام احمد بن حنبلؒ کے نزدیک تارکِ صلوٰۃ مرتد ہوتا ہے۔ اس لئے اے میرے عزیز و اور دوستو! اللہ کے رسولؐ کے اعتماد کو ٹھیس نہ پہنچاؤ۔ انہیں اعتماد ہے کہ ان کی امت اپنے اوقات میں سے رکوع و سجود کے لئے ضرور وقت نکالے گی۔

اور اب جگر تھام کر سنیئے کہ ڈاکٹر صاحب کی باری آئی۔ ڈاکٹر صاحب صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن کی تقریر میرے نزدیک اس کانفرنس کا حاصل تھی۔ ان کی تقریر کا عنوان تھا "انقلاب نبوی کا اساسی منہج عمل"۔ خدا کرے کہ ڈاکٹر صاحب اپنی پچھلی قرآن کانفرنس والی تقریر کی طرح اسے بھی ضبط تحریر میں لے آئیں۔ میں اپنے حافظے اور مختصر نوٹس کی مدد سے بعض نکات درج کر رہا ہوں۔ ڈاکٹر صاحب محترم نے حمد و ثناء کے بعد فرمایا:

"۲۶ مارچ ۷۵ء کو اسی ٹاؤن ہال میں میں نے ایک طویل تقریر کی تھی، بہتر ہوتا کہ وہ تقریر شائع ہو گئی ہوتی اور کتابچہ آپ کے سامنے ہوتا۔ پچھلی دفعہ کی تقریر میں نے NOTES کی مدد سے کی تھی۔ لیکن اس بار میں NOTES بھی مرتب نہیں کر سکا۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ مارچ کے شروع میں بیرون لاہور کا پروگرام ہے۔ اس کے بعد طبیعت خراب ہو گئی اور خراب بھی اتنی کہ شدید اندیشہ تھا کہ شاید میں کانفرنس میں شریک ہی نہیں ہو سکوں گا۔ یہ خدا کا احسان اور فضل و کرم ہے کہ طبیعت سنبھل گئی۔ چنانچہ جیسی کچھ تقریر بھی کر سکتا ہوں آپ کی خدمت کے لئے حاضر ہوں۔ دعا فرمائیے کہ اللہ تعالیٰ میرے ذہن اور قلب کو حق کے لئے کھول دے اور میری زبان کو قدرت دے کہ حق کو بیان کر سکوں۔ ساتھ ہی یہ بھی کہ حق کو حق اور باطل کو باطل کہنے کی توفیق عطا فرمائے۔ گروہی تعصبات سے بالاتر ہو کر دین حق کی خدمت کی توفیق عطا فرمائے اور اس بات کی ہمت بھی مرحمت فرمائے کہ اس کے مطابق اپنی زندگی کا رُخ تبدیل کر سکوں۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ پہلے بنیادی طور پر ایک بات سمجھ لیجئے۔ وہ یہ کہ دنیا میں با مقصد اور باشعور زندگی گذارنے

کیلئے دو چیزیں ضروری ہیں۔ ایک یہ کہ مقصد کا تعین واضح طور پر کیا جائے کہ جانا کدھر ہے اور منتہائے مقصود کیا ہے۔ اور دوسرے پوری وضاحت کے ساتھ یہ معلوم ہونا چاہئیے کہ صحیح طریق کار اور منہج عمل کیا ہے؟ اگر دونوں میں سے ایک کے معاملے میں بھی غلطی ہوگئی تو تمام تر اخلاص اور سعی و محنت کے باوجود انسان اپنے مقصد تک پہنچ نہیں پائے گا"۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا" اس معاملے میں اکثر افراد، گروہ اور تحریکیں افراط و تفریط میں مبتلا ہو جاتی ہیں۔ چنانچہ کہیں تو طریق کار ہی کو مقصود بنا لیا جاتا ہے اور پوری زندگی ایک دائرے کے اندر چکر لگانے ہی میں بتا دی جاتی ہے۔ اور منزل کی طرف پیش قدمی نہیں ہوتی۔ اس کی ایک مثال چشتی صاحب کی صبح کی تقریر میں بیان ہوئی تھی۔ ذکر اور شغل اصل میں مقصود بالذات نہ تھے، مقصود تھا ایمان و یقین جس کا لازمی نتیجہ ہے جہاد فی سبیل اللہ۔ لیکن ہوا یہ کہ ذریعہ ہی فی نفسہٖ مقصود بن گیا۔ اور 'نشانِ راہ' ہی "منزل" قرار پاگیا"۔

اسی افراط کی ایک مثال ڈاکٹر صاحب نے دی :-

"ایک بڑی عظیم تحریک جس کا میں نام لینا نہیں چاہتا اس لیے کہ مجھے نہ کسی سے کوئی بغض ہے نہ دشمنی۔ اور خدا گواہ ہے کہ میں ان کے اچھے پہلوؤں کا معترف ہوں۔ اس تحریک نے اپنے مخصوص طریق کار ہی کو مقصد کا درجہ دے دیا ہے۔ تقریباً نصف صدی سے ایک ہی کام کئے جا رہے ہیں۔ گویا ایک دائرے میں حرکت جاری ہے۔ منزل کا کوئی پتہ نہیں"۔

تفریط کا ذکر کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ"دوسری طرف بعض اوقات منزل مقصود تک جلد از جلد پہنچنے کی خواہش کا اس درجہ غلبہ ہو جاتا ہے کہ عجلت پسندی کے تحت کوئی SHORT CUT اختیار کر لیا جاتا ہے۔ اور اس طرح کئے کرائے پر پانی پھر جاتا ہے۔ چنانچہ برصغیر کی ایک دوسری عظیم اسلامی تحریک اس SHORT CUT کی بھول بھلیوں میں گم ہو کر رہ گئی ہے۔

گویا جہاں مقصد کا صحیح تعین ضروری ہے وہیں اس کے لیے صحیح طریق کار کا فہم بھی لازمی ہے اور پھر لازم ہے کہ انسان پورے صبر کے ساتھ، ثابت قدمی کے ساتھ TEMPTATION سے متاثر ہوئے بغیر اور PERSECUTION سے گھبرائے بغیر اس پر عمل پیرا رہے اور SHORT CUT کی خواہش میں اسے 'CUT' ہی کر کے نہ رکھ دے"۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "دوسری اہم اور اساسی حقیقت جو اپنی جگہ اظہر من الشمس ہے لیکن اکثر نگاہوں سے اوجھل ہوتی ہے۔ ہر مقصد کے لئے ایک مخصوص طریق کار ہوتا ہے اور ہر مقصد کے لیے ہر طریق کار مفید نہیں ہوتا۔ یہ دو اور دو چار کی طرح کی حقیقت ہے۔ لیکن بسا اوقات ایک شخص دیکھتا ہے کہ فلاں جماعت نے یہ سکہ مارکیٹ میں پھینکا اور اس سے اسے کچھ حاصل ہو گیا لہٰذا وہ بھی اس سکہ کو پھینک کر اسی طرح کا فائدہ حاصل

کرلے۔ لیکن یہی سب سے بڑا مغالطہ ہے۔ کوئی کمیونسٹ انقلاب برپا کرنا چاہے تو اس کے لئے لازم ہے کہ پہلے طبقاتی شعور پیدا کرے، پھر طبقاتی تصادم کرا دے، منافرت کی آگ بھڑکائے۔ اگر کوئی شخص شریف النفس ہے اور ان طریقوں کو استعمال نہیں کرنا چاہتا تو اسے اشتراکی انقلاب کا خیال دل سے نکال دینا چاہیئے۔ لیکن اگر کوئی شخص وہ انقلاب برپا کرنا چاہتا ہے جو نبی اکرمؐ نے برپا کیا ـــــ اور بڑے مبارک ہیں وہ لوگ جو اس کے لئے اپنی زندگیاں وقف کردیں ـــــ تو اس کی کوشش ہرگز کامیاب نہ ہوگی اگر وہ اشتراکی انقلاب کے طریق پر عمل پیرا ہو جائے۔"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "ایک نکتہ اور اہم ہے۔ بعض حضرات کا گمان ہے کہ شاید اقامت دین یا غلبۂ دین کا طریق قرآن میں بیان نہیں ہوا۔ یہ سوءِ ظن ہی نہیں بلکہ قرآن حکیم پر طعن ہے۔ اس لئے کہ اگر ایسا ہو تو بجائے اس کے کہ اللہ اور قرآن کی حجت ہم پر قائم ہو، الٹی ہماری حجت اللہ اور اس کے کلام پر قائم ہو جائے گی کہ وہ ایک فریضہ تو ہم پر عاید کرتا ہے لیکن اس کا طریقِ کار واضح نہیں کرتا۔"

ان تمہیدی کلمات کے بعد ڈاکٹر صاحب اپنے اصل موضوع کی طرف متوجہ ہوئے۔ "گزشتہ سال میں نے عرض کیا تھا کہ آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم کا مقصد بعثت ایک تو اساسی اور عمومی ہے جس میں جملہ انبیائے کرام آپؐ کے ساتھ شریک ہیں اور ایک تکمیلی اور خصوصی ہے جس کے اعتبار سے آپؐ جملہ انبیاء و رسل میں ایک منفرد حیثیت اور مرتبے کے حامل ہیں۔ ـــــ آج یہ عرض کرنا چاہتا ہوں کہ اسی طرح سمجھ میں آسکتا ہے کہ ایک ہے آپؐ کا اساسی طریقِ کار اور دوسرا ہے تکمیلی منہجِ عمل۔ پہلے میں دعوتی، تبلیغی، تعلیمی اور تربیتی رنگ نمایاں ہے جس کی جانب اشارہ کیا آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے اپنے ان الفاظ مبارکہ میں کہ "إِنَّمَا بُعِثْتُ مُعَلِّماً"۔ اور دوسرے میں تنظیم، کشمکش، تصادم اور جہاد و قتال کی شان نمایاں ہے۔ جس کی طرف اشارہ کیا حضورؐ نے اپنے ان الفاظ میں کہ "أَمُرُكُمْ بِخَمْسٍ، بِالْجَمَاعَةِ وَالسَّمْعِ وَالطَّاعَةِ وَالْهِجْرَةِ وَالْجِهَادِ فِي سَبِيلِ اللهِ"۔ ان میں سے ظاہر ہے اولین اور اہم ترین مرحلہ پہلا ہے اس لئے کہ اس کی تکمیل اور استحکام پر دوسرے مرحلے کی کامیابی کا دار و مدار ہے لیکن چونکہ سیرت کی کتابوں میں جہاد اور قتال کے مراحل زیادہ نمایاں ہوگئے ہیں۔ اس لئے اساسی مراحل نگاہوں سے اوجھل ہوگئے۔ حضرت اکبر الٰہ آبادی نے کیا خوب کہا ہے :

خدا کے کام دیکھو، بعد کیا ہے اور کیا پہلے
نظر آتا ہے مجھ کو بدر سے غارِ حرا پہلے

اساسی کام کئے بغیر تکمیلی کاموں کی جانب لپکنا ـــــ یہی سبب ہے محنتوں کے ضیاع اور سعی و جہد کے بار آور نہ ہونے کا۔ نتائج سے بے پروا ہو کر محنت کئے چلے جانا جب مشکل نظر آتا ہے تو اچھل کر چھلانگ لگا ڈالنا، سب کئے کرائے کو تباہ کر ڈالتا ہے!"

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "اسلامی انقلاب کے لئے اساسی طریقِ عمل یعنی بنیادی کام نہایت ضروری ہے۔ اسی سے فکر

سوچ، نقطۂ نظر، زاویۂ نگاہ اور اقدار بدلتی ہیں۔ جب افراد بدلتے ہیں تو معاشرہ اور قوم بدلتی ہے۔ یہاں تک کہ ایک عالمگیر انقلاب بھی آسکتا ہے۔ مکی زندگی میں نبی اکرمؐ نے اساسی طریق پر عمل فرمایا اور مدنی زندگی میں تکمیلی طریق کار اختیار فرمایا۔ مدنی زندگی میں جہاد و قتال سے جب کچھ فرصت ہوئی اور کچھ وقت امن ملا تو آپؐ نے پوری توجہ بنیادی کام کی طرف مبذول فرمادی۔ صلح حدیبیہ جسے قرآن نے فتح مبین سے تعبیر کیا ہے، اس کے بعد ۲ سال امن کے ملے۔ ان دو سالوں میں دعوتی اور تبلیغی سرگرمیاں پورے عروج کو پہنچ گئیں۔ صفہ کی تربیت گاہ سے وفود جارہے ہیں۔ تبلیغی جدوجہد اور پیغام ربانی کی نشرواشاعت PEAK پر ہے۔ اندرون و بیرون ملک دعوتی سرگرمیاں پورے عروج پر ہیں ـــــــ یہ اساسی طریق کار زندگی کے رخ کو بدل ڈالتا ہے۔ جس کے اندر یہ انقلاب آگیا اس کے لئے پورے عالم میں انقلاب آگیا۔ اس لئے کہ اس کی جملہ اقدار بدل گئیں۔ پہلے زندگی عزیز تھی اب موت عزیز تر ہے ؎

تو بچا بچا کے نہ رکھ اسے تیرا آئینہ ہے وہ آئینہ
کہ شکستہ ہو تو عزیز تر ہے نگاہِ آئینہ ساز میں

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "حضورؐ کا اساسی طریق انقلاب قرآن کے گرد گھوم رہا ہے۔ گویا قرآن کریم نبی اکرمؐ کا آلۂ انقلاب ہے۔ بقول حالی

اُتر کر حرا سے سوئے قوم آیا
اور اک نسخۂ کیمیا ساتھ لایا

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا "شاید کسی کے ذہن میں یہ خیال آئے کہ ایک کتاب سے انقلاب کیسے آسکتا ہے۔ اس کے لئے میرے پاس ایک دلیل ہے۔ جس سے آنکھوں سے پردہ ہٹ جاتا ہے۔ ذرا غور فرمائیے کیا دنیا میں سوشلسٹ انقلابات DAS CAPITAL کا نتیجہ نہیں ہیں! ایک فاتی اور گمراہ یہودی کی تصنیف اگر دنیا میں عظیم انقلابات کا پیش خیمہ بن سکتی ہے تو کیا اللہ کی کتاب ایک صالح انقلاب کا ذریعہ نہیں بن سکتی؟ ؎

ڈاکٹر صاحب نے اسلامی انقلاب کے اساسی طریق کار کی وضاحت کے ضمن میں سورۃ جمعہ کی دوسری آیت کی تفصیل کے ساتھ تشریح کی:

هُوَ الَّذِي بَعَثَ فِي الْأُمِّيِّينَ رَسُولًا مِنْهُمْ يَتْلُو عَلَيْهِمْ آيَاتِهِ وَيُزَكِّيهِمْ وَيُعَلِّمُهُمُ الْكِتَابَ وَالْحِكْمَةَ۔

اور اس سلسلہ میں تلاوت آیات، تزکیہ اور تعلیم کتاب و حکمت کے معانی پر تفصیل سے روشنی ڈالی۔

ڈاکٹر صاحب نے نبی اکرمؐ کی جو بنیادی حیثیتیں بیان فرمائیں۔ مبشر یا بشیر، منذر یا نذیر، ہادی، مبلغ، داعی الی اللہ اور مذکر اور ان میں سے ہر ایک پر تفصیل سے اظہار خیال کرتے ہوئے فرمایا کہ از روئے قرآن آنحضورؐ نے ان جملہ حیثیتوں

میں اپنا فرضِ منصبی قرآن حکیم ہی کے ذریعے ادا کیا۔

ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ ہماری موجودہ نوجوان نسل ہمارے لئے ایک چیلنج کی حیثیت رکھتی ہے۔ اگر منوا سکتے ہیں تو پہلے اس سے آخرت، وحی اور رسالت منوا لیجئے اور ان اساسی امور پر اس کا ایمان پختہ کیجئے۔ اس کے بعد اس سے نماز، روزہ، زکوٰۃ اور حج کو کہیں گے تو یہ کہنا نتیجہ خیز ثابت ہوگا۔ اور اگر ایسا نہیں کریں گے تو چکنے گھڑے کی مثال ہوگی۔ اسی طرح ہیئت اجتماعیہ کو لیجئے۔ اس کے بھی ہاتھ پاؤں ہیں۔ اس کا ذہن Intellectual Minority ہے۔ اس کے ہاتھ پاؤں کسان، مزدور اور عوام کے دیگر طبقات ہیں۔ دانشور طبقہ Intelligentsia جس فکر کو قبول کرلے وہ معاشرہ میں رواج پالے گی۔ "استحصال" جیسا ثقیل لفظ جسے دانشور طبقہ نے آگے بڑھایا۔ آج ہر جگہ رائج ہے۔ آپ ہر مزدور، کسان اور رکشہ اور تانگہ والے کی زبان سے اس کو سنیں گے۔ DAS CAPITAL کے ماننے والوں نے افسانوں سے، ڈراموں سے، اشعار سے غرض کہ ادب کی ہر صنف کے ذریعہ عوام کے اذہان پر قبضہ کیا۔ یہ لوگ روس وچین سے نہیں آئے یہ آپ ہی کے گھر کے چشم وچراغ ہیں۔ ان کے سر پر اشتراکیت کا جادو چڑھ گیا ہے۔

آنحضورؐ کے منہاج عمل کے تکمیلی مرحلے کی وضاحت کرتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ "ہم میں سے ہر ایک کا نفس فرعون ہے۔ اسی لئے پہلے داخلی مجاہدہ ہے۔ سب سے بڑا جہاد یہ ہے کہ اپنے نفس کو اطاعتِ خدا و رسولؐ کا خوگر بناؤ۔ کشمکش خیر وشر ہر انسان کے باطن میں ہے۔ اگر یہ مہم سر کرلی تو پھر آپ کے مجاہدہ کا خارج میں آنا صحیح ہوگا ورنہ آپ بہروپئے بن کر رہ جائیں گے۔ خلوت میں کچھ اور ہوں گے اور لوگوں کے سامنے کچھ اور! یہ مجاہدہ نفس سے شروع ہو کر ہر گھر، برادری اور پھر معاشرہ میں شروع ہو۔ صرف اللہ کی اطاعت پر کشمکش ہو رہی ہو۔ ISSUE صرف یہی ہو کہ اطاعت کا حق صرف اللہ کا ہے۔ یعنی یہ کہ گردن صرف خدائے واحد کے آگے جھکے گی۔ اس لئے پہلے کرنے کا کام یہ ہے کہ ذہنوں اور دلوں کی سرزمین پر ہل چلاؤ۔ اگر اس مشقت کے لئے تیار نہیں اور SHORT CUT کے طالب ہو تو جان لو کہ یہی سبب ہے تحریکوں کے غلط رُخ پر پڑ جانے کا۔"

آخر میں ڈاکٹر صاحب نے مرکزی انجمن خدام القرآن کے مقاصد کی وضاحت کرنے کے بعد قرآن اکیڈمی کے منصوبہ کی تفصیلات بیان فرمائیں۔ آپ نے فرمایا کہ قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد رکھ دیا گیا ہے اور تعمیرات کا کام جاری ہے۔ ہم اس کے لئے کوئی روائتی چندہ کی اپیل نہیں کرنا چاہتے۔ البتہ اس سلسلے میں تعاون کا خیر مقدم کیا جائے گا۔ اس موقعہ پر حاضرین میں ایک دو ورقہ بھی تقسیم کیا گیا جس میں مرکزی انجمن خدام القرآن کے پچھلے تین سالہ حسابات کا گوشوارہ اور انجمن کے مقاصد بیان کئے گئے تھے۔

ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی تقریر کے بعد اس اجلاس کے صدر مولانا سید وصی مظہر ندوی صاحب مائک پر تشریف لائے۔ انہوں نے فرمایا کہ ڈاکٹر صاحب نے موضوع کا حق ادا کر دیا ہے اور کسی بات کو مبہم نہیں چھوڑا۔ ساتھ

ہی مسکراتے ہوئے اپنے بارے میں کہنے لگے کہ میں چھوٹا آدمی ہوں اور یہ بڑی کرسی ہے اور ڈاکٹر صاحب نے ابھی یہ بتایا ہے کہ جتنی بڑی کرسی ہو اتنا ہی بڑا بوجھ ہوتا ہے۔

اصلاح اور انقلاب کا فرق واضح کرتے ہوئے مولانا ندوی صاحب نے فرمایا کہ اس کی مثال ایسی ہے جیسے ایک عمارت میں کئی خاندان رہتے ہیں۔ اب اگر وہ اس عمارت میں تبدیلی چاہیں تو وہ دو طرح کی ہو سکتی ہے۔ ایک یہ کہ عمارت کے اساسی نقشے کو برقرار رکھتے ہوئے صرف جزوی تبدیلی مطلوب ہو۔ اور دوسری یہ کہ در و دیوار ڈھا کر بالکل نئے نقشے پر نئی عمارت بنانا مقصود ہو۔ بس یہ ہے فرق اصلاح اور انقلاب میں جزوی تبدیلی ہو یا کلی مخالفت کا سامنا دونوں صورتوں میں ممکن ہے لیکن دونوں صورتوں میں رد عمل بالکل مختلف ہوگا۔

مولانا نے فرمایا کہ جو نئی عمارت چاہتا ہے وہ صاف صاف اس کی بنیادوں پر حملہ کرتا ہے۔ نبی اکرمؐ کا طریق انقلابی تھا۔ آپؐ نے جاہلی نظام کی بنیادوں پر ——— معصیت اور شرک ——— پر شدید حملہ کیا ——— یہ ہے پہلی چیز جو انقلابی طریق کار کیلئے لازم ہے

دوسری چیز جو انقلابی طریق کار کے لئے ضروری ہے۔ وہ یہ ہے کہ انداز بیان جارحانہ ہونا چاہئے مدافعانہ نہیں۔ اس کے لئے ضروری ہوتا ہے کہ حق کو پورے زور اور قوت کے ساتھ پیش کیا جائے۔ جیسے چٹان پر ضرب لگائی جاتی ہے اور اسے پاش پاش کر دیا جاتا ہے۔

مولانا نے فرمایا کہ جو لوگ پورے شعور کے ساتھ آئیں ان کی تنظیم کی جائے۔ ان کی تربیت کی جائے۔ ان اساسات کو مضبوط و محکم بنایا جائے جن پر یہ دین قائم ہے۔ تلاوت آیات، تزکیہ نماز وغیرہ اس کے ذرائع ہیں ——— پھر یہ کہ ممولوں کو شہبازوں سے لڑا دیا جائے۔ وہ باطل سے قدم قدم پر ٹکرائیں اور کسی قسم کی مصالحت نہ کریں۔ اس سے خوابیدہ صلاحیتیں بیدار ہوتی ہیں۔ اس سے حوصلہ پیدا ہوتا ہے۔ جب کوئی شخص اللہ کی راہ میں تکالیف برداشت کرتا ہے۔ اور جب وہ مار کھاتا ہوتا ہے تو اس وقت اس میں ایمان کا وہ شعلہ بھڑکتا ہے۔ جسے لوگ خانقاہوں میں تلاش کرتے پھرتے ہیں۔ مولانا وصی مظہر صاحب یہ فرما رہے تھے اور میں سوچ رہا تھا یا اللہ! یہ دیکھنے میں منحنی سا شخص ہے لیکن اس کا دل ایمان و یقین سے لبریز ہے۔ اس کے دل میں جہاد کا ولولہ ٹھاٹھیں مار رہا ہے۔ کاش کہ مجھ میں بھی ایسا جذبہ پیدا ہو جائے، کاش کہ میرے دل میں بھی ایمان کی چنگاریاں بھڑک اٹھیں۔ کاش اے کاش!!

مولانا وصی مظہر ندوی صاحب جن کو ایک انقلابی کی حیثیت سے آج میں نے پہلی بار جانا تھا۔ فرما رہے تھے "انبیاء کا طریقہ یہ نہیں ہے کہ وہ اکثریت کو ساتھ ملا کر کامیابی حاصل کرنا چاہیں۔ مٹھی بھر منظم جماعت جس کے افراد اپنے مقصد سے عشق رکھتے ہیں وہی لوگ انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ ہر طریقہ کا ایک مزاج ہے اور ہر مزاج کا ایک طریقہ ہے۔ صحیح طریقہ یہ ہے کہ آپ مکی دور سے راستہ پر ڈٹے رہیں"۔

مولانا کی تقریر کے بعد دعا ہوئی اور تیسری قرآن کانفرنس کا آخری اجلاس اپنے اختتام کو پہنچا۔

عشاء کی نماز باجماعت پڑھ کر اب ہم اپنی قیام گاہ جانے کے لئے منی بس میں بیٹھ چکے ہیں۔ ٹاؤن ہال کا بڑا دروازہ میرے سامنے ہے اور میں اسے اگلے سال تک کیلئے ـــــ اگر زندگی رہی تو ـــــ الوداع کہہ رہا ہوں۔ اور وہ مجھ سے گویا زبانِ حال سے پوچھ رہا ہے۔" اگلے سال آؤ گے ! ـــــ یوں ہی ایک چلتی پھرتی لاش کی طرح گناہوں کا پشتارہ کندھے پر لادے ـــــ یا ایک انقلابی بن کر ! ـــــ دین کا ایک مجاہد بن کر !! بولو ! ـــــ بتاؤ !!"

منی بس چلی جا رہی ہے اور میرے دل میں جذبات کا ایک طوفان بپا ہے۔ دماغ پر جیسے ہتھوڑے پڑ رہے ہیں ـــــ "حق کو پورے زور اور قوت کے ساتھ پیش کرو" ـــــ "بندگیٔ رب کی دعوت عام کرو" ـــــ "چٹان پر ضرب لگاؤ اور اسے پاش پاش کر دو" ـــــ "ممولوں کو شہبازوں سے لڑا دو" ـــــ "مخلص بھر منظم جماعت" ـــــ "اس کے افراد کا مقصد کے ساتھ عشق" ـــــ "نقدِ جان ہتھیلی پر رکھ کر آنا" ـــــ "کشتیاں جلا کر آنا" ـــــ "سوئے گردوں نالۂ شب گیر کا سفیر بھیجنا اور رات کے تاروں میں اپنے راز داں پیدا کرنا" ـــــ "اس مستعار زمین و آسمان کو پھونک کر خاکستر سے آپ اپنا جہاں پیدا کرنا" ـــــ "موجِ خونِ دل سے اپنا ایک چمن بنانا" ـــــ "یہ شہادت گہِ الفت میں قدم رکھنا ہے" ـــــ "شہادت ہے مطلوب و مقصودِ مومن" ـــــ "چوں می گویم مسلمانم بہ لرزم ٭ کہ دانم مشکلاتِ لاالٰہ را" ـــــ "اپنی صلیب اپنے کاندھے پر اٹھا کر چلو" ـــــ اور ـــــ اور ـــــ !

اور میں انہی خیالات میں گم تھا کہ منی بس ایک جھٹکے کے ساتھ رکی اور میرے بے ربط خیالات کا تانا بانا ٹوٹ گیا۔ ۱۲ - افغانی روڈ آگیا تھا۔ میری مقدس تمناؤں کا مرکز ـــــ میری مبارک امیدوں کا مسکن ـــــ اور جیسے میرے دل کا طوفان اچانک تھم گیا اور ایسے محسوس ہوا جیسے میرے دل کے ویرانے میں چپکے سے بہار آگئی ہو ـــــ جیسے گرانڈ میں ہولے سے بادِ نسیم چل رہی ہو ـــــ اور جیسے مجھ بیمار کو بے وجہ قرار آگیا ہو !

میرے قریب ہی سے ایک آواز آئی !

جبینِ وقت کی مغرور سلوٹوں پہ نہ جا
میں انقلاب زمانہ میں لا کے چھوڑونگا

اور یہ آواز فضا میں بلند سے بلند تر ہوتی چلی گئی۔ بادشاہی مسجد کے میناروں سے بھی بلند ـــــ مینارِ پاکستان سے بھی بلند ـــــ میں نے اِدھر اُدھر دیکھا، قریب کوئی نہ تھا، پھر یہ آواز کدھر سے آئی ! ـــــ گردن جھکا کر جو دیکھا تو محسوس ہوا کہ آواز کا مبداء تو میرے اپنے دل کی گہرائیاں تھیں ـــــ !!

مسلمانوں کے قرآن مجید سے بُعد اور بیگانگی کے اسباب

از قلم
پروفیسر یوسف سلیم چشتی

آریائی ذہن تصوراتی (SPECULATIVE) ہے اور سامی ذہن عملی (PRACTICAL) ہے۔ یونان، ایران اور ہندوستان، تینوں ملک فلسفہ و حکمت کا منبع تھے۔ لیکن اللہ کی حکمتِ بالغہ نے اپنے آخری اور کامل پیغامِ ہدایت کے لیے عرب کی زمین کو منتخب کیا جو منطق، فلسفہ اور حکمت کے اثرات سے پاک تھی۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ قرآن درسِ فلسفہ پر عملِ صالح اور جہاد کو ترجیح دیتا ہے۔ واضح ہو کہ قرآن حکمت کا منکر یا اُس کا دشمن نہیں ہے، بات صرف اتنی ہے کہ وہ بقولِ اقبال تصورات کے مقابلے میں عمل پر زیادہ زور دیتا ہے۔

(EMPHASISES DEED RATHER THAN IDEA)

قرآن صرف ایک اخلاقی نظام نہیں بلکہ وہ کامل دستورِ حیات ہے اور اسے نافذ کرنے کے لیے متکلمین کے بجائے مجاہدین کی ضرورت ہے۔

میرا ذاتی تجربہ ہے کہ منطق، فلسفہ اور کلام میں انہماک سے انسان کی عملی قوت (جو شرطِ جہاد ہے) بالکل افسردہ بلکہ مردہ ہو جاتی ہے۔ جب کہ اللہ یہ فرماتا ہے:۔

(۱) اِنَّ اللّٰهَ يُحِبُّ الَّذِيْنَ يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِهٖ صَفًّا كَاَنَّهُمْ بُنْيَانٌ مَّرْصُوْصٌ ۝

(۲) اِنَّ اللّٰهَ اشْتَرٰى مِنَ الْمُؤْمِنِيْنَ اَنْفُسَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ بِاَنَّ لَهُمُ الْجَنَّةَ

يُقَاتِلُوْنَ فِيْ سَبِيْلِ اللّٰهِ فَيَقْتُلُوْنَ وَيُقْتَلُوْنَ ۝ (۹/۱۱۱) مگر کسی منطقی یا فلسفی نے آج تک اپنی جان، اللہ کے ہاتھ نہیں بیچی۔ اِس لیے اللہ نے اپنے آخری پیغام کے لیے ایسی قوم کو منتخب کیا جو منطق، فلسفہ اور کلام تینوں عُلُومِ آلیہ سے بیگانہ تھی۔ اس لیے کہ اللہ کو اپنے کلمۂ حق کو بلند کرنے کے لیے مجاہد درکار تھے نہ کہ منطقی۔

وہ ایسے آدمی چاہتا تھا جو "سَمِعْنَا وَ اَطَعْنَا" کا مصداق ہوں تاکہ وہ اللہ کے قانون کو بلا چُون وچرا نافذ کرسکیں اور جب کوئی اُن سے پُوچھے کہ میاں تم ہمارے ملک میں کیوں آئے ہو؟ کیا مقصد ہے؟ تو وہ یہ جواب دیں جو قیامت تک یادگار رہے گا۔ "ہم خود نہیں آئے ہیں بلکہ اِنَّ اللّٰهَ اَرْسَلَنَا لِنُخْرِجَ النَّاسَ مِنْ ظُلُمَاتِ الْجَهَالَةِ وَجَوْرِ الْمُلُوْكِ اِلٰى نُوْرِ الْاِيْمَانِ وَعَدْلِ الْاِسْلَامِ"

قصّہ مختصر قرآن نے اُن سے کہا:

(۱) تمھاری دنیا کی زندگی، دراصل دھوکے کی پُونجی ہے یہ حقیقی (REAL) نہیں ہے۔ حقیقی زندگی تو مرنے کے بعد شروع ہو گی لہٰذا اُس کے حُصُول کے لیے کوشش کرو۔ اِنَّ الدَّارَ الْاٰخِرَةَ لَهِيَ الْحَيَوَانُ ۘ لَوْ كَانُوْا يَعْلَمُوْنَ ۝

(۲) یہ زندگی اُن کو ملے گی جو دینِ الحق کی نشرو اشاعت میں اپنی جان کھپائیں گے اور اپنی دولت خرچ کریں گے اور اللہ کو اپنا محبوب بنائیں گے۔

الغرض صحابۂ کرام نے ۲۳ سال تک آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم سے کوئی بحث نہیں کی، نہ منطقی، نہ کلامی، نہ سائنسی، نہ فلسفیانہ۔ مثلاً:۔

(۱) نہ بحثِ ذات وصفات (۲) نہ بحثِ خیروشر (۳) نہ بحثِ جبرواختیار (۴) نہ بحثِ حدوث وقِدَمِ عالم (۵) نہ بحثِ حشرِ اجساد (۶) نہ بحثِ وزنِ اعمال (۷) نہ کیفیت رُویت باری تعالیٰ (۸) نہ کیفیتِ جنّت و دوزخ (۹) نہ کیفیتِ برزخ (۱۰) نہ ماہیتِ نفسِ ناطقہ (۱۱) نہ ماہیتِ رُوح (۱۲) اور نہ چگونگیٔ اتّصالِ نفسِ ناطقہ باجسمِ انسانی یا کیفیت انفصالِ نفسِ ناطقہ از جسم۔

یہی بارہ۱۲ بنیادی سوال ہیں جو تین۳ ہزار سال سے اُستخوانِ نزاع بنے ہوئے ہیں

اور قیامت تک بنے رہیں گے کیونکہ ؎

انکشافِ رازِ ہستی عقل سے ممکن نہیں
فلسفی یاں کیا کرے اور سارا عالم کیا کرے!

اسی لیے حافظ شیرازی نے ہمیں مشورہ دیا تھا ؎

حدیث از مطرب و مے گو و رازِ دہر کمتر جو
کہ کس نکشود و نکشاید بحکمت ایں معمّا را

قرآنِ حکیم نے اپنی تعلیمات کی بناء پر ساری دنیا سے جنگ مول لے لی۔

(۱) سب سے پہلے مشرکوں کو ختم کیا (۲) پھر یہود کو زیر کیا بلکہ ختم کر دیا (۳) پھر نصاریٰ کو محکوم بنایا اور دونوں کو خارج البلد کر دیا۔ (۴) پھر عراق اور ایران کو فتح کیا، اور مجوسیت، مزدکیت اور مانویت کو ختم کر دیا۔ (۵) پھر شام اور ارضِ رُوم اور ایشیائے کوچک کو فتح کیا اور نصرانیت اور انسان پرستی کو ختم کیا۔ گویا حسبِ ذیل اقوام کو اپنا دشمنِ جانی بنا لیا۔

(۱) بُت پرست (۲) ستارہ پرست (۳) آفتاب پرست (۴) انسان پرست (۵) مجوسی (۶) مزدکی (۷) مانوی (۸) یہودی (۹) عیسائی۔ دوسرے لفظوں میں اسلام نے پہلی صدی ہجری ہی میں ساری دنیا کو اپنا دشمن بنا لیا۔

انتقام ۱۔یہودی قوم نے انتقام میں سبقت کی۔ سنہ ۳۰ھ میں عبداللہ ابنِ سبا یہودی منافقانہ طور پر اسلام لایا اور اُس نے مسلمانوں کو خدا پرستی کے بجائے شخص (انسان) پرستی کی تعلیم دی۔ اس طرح اسلام میں ایک ایسا فرقہ پیدا ہو گیا جس نے قرآن کے بجائے ایک خاندان کو، اور اللہ کے بجائے ایک شخص کو اپنا محبوب اور مطلوب بنا لیا۔ اس طرح ایک فرقہ بندی بھی پیدا کر دی جس سے اللہ نے اجتناب کا حکم دیا تھا، بفحوائے الفاظِ قرآنی: وَلَا تَكُونُوا مِنَ الْمُشْرِكِينَ ۝ مِنَ الَّذِينَ فَرَّقُوا دِينَهُمْ وَكَانُوا شِيَعًا ط (۳۲-۳۰)

مزید برآں اِس فرقے کی توجّہ قرآن سے ہٹ کر چند افراد پر مبذول ہوگئی اور اُس نے جہاد کے بجائے رنج وغم کو اپنا شعارِ حیات اور امتیازی نشان بنالیا۔ حالانکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم نے فرمایا کہ رنج وغم تین دن سے زیادہ مت کرو مگر ہم (یعنی نہ صرف وہ فرقہ بلکہ اُمّت کے سوادِ اعظم کی بھی بڑی تعداد) اِس کارِ خیر میں مصروف ہیں اور اللہ کے فضل سے ہر سال اس کی کمیّت اور کیفیت میں اضافہ ہوتا جاتا ہے۔

۲ - یہود کی کامیابی کے بعد ایران نے انتقام کا سلسلہ شروع کیا طُرفہ قیامت یہ ہوگئی کہ جُوں جُوں ایرانی انتقام میں شدید ہوتے چلے گئے۔ مسلمان اندرونی خلفشار کی وجہ سے جو عبداللہ ابنِ سبا نے پیدا کردیا تھا تمسّک بالقرآن میں ضعیف ہوتے چلے گئے۔

یہود نے انتقام اس طرح لیا کہ مسلمانوں کی توجّہ قرآن کے بجائے چند اشخاص کی طرف مبذول کردی اور ایرانیوں نے اس طرح کہ مسلمانوں کی توجّہ قرآن کے بجائے فلسفیانہ اور کلامی مسائل کی طرف منعطف کردی۔ چونکہ فاروقِ اعظمؓ نے ایران فتح کیا اس لیۓ ایرانیوں نے فاروقِ اعظمؓ سے دشمنی اور دُشنام کو اپنا قومی شعار بنالیا اور ہنوز یہی جذبات کار فرما ہیں۔ چنانچہ ایک ایرانی شاعر فردوسیٔ لعین نے اپنے معاندانہ جذبات کا اظہار ایرانی قوم کی زبان سے یوں کیا ہے :- ؎

ز شیرِ شتر خوردن و سوسمار | عرب را بجائے رسیدہ ست کار
کہ تختِ کیاں را کنند آرزو | تفو بر تو اے چرخِ گرداں تفو!

سچ کہا ہے کسی نے ع با آلِ عمرؓ کینہ قدیم است عجم را!

قصّہ مختصر مسلمان عجم میں آکر فلسفیانہ مسائل میں ایسے منہمک ہوئے اور پھر ایسے اُلجھے کہ ابھی تک نجات نہیں پاسکے اور میری بصیرت یہ کہتی ہے کہ صُورِ اسرافیل تک اُلجھے رہیں گے۔ کیونکہ کہاں مباحثے اور مجادلے کی لذّت وراحت اور کہاں میدانِ جنگ کی صعوبت وکلفت۔

یاد رکھو! منطق اور فلسفہ اور کلام میں انہماک کا لازمی نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ وہ قوم جہاد اور قتال سے بیگانۂ محض ہوجاتی ہے۔ اِس کا ثبوت درکار ہو تو تاریخِ ہند کا مطالعہ

کافی ہوگا۔ صرف ایک مثال درج کئے دیتا ہوں :۔

جب گیارھویں صدی عیسوی (پانچویں صدی ہجری) میں محمود غزنوی نے ہندوستان کو اپنے گھوڑوں کی ٹاپوں سے روندنا شروع کیا تو یہ زمانہ ہندوستان میں منطق، فلسفہ اور کلام کے عُروج کا زمانہ تھا۔

اِس وقت، اِس موقع پر اگر مَیں اُس عُروج کی تفصیل بیان کرنے لگوں تو اپنے موضوع سے بالکل منقطع ہو جاؤں گا اِس لئے صرف یہ کہنے پر اکتفا کرتا ہوں کہ اُس زمانے میں ہندوستان جنّت نشان میں صرف فلسفے کے چالیس مختلف النّوع مدارسِ فکر (بیس[۲۰] سے زائد صرف ہندو مت میں اور اٹھارہ[۱۸] بدھ مت، جین مت اور چارواک میں) موجود تھے جو رات دن مناظروں اور مباحثوں میں مشغول رہتے تھے۔ نتیجہ اِس اشتغال بالفلسفہ والمنطق کا یہ نکلا کہ پُوری قوم جنگی اسپرٹ سے بیگانہ ہو گئی تھی۔ منطق، اور فلسفے نے ہندوؤں کے قوائے عملیہ کو ضعیف کر دیا تھا اور وہ کسی جنگ میں کامیاب نہ ہو سکے۔ چنانچہ جس طرح چوتھی صدی ہجری میں بغداد کے مسلمانوں نے اسمٰعیلیوں کو تین لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ حجرِ اسود واپس کر دو۔ اسی طرح پانچویں صدی میں سومنات کے ہندوؤں نے محمود کو دس لاکھ اشرفیاں پیش کی تھیں کہ بُت کو مت توڑو۔ محمود نے کہا "مَیں بُت فروش بننے کے بجائے بت شکن بننا پسند کرتا ہوں، مَیں نہیں چاہتا کہ تاریخ میں میرا نام محمود بُت فروش درج کیا جائے"۔

گویا یہود کی طرح ایران نے بھی انتقام لے لیا یعنی مسلمانوں کو رفتہ رفتہ قرآن سے بُعد ہوتا چلا گیا اور نتیجۃً جہاد کا تصوّر دماغ سے محو ہوتا چلا گیا جہاد بالسّیف سے بیگانگی کا نتیجہ ۱۲۵۸ء[۱۵] میں ظہور پذیر ہُوا جب ہلاکو نے آخری عبّاسی خلیفہ مستعصم باللہ کے مشہور سبائی مشیرِ خاص نصیر الدّین طُوسی کے مشورے اور رُسوائے زمانہ سبائی وزیر اعظم ابن علقمی کے ایما سے بغداد کو فتح کر کے دریائے دجلہ کو پندرہ لاکھ منطقی، فلسفی، مُتکلّم، شاعر، موسیقار، منجّم و مہندس مسلمانانِ بغداد کے خونِ بے حمیّت و بے غیرت سے سُرخ کر دیا۔ اور سعدی شیرازی نے اپنی آنکھوں سے خونباری

کے بعد آسمان کے لیے بھی جواز پیدا کر دیا ہے

آسماں را حق بود گر خوں ببارد برزمیں
بر زوالِ ملکِ مستعصم امیر المؤمنیں

اگر مسلمان جہاد کی لذّت سے بیگانہ نہ ہو گئے ہوتے تو ایک نہیں دس ہلاکو بھی بغداد کو فتح نہیں کر سکتے تھے۔ لیکن جب سلاطینِ عبّاسی کے محلوں میں جاریہ اور سرکاشیہ کی حسین ترین لڑکیاں ہزاروں کی تعداد میں جمع تھیں۔ تو ایسے عالمِ ہوش رُبا میں جہاد کا خیال کس کافر کے دماغ میں آسکتا تھا؟

فٹن نفیس، سڑک خوشنما، ڈنر ہر شب
یہ لطف چھوڑ کے حج کا سفر! یہ خوب کہی! (اکبر)

ایرانیوں نے کمال چابکدستی سے اسلام کے ظاہری ڈھانچے کو تو قائم رکھا مگر اس میں سے رُوح نکال دی۔ یعنی مسلمانوں کو قرآن سے بیگانہ کر دیا اور قرآنی تعلیم کی جگہ اسلام کا ایک نیا ایڈیشن مُرتّب کر دیا جس میں سب کچھ تھا مگر جہاد فی سبیل اللہ اور انفاق فی سبیل اللہ کا ذکر نہ تھا۔ سچ کہا اکبر نے ؎

بہت ہی کم پائے اپنے عارف، کلامِ باریؑ نے ہم میں آکر
سرے سے بگڑا ہے سچ جو پوچھو عرب کا مذہب عجم میں آکر

قرآن سے بُعد و بیگانگی کی تیسری وجہ یہ ہوئی کہ ایران میں آکر جس طرح اسلام میں شرک اور شخصیّت پرستی کے ناپاک عناصر داخل ہو گئے اسی طرح تصوّف میں غیر اسلامی عقائد داخل ہو گئے اور وہ تصوّف جو عبارت تھا جہاد و مجاہدہ سے وہ بالکل "ترکِ دنیا ترکِ عُقبیٰ، ترکِ مولیٰ، ترکِ ترک" یعنی سراسر RENUNCIATION اور رہبانیت بن گیا اور مساجد ویران اور خانقاہیں معمور ہوتی چلی گئیں اور یہ ایرانیوں نے انتقام کی تیسری شکل اختیار کی کہ مجاہدوں کو گوشہ نشین بنا دیا ہے

مست رکھو ذکر و فکرِ صبحگاہی میں اِسے
پختہ تر کر دو مزاجِ خانقاہی میں اِسے

کس قدر صحیح نقشہ کھینچا ہے :-

فقیراں تا بمسجد صف کشیدند گریبانِ شہنشاہاں دریدند!
چو آں آتش درونِ سینہ افسرد مسلماناں بدرگاہاں خزیدند!

چنانچہ قرآن سے بے تعلقی کا ایک اہم سبب یہ خانقاہیں بن گئیں۔ دراصل ان کا واضح اور معیّن مقصد تو یہ نہیں تھا کہ مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو جائیں مگر شام، عراق، ایران، ترکستان اور ہندوستان ان سب ممالک میں حالات ایسے پیدا ہو گئے کہ ان خانقاہوں کی چار دیواری سے قرآن آہستہ آہستہ خارج ہوتا چلا گیا ؎

جو خدا کا نام لے سکتے تھے وہ رخصت ہوئے
خانقاہوں میں مجاور رہ گئے یا گورکن! (بہ تبدیلِ الفاظ)

بے شک سلطان الہند نظام الدین اولیاء اور اُن کے خلیفہ حضرت چراغ دہلی کی خانقاہوں میں قال اللہ اور قال الرسولؐ کی آوازیں بھی بلند ہوتی تھیں مگر پندرھویں صدی سے قرآن ان خانقاہوں سے یعنی صوفیوں کے نصابِ تعلیم سے خارج ہو گیا اور صوفیوں کا مقصدِ حیات صرف ذکر اور مراقبہ بن گیا۔ یہاں ایک اہم نکتے کی وضاحت کر دوں میرے اِس قول سے کہ "صوفیوں کا مقصدِ حیات صرف ذکر و مراقبہ تھا" کسی کو یہ غلط فہمی نہ ہو کہ میں ذکر و مراقبے کی افادیّت اور اہمیّت کا منکر ہوں۔ یہاں جو بات میں کہنا چاہتا ہوں وہ یہ ہے کہ عموماً صوفیاء ساری عمر ذکر اور مراقبے میں بسر کر دیتے ہیں حالانکہ ذکر اور مراقبہ مقصود بالذّات ہرگز نہیں ہے بلکہ مقصود بالعرض ہے۔ یہ اس لیے کرایا جاتا ہے کہ سالک کے نفس کا تزکیہ ہو جائے اور وہ سلطانِ جائر کے سامنے کلمۂ حق کہہ سکے لیکن ایک عرصۂ دراز سے ذکر اور مراقبہ ہی مقصود بالذّات بن چکا ہے۔ اب کوئی کلمۂ حق کہنے والا، ان خانقاہوں سے (جو پاکستان میں شاد اور آباد ہیں) میدان میں نہیں نکلتا۔ اسی لیے تو اقبالؔ نے کہا ؎

تین سو سال سے ہیں ہند کے میخانے بند
اب مناسب ہے ترا فیض ہو عام اے ساقی

اس شعر میں تلمیح ہے حضرت مجدّد الفِ ثانیؒ کی طرف کہ ساقی کا فیض غیر مشروط نہیں ہے وہ تعیّنِ راستہ ضرور دکھاتے ہیں مگر انہی کو جو اُن کے لیے مجاہدہ کریں۔ افرنگی صوفوں پر بیٹھنے والے فیض یاب نہیں ہو سکتے۔

قانون :- وَالَّذِينَ جَاهَدُوا فِينَا لَنَهْدِيَنَّهُمْ سُبُلَنَا

چنانچہ خود اقبالؔ ایک دوسرے مقام پر فرماتے ہیں :-

ایں چنیں دل خود نگر، اللہ مست
جز بدرویشی نہ مے آید بدست !

قرآن سے بے تعلقی کی چوتھی وجہ اشتغال بالحدیث ثابت ہوا اور اُس میں غیر معمولی انہماک کی وجہ یہ ہوئی کہ سبائیوں، زندیقوں، منافقوں اور ایرانیوں نے محض انتقام لینے کے جذبے سے سرشار ہو کر لاکھوں جھوٹی حدیثیں وضع کر کے مسلمانوں میں شائع بھی کر دیں اور کتابوں میں درج بھی کر دیں اور منافقانہ طور پر مسلمان بن کر اسلامی مدارس میں اُن احادیث کا درس بھی دیا اور اُنہیں سادہ لوح مسلمانوں کے ذہنوں میں اِس طرح پیوست کر دیا کہ وہ ایک ہزار سال گزر جانے کے باوجود ہنوز جزوِ ایمان و عقائد بنی ہوئی ہیں۔ اگر ان کی مثالیں دُوں تو پھر اپنے موضوع سے بہت دور چلا جاؤں گا۔ سامعین بطورِ خود موضوعاتِ کبیر مصنفہ ملّا علی قاری کا مطالعہ کریں۔ پانچ سو جھوٹی حدیثیں تو مجھے بھی معلوم ہیں اور اسی لیے ایک ایک روایت کی تحقیق کے لیے مسلمانوں کو ہزاروں میل کا سفر طے کرنا پڑا اور جب امام اسمٰعیلؒ بخاری نے مشہور عالم مجموعۂ احادیث مرتّب اور مدوّن کیا تو چھ لاکھ حدیثوں میں سے صرف تین ہزار قبول کیں۔

مَیں کہنا یہ چاہتا ہوں کہ حدیثوں کی چھان پھٹک میں مسلمان اس قدر منہمک ہوئے کہ قرآن کی طرف وہ توجہ مبذول نہ کر سکے جس کا وہ مستحق تھا اور وہ پسِ منظر میں چلا گیا۔ قرآن سے بُعد و بیگانگی کی پانچویں وجہ یہ ہوئی کہ حکومت میں عہدہ حاصل کرنے مجسٹریٹ اور جج بننے کے لیے صرف فقہ کی ضرورت تھی۔ اِس لیے مسلمانوں کی توجہ قدرتی

طور پر تحصیلِ فقہ کی طرف مبذول ہوگئی اور قرآن بیک گراؤنڈ میں چلا گیا اس لیے کہ جب صرف فقہ پڑھ کر عزت اور حکومت مل سکتی ہے تو کوئی قرآن کیوں پڑھے ؟

قرآن سے بیگانگی کی چھٹی وجہ یہ ہوئی کہ جب مسلمانوں میں ملوکیت مستحکم ہوگئی تو ملوک اور سلاطین نے علماء کو مشورے کے رنگ میں حکم دیا یا حکم کے رنگ میں مشورہ دیا کہ مسلمانوں کی توجہ حدیث اور فقہ پر مبذول کردو۔ اپنے حلقۂ درس میں قرآن کی تعلیم عام مت کرو کیونکہ اس کی زد بہرحال ملوکیت پر پڑے گی ؎

زیر گردوں آمری از قاہری است
آمری از ماسوی اللہ کافری است

اور ——— سروری زیبا فقط اُس ذاتِ بے ہمتا کو ہے
حکمراں ہے اک وہی باقی بتانِ آذری

ظاہر ہے کہ ہارون اور مامون سے لے کر شاہجہان اور عالمگیر تک سب کی نفی ہوجائے گی اور یہ لوگ بقولِ اقبال بت بن جائیں گے۔ مسلمان حکمرانوں کو نہ اس کی ضرورت تھی نہ وہ یہ چاہتے تھے کہ عوام قرآنی تعلیمات سے آگاہ ہوکر کوئی انقلاب برپا کریں اور اس طرح اُن کے عیش میں خلل پڑے۔ رہے علماء اور صوفیاء تو وہ خود قرآن سے بے تعلق تھے یا غیر جانبدار کہہ لو۔ نہ اقرار می کنم و نہ انکار می کنم علماء کا مبلغِ علم فقہ تھا اور صوفیاء کا منتہائے پرواز بلکہ مقصدِ حیاتِ ذکر و مراقبہ تو وہ قرآن کا ترجمہ کیوں کرتے ؟ تو جب سلاطین، نوابوں، جاگیرداروں، اور سرمایہ داروں کا فائدہ اس میں تھا کہ عوام قرآن سے بیگانہ رہیں تو علماء اور صوفیاً پاگل تھے جو سلاطین سے ٹکر لیتے ؟ اور اپنے وظیفے بند اور جاگیریں ضبط کراتے ؟ نہ ہر عالمِ دین امام ابنِ تیمیہؒ ہوسکتا ہے اور نہ ہر صوفیٔ صافی امامِ ربانی مجدد الفِ ثانی ہوسکتا ہے ؎

گردن نہ جھکی جس کی جہانگیر کے آگے
جس کے نفسِ گرم سے ہے گرمیٔ احرار !

قرآن سے مسلمانوں کی بیگانگی کی ساتویں وجہ یہ ہوئی کہ جب اورنگ زیب کے عہد میں مُلّا نظام الدّین سہالوی نے مشہورِ عالم درسِ نظامیہ مُدوّن کیا (جو گذشتہ تین سو سال سے بجنسہٖ و بعینہٖ ہمارے عربی مدارس پر حکمران ہے) تو اس میں منطق کی تو پندرہ[1] کتابیں رکھیں لیکن قرآن کے صرف ڈھائی پارے اور وہ بھی بطورِ تبرّک اس کا نتیجہ یہ نکلتا ہے کہ عربی مدارس کے طلبہ کے دماغوں میں جو آگے چل کر علماء بنتے ہیں، قرآن کی کوئی اہمیّت سرے سے جاگزیں نہیں ہو پاتی اور وہ قرآن سے متعلق کسی موضوع پر نہ تقریر کر سکتے ہیں اور نہ چار سطریں لکھ سکتے ہیں، الّا ماشاء اللہ!

نوٹ تقلید کا ایک نتیجہ یہ بھی ہے کہ ہمارے علماء جو ۱۹۷۶ء میں مصروفِ درس و تدریس ہیں، وہ اتنی جرأت نہیں رکھتے کہ اس نصاب میں جو ۱۶۸۶ء میں مدوّن ہوا تھا، کوئی تبدیلی کر سکیں۔ اسی لیے عام طور پر نئے فاضلینِ درسِ نظامی کو یہ معلوم نہیں ہوتا کہ تبوک مدینے سے کتنے میل دور ہے؟ اور ہے کہاں؟ جنگ یرموک کب واقع ہوئی تھی؟ قسطنطنیہ پر پہلا حملہ کس سن میں ہوا تھا؟ وقِس علیٰ ھٰذا!

قرآن سے بیگانگی کی آٹھویں وجہ یہ ہے کہ نہ صرف ایران بلکہ عالمِ اسلام کے تمام مشرقی ممالک میں دفتری زبان فارسی ہو گئی اور عربی کی حیثیّت صرف ثانوی رہ گئی۔ چنانچہ جب صرف کنز اور قدوری پڑھ کر ایک مسلمان کو سرکاری عہدہ مل سکتا تھا تو وہ قرآن پر عرق ریزی کیوں کرتا!

قرآن سے دُوری کی نویں وجہ یہ ہے کہ سرمایہ داروں، نوّابوں اور جاگیرداروں کو قرآن میں اپنی موت نظر آئی۔ چنانچہ علّامہ اقبال فرماتے ہیں:-

چیست قرآں؟ خواجہ را پیغامِ مرگ — دستگیرِ بندۂ بے ساز و برگ
با مسلمان گفت جاں بر کف بنہ — آنچہ از حاجت فزوں داری بدہ

---

[1] صغریٰ۔ کبریٰ۔ قال اقول۔ میزان المنطق۔ بدیع المیزان۔ تہذیب۔ شرح تہذیب مرقاۃ قطبی۔ میر قطبی۔ سُلّم العلوم۔ ملّا حسن۔ ملّا مبین۔ قاضی مبارک۔ حمد اللہ (اور میرے بچپن میں غلام یحییٰ بھی داخلِ درس تھا)۔

ہیچ خیر از مردکِ زر کش مجو — لَنْ تَنَالُوا الْبِرَّ حَتّٰی تُنْفِقُوْا !

دِہ خدایا نکتۂ از من پذیر — رزق و گور از وے بگیر او را مگیر
باطنِ اَلْاَرْضُ لِلّٰہ ظاہر است — ہر کہ ایں ظاہر نہ بیند کافر است
حق زمیں را جُز متاعِ ما نگفت — ایں متاعِ بے بہا مفت است مفت

تو ان لوگوں نے کوشش کی کہ قرآن کی تعلیم عام نہ ہونے پائے اور یہ لوگ اپنے اثر و رسوخ اور مال و زر کی بنا پر اپنے مقصدِ مشئوم میں کامیاب ہوگئے اور مسلمان قرآن سے بیگانہ ہوتا چلا گیا۔

قرآن سے بیگانگی کی دسویں اور آخری وجہ یہ ہوئی کہ جب عوام اور خواص حکومت اور اس کے نتیجے میں دولت سے مستفید ہوئے تو وہ تمام عیوب اُن میں پیدا ہوگئے جو حکومت اور دولت کا منطقی نتیجہ ہوتے ہیں۔ یہ عیوب مثلاً عقیدے کی خرابی بلکہ خرابیاں غیر اسلامی رسوم پر عمل اور انہیں داخلِ اسلام سمجھنا اور خلافِ قرآن زندگی بسر کرنا یہ چیزیں اس قدر محبوب ہوگئیں کہ مسلمانوں کا مذہب بن گئیں (تفصیل میں مصلحتاً جانا نہیں چاہتا کیونکہ تفصیل میں بعض عناصر کی نشاندہی کرنی پڑے گی اور یہ بات خلافِ مصلحت ہے) ؎

مصلحت نیست کہ از پردہ بروں افتد راز
ورنہ در محفلِ رنداں خبرے نیست کہ نیست !

اب قرآن تو ان سب باتوں کا دشمن ہے مثلاً قرآن کہتا ہے : وَالَّذِيْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِهٖ مَا يَمْلِكُوْنَ مِنْ قِطْمِيْرٍ قطمیر وہ سفیدی جو کھجور کی گٹھلی کے سرے پر پائی جاتی ہے اور اس سے کم تر اور بے قیمت چیز عربوں کے یہاں موجود نہیں تھی اِنْ تَدْعُوْهُمْ لَا يَسْمَعُوْا دُعَآءَكُمْ وَلَوْ سَمِعُوْا مَا اسْتَجَابُوْا لَكُمْ وَيَوْمَ الْقِيٰمَةِ يَكْفُرُوْنَ بِشِرْكِكُمْ (۳۵ - ۱۳ و ۱۴)

یہ صرف ایک آیت ہے قرآن میں اِسی مضمون کی سینکڑوں آیات ہیں۔ تو ان طبقات نے جو سلاطین، امراء، علماءِ سوء اور صوفیاءِ سوء پر مشتمل تھا ایسی کوشش کی

کہ عوام اور خواص دونوں قرآن سے بیگانہ ہو جائیں تاکہ ہماری غیر قرآنی زندگی اور عقائد و رسوم اور طرزِ حیات پر گرفت نہ کر سکیں بلکہ شرک اور اولیاء پرستی اور قبور پرستی اور آثار پرستی، سب کو عین اسلام سمجھیں اور یہ اسی صورت میں ممکن ہے جب عوام اور خواص قرآن سے بیگانہ ہو جائیں۔ چنانچہ چاروں طبقات کی ملی بھگت سے مسلمان قرآن سے بیگانہ ہو گئے ہے

وَمَا اَفْسَدَ الدِّيْنَ اِلَّا الْمُلُوْكُ
وَاَحْبَارُ سَوْءٍ وَرُهْبَانُهَا

اور یہ بھی غالباً اِسی ملی بھگت کا نتیجہ تھا کہ پورے ایک ہزار برس تک قرآنِ حکیم کا مسلمان اقوام کی مادری زبانوں میں ترجمہ کرنے کی مخالفت کی گئی۔ واللہ اعلم!

جب ۱۲۰۶ء میں مسلمانوں کی حکومت ہند میں قائم ہوئی تو مسلمان جو اسلام اپنے ساتھ لائے اُس کا منبع و مبنیٰ قرآن نہیں تھا بلکہ صرف علمِ فقہ تھا۔ اس پر مستزاد یہ کہ سلاطینِ دہلی یا علماءِ ہند نے قرآن کا ہندوستان کی زبانوں میں ترجمہ کرنے کا کوئی انتظام نہیں کیا۔ یہ کام اللہ کے ایک برگزیدہ بندے شاہ ولی اللہ محدّث دہلویؒ نے ۱۷۴۰ء کے قریب انجام دیا۔ یعنی مسلمانوں کی حکومت کے قیام سے پانچ سو سال کے بعد شاہ صاحب کا فارسی ترجمہ شائع ہوا کیونکہ انہوں نے دیکھا کہ مسلمان قرآن سے بالکل بیگانہ ہو چکے تھے۔ اگرچہ وقت بہت کم ہے مگر یہ کہے بغیر آگے بڑھنے کو جی نہیں چاہتا کہ انگریزوں کی حکومت باضابطہ طور پر ۱۷۷۲ء میں قائم ہوئی اور حکومت نے اپنی نگرانی میں ۱۷۹۳ء میں پوری بائبل کا ترجمہ بنگلہ زبان میں شائع کر دیا اور اُس کے بعد ۱۸۰۶ء میں بائبل کا ترجمہ فارسی زبان میں شائع ہو گیا اور یہ تراجم حکومت کی سرپرستی میں شائع ہوئے اور ۱۸۴۰ء میں مرزا پور سے بائبل کا ترجمہ اردو میں شائع ہوا اور اُس کے بعد ہندی میں۔

ہندوستان میں اٹھارہ (۱۸) زبانیں ہیں اور دو سو (۲۰۰) بولیاں۔ آج بائبل کا ترجمہ ان ساری زبانوں میں موجود ہے اور سامعین کی معلومات کے لیے یہ بھی بیان کئے دیتا ہوں

کہ بائبل کا ترجمہ دنیا کی سات سو پینسٹھ (۷۶۵) زبانوں میں ہو چکا ہے اور طالبین کو برائے نام قیمت پر مل سکتا ہے۔ دوسری طرف ہم ہیں کہ ہم نے چھ سو برس حکومت کی، اور ہندوستان کی چھ زبانوں میں بھی قرآن کا ترجمہ نہیں کیا۔ ہندوستان میں ہندی زبان میں قرآن کا پہلا ترجمہ ۱۹۲۶ء میں خواجہ حسن نظامی نے شائع کیا تھا۔ علماء کی تنگ نظری ملاحظہ ہو! فارسی میں ترجمہ کرنے کے 'جرم عظیم' میں مولویوں نے بعض لوگوں کو شاہ صاحب (ولی اللہؒ) کے قتل پر آمادہ کیا۔ لیکن دشمنانِ دین اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے۔

۱۸۰۵ء میں یعنی قیامِ حکومت کے چھ سو سال بعد شاہ ولی اللہؒ کے فرزند شاہ عبدالقادرؒ نے قرآن مجید کا اردو ترجمہ کیا۔ ۱۸۵۷ء میں مسلمانوں کی حکومت کا چراغ جو ۱۸۰۳ء سے ٹمٹما رہا تھا، گل ہو گیا۔ "مسلماناں در گور و مسلمانی در کتاب" انگریزی حکومت کے زیر اثر مسلمان عوام قرآن تو کجا اسلام ہی سے بیگانہ ہو گئے ؎

یوں قتل سے بچوں کے وہ بدنام نہ ہوتا افسوس کہ فرعون کو کالج کی نہ سوجھی

بیسویں صدی میں سب سے پہلے اکبر نے مسلمانوں کو قرآن کی طرف بلایا ؎

مُغوی تو ملیں گے تمھیں شیطان سے بہتر
ہادی نہ ملے گا کوئی قرآن سے بڑھ کر!

ان کے بعد اقبال نے مسلمانوں سے کہا ؎

گر تو می خواہی مسلماں زیستن نیست ممکن جز بقرآں زیستن

لیکن مسلمان من حیث القوم ہنوز قرآن سے بیگانہ ہیں۔ اُن کی زندگی میں سب کچھ داخل ہے مگر قرآن داخل نہیں ہے، جبھی تو اقبال نے کہا ؎

بہ بندِ صوفی و مُلّا اسیری حیات از حکمتِ قرآں نگیری
بآیاتش ترا کارے جز ایں نیست کہ از یٰسین اُو آساں بمیری

فی الجملہ یہ بات میرے لیے باعثِ صد مسرّت ہے کہ میرے عزیز بھائی ڈاکٹر اسرار احمد سلمہٗ نے مسلمانوں کو قرآنِ حکیم سے رُوشناس کرنے کے لیے ایک منظم تحریک کا آغاز کیا

ہے تاکہ مسلمانانِ پاکستان اپنے اندر وہ باطنی انقلاب پیدا کر سکیں جس کے نتیجے میں خارج میں انقلاب برپا کر سکتے ہیں۔ میں علیٰ وجہ البصیرت کہتا ہوں کہ اس سے بڑھ کر کوئی ملّت کی اور کوئی خدمت نہیں ہو سکتی کہ مسلمانوں کو قرآن کی طرف بُلایا جائے اور اُن اِس حقیقت سے آگاہ کیا جائے کہ :-

تو ہمی دانی کہ آئینِ تو چیست ؟ زیرِ گردوں سرِّ تمکینِ تو چیست ؟
آں کتابِ زندہ قرآنِ حکیم حکمتِ اُو لایزال است و قدیم
فاش گویم آنچہ در دلِ مضمر است ایں کتابے نیست چیزے دیگر است
چوں بجاں در رفت جاں دیگر شود جاں چو دیگر شد جہاں دیگر شود!

واضح ہو کہ تعمیرِ فکر کے لیے سب سے پہلے تطہیرِ فکر لازمی ہے اور تطہیرِ فکر قرآنِ حکیم میں تدبّر کے بغیر محالِ عادی ہے۔ اللہ سے دُعا ہے کہ وہ برادرِ عزیز القدر کو اپنے مقاصد میں کامیابی عطا فرمائے آخر میں سامعین کے لیے اقبال کا ایک شعر بطورِ ارمغان پیش کرتا ہوں :-

برخور از قرآں اگر خواہی ثبات در ضمیرش دیدہ ام آبِ حیات

بقیہ اقبال اور وجودِ مصدقہ

حقیقت بنتی ہے۔ ایسے مقام پر فائز انسان کُلّی طور پر آزاد ارادہ رکھتا ہے اور ہر قسم کے خوف و ہراس سے نجات پاتا ہے۔ اس کیفیّت کو علامہ یوں بیان فرماتے ہیں :-

ستردن نقشِ ہر امّید و بیمے زدن چاکے بدریا چوں کلیمے
شکستن ایں طلسمِ بحر و بر را ز انگشتے شگافیدن قمر را
ولے ایں راز را گفتن محال است کہ دیدن شیشہ و گفتن سفال است

اگر آزمائش کے تیسرے مرحلے سے گزرنا ہر کس و ناکس کے لیے ممکن نہیں تو کم از کم امتحانِ خودی کے پہلے اور دوسرے مرحلوں سے گزرنے کی کوشش ہر صاحبِ فکر پر لازم ہے۔

خواجہ غلام صادق

اقبالؒ
اور
وجودِ مصدّقہ

خواجہ غلام صادق شعبۂ فلسفہ جامعہ پنجاب

آج کی اس نشست میں جاوید نامہ کے مرکزی مضمون کے بارے میں گفتگو کرنا چاہتا ہوں۔ میری یہ کوشش ہوگی کہ اس مضمون کو سادہ الفاظ میں پیش کروں اور یہ بھی واضح کروں کہ جاوید نامہ، اسرارِ خودی سے اس طرح منسلک ہے کہ گویا اس کا تکملہ ہے۔

جاوید نامہ کے جس مرکزی تصوّر کا ذکر مجھے آپ سے کرنا ہے، علاّمہ نے اُسے اسرارِ معراج کے زیرِ عنوان بیان کیا ہے اور اس بیان کا آغاز ایک یونانی فلسفی کے مشہور واقعہ سے کیا ہے۔ مولانا روم نے یونانی فلسفی کے اس واقعے کو اپنی ایک نظم میں باندھا تھا اور واقعہ سے متعلقہ اشعار علاّمہ نے اسرارِ خودی کے آغاز میں FLY-LEAF پر رقم کئے ہیں۔ یونانی فلسفی کے اِس قصّہ کے پیچھے جو حقیقت کارفرما ہے ہمیں اس سے سروکار ہے، وہ واقعہ سُن لیجئے۔ یونانی فلسفی دیوجانس کلبی (DIOGENES) جو افلاطون کا ہمعصر تھا، کے بارے میں مشہور ہے کہ ایک روز وہ چراغ لے کر بستی میں کچھ ڈھونڈ رہا تھا۔ لوگوں نے اُس سے پوچھا کہ دن کی روشنی میں چراغ لے کر کیا ڈھونڈ رہے ہو اس نے جواب دیا کہ اس بستی میں انسان ڈھونڈ رہا ہوں۔ لوگوں نے حیرت سے استفسار کیا کہ جو لوگ یہاں بستے ہیں کیا تمہیں وہ انسان دکھائی نہیں دیتے۔ اس پر فلسفی نے جواب دیا کہ وہ تو سب "دام و ددد"

یعنی چرندے اور درندے ہیں، ان میں انسان کوئی بھی نہیں۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ فلسفی کو اپنی بستی میں کس فرد کی تلاش تھی لوگ تو وہاں بستے تھے ان میں کس چیز کی کمی تھی جو وہ اسے "دام و دد" یعنی چرندے اور درندے نظر آتے تھے۔ یونان ہی سے متعلق ایک اور فلسفی کے ساتھ ایک عجیب واقعہ پیش آیا تھا مگر اس واقعہ سے اُس شخص کی شخصیت مزید اُجاگر ہوئی تھی۔ یہ حکیم سقراط تھا۔ یونان میں ڈلفائی کا مشہور معبد خانہ تھا (ORACLE AT DELPHI) اس مندر پر لوگ اپنی حاجات لے کر جاتے اور سوالات کرتے۔ سوالات کے جواب میں مندر سے آواز آتی، جس میں اُن سوالات کا جواب مضمر ہوتا۔ اِن جوابات کو دیوتاؤں کے جواب تصوّر کیا جاتا۔ ایک مرتبہ ایک پجاری نے یہ سوال کیا کہ دنیا کا سب سے زیادہ عقلمند شخص کون ہے، اس پر جواب ملا 'سقراط'۔ لوگ سُقراط کے پاس گئے اور اسے مبارکباد دی۔ سقراط نے دیوتاؤں کے اِس بیان کی تصدیق چاہی اور سلسلے میں متعدد اشخاص سے گفتگو کی اور اسے معلوم ہوا کہ لوگ جس بات کے بارے میں کچھ نہیں جانتے وہ کبھی نہیں کہتے کہ وہ اس بات کے بارے میں رائے نہیں دے سکتے۔ بلکہ وہ اس کے بارے میں رائے ضرور دیتے ہیں اور یہ نہیں سمجھتے کہ وہ رائے دینے کے قابل نہیں ہیں۔ سقراط کو صرف اس بات پر اطمینان تھا کہ اسے یہ معلوم ہے کہ اس کا علم بہت ہی محدود ہے اور وہ اپنی رائے چند معاملات کے بارے میں ہی دے سکتا ہے۔ سقراط کی عظمت اس بات میں مضمر تھی کہ اسے علم کے میدان میں اپنی کم مائگی کا احساس تھا۔ سقراط نے اپنی شخصیت کی تصدیق دو سطحوں پر کی، پہلی خود آگاہی کی سطح تھی یعنی اس نے اپنے آپ کو اپنے شعور کی روشنی میں دیکھا اور دوسری سطح دوسروں کے شعور کی تھی یعنی اپنے آپ کو دوسرے لوگوں کے شعور سے دیکھا۔ تیسری سطح دیوتاؤں کے شعور کی سطح تھی اور اس سطح پر بھی ڈلفائی کے معبد خانے سے سقراط کے حق میں ہی فیصلہ صادر کیا گیا تھا۔ اگر میں بیسویں صدی کی ایک اصطلاح استعمال کروں تو مجھے سقراط کو فرد مصدّقہ (AUTHENTIC INDIVIDUAL) قرار دینا ہوگا۔ فرد مصدّقہ

رسم ورواج کا پابند نہیں ہوتا، وہ تخلیقی عمل سے ایک جہانِ نو تعمیر کرتا ہے اور اس کی تمام ذمہ داریاں قبول کرتا ہے۔ جیسا کہ اہلِ علم جانتے ہیں کہ جب سقراط سے یہ کہا گیا کہ یا تو اپنے فلسفے کا پرچار بند کر دے یا زہر کا پیالہ پی کر اپنی زندگی ختم کر دے تو سقراط نے نہایت اطمینان اور سکونِ قلب سے زہر کا پیالہ پینا منظور کیا تھا اور سچائی اور صداقت کا گلہ گھونٹنے کے جرم کا مرتکب نہ ہوا تھا۔ اس کی جانکنی کے وقت جب خواتین نے آہ وزاری اور رونا شروع کیا تو سقراط نے ان سب کو وہاں سے رخصت کر دیا اور چند شاگردوں کے ساتھ زندگی کے آخری لمحات بسر کئے تھے۔

سقراط میں وہ کیا بات تھی جو حکیم دیو جانس کلبی کو اپنے شہر کے کسی فرد میں نہ ملی۔ ایک بات تو اشارۃً میں نے بیان کر دی ہے کہ حکیم دیو جانس کلبی کی بستی کے لوگ "افرادِ مصدّقہ" نہ تھے، وہ پابندِ رسم و رواج تھے۔ انتخاب اور چناؤ سے پرہیز کرتے تھے اور ان کی مثال ان لوگوں جیسی تھی جو زندگی کی گاڑی کے آگے بیل یا گھوڑے کی طرح جوتے جاتے ہیں اور زندگی کی بے کیف معمولات کو اپنا اوڑھنا اور بچھونا بناتے ہیں۔ علّامہ اقبال "اسرارِ خودی" میں فرماتے ہیں ؎

ما ز تخلیقِ مقاصد زندہ ایم   از شعاعِ آرزو تابندہ ایم

(تخلیق مقاصد سے ہم زندہ ہیں۔ اور یہ آرزو ہی ہے جس کی شعاع سے ہماری زندگی کی چمک دمک قائم ہے)

یہ تخلیقِ مقاصد اور شعاعِ آرزو زندگی کو ہر دم جواں اور ہر لحظہ نئی شان دیتے ہیں۔ رسم ورواج کا پابند رہنا تخلیقی عمل کی نفی ہے۔

آفریدن، جستجوئے دلبرے   وا نمودن خویش را بر دیگرے

"اسرارِ خودی" میں علّامہ نے خودی کے بارے میں تفصیل سے گفتگو کی ہے۔ خودی کی تکمیل اور پختگی کے ضمن میں چند سماجی اور نفسیاتی عوامل کا ذکر کیا ہے جن کی بدولت خودی تعمیر یا تخریب کے عمل سے دوچار ہوتی ہے "جاوید نامہ" میں

علامہ نے ایک ایسی آزمائش یا ایسے امتحان کی بات کی ہے جس کی بدولت کوئی فرد اپنی خودی یا شخصیت کی پختگی یا پختگی کے درجے کا تعین کر سکتا ہے۔ اس آزمائش کے تین مرحلے ہیں۔ علامہ پیرِ رُومی کی زبان سے ان کا ذکر یوں کرتے ہیں :-

زندۂ یا مردۂ یا جاں بلب — از سہ شاہد کُن شہادت را طلب
شاہدِ اوّل شعورِ خویشتن — خویش را دیدن بنورے خویشتن
شاہدِ ثانی شعورِ دیگرے — خویش را دیدن بنورے دیگرے
شاہدِ ثالث شعورِ ذاتِ حق — خویش را دیدن بنورے ذاتِ حق
پیشِ ایں نورار بمانی اُستوار — حیّ و قائم چوں خدا خود را شمار
بر مقامِ خود رسیدن زندگی است — ذات را بے پردہ دیدن زندگی است
مردِ مومن در نسازد با صفات — مصطفیٰ راضی نہ شد الّا بذات
چیست موّاج آرزوئے شاہدے — امتحانے رُو بروئے شاہدے

. . . . . .

پیکرے فرسودہ را دیگر تراش — امتحانِ خویش کُن 'موجود' باش

سب سے پہلا مرحلہ اپنے آپ کو اپنے شعور کی روشنی میں دیکھنے کا ہے، دوسرا مرحلہ اپنے آپ کو دوسرے کے شعور کی روشنی میں دیکھنے کا ہے اور تیسرا مرحلہ اپنے آپ کو خدا کی ذات کے نور سے دیکھنے کا ہے۔ اگر ان تینوں مرحلوں پہ آپ کی شخصیت کی تصدیق ہو تو آپ فرد سے فردِ مصدّقہ کے مقام پہ فائز ہوتے ہیں یا نفسِ امّارہ سے نفسِ مطمئنہ تک رسائی پاتے ہیں

خویش را دیدن بنورے خویشتن

اپنے آپ کو اپنے شعور کی روشنی میں دیکھنے سے کیا مراد ہے؟ اس سوال کا ایک سطحی سا جواب یہ ہے کہ اگر آپ کسی سے دھوکہ یا فریب کرتے ہیں یا اپنی ظاہری ٹیپ ٹاپ کا اثر ڈالتے ہیں تو آپ کم از کم اپنے اس عمل سے جو خلوص سے عاری ہوتا

ہے، آگاہ ہوتے ہیں۔ کہنے کی بات یہ ہے کہ ایک سمگلر کو اس بات کا علم ہوتا ہے کہ وہ سمگلر ہے مگر دوسروں پر وہ اپنی عبادت پاکیزگی اور خلوص کو ظاہر کرنے کی کوشش کرتا ہے اور جب تک وہ قانون کی گرفت میں نہیں آتا عام لوگوں میں اس کا بھرم قائم رہتا ہے مگر اسے خود یہ معلوم ہوتا ہے کہ اس کی اصل اور حقیقت کیا ہے۔ اپنا شعور ہی اس پر اس کی دورُخی واضح کرتا ہے مگر اس "خویش را دیدن بنورِ خویشتن" کا ایک اور مفہوم بھی ہے اور وہ ہے اپنی لامحدود تخلیقی قوتوں سے آگاہی اور ان قوتوں کی لاتعداد امکنات کے حصول کے لیے استعداد کا شعور اس صدی کا مشہور فرانسیسی دانشور سارت کسی فرد کے اس کی موجودہ صورتِ حال سے مطمئن ہونے کے عمل کو BAD FAITH (ضعفِ ایمان) کا نام دیتا ہے۔ اس کے نزدیک ضعفِ ایمان [ایک معلم یا کارکن پر بھی اسی طرح چسپاں ہوگا جس طرح] کسی ہوشیار کیفے ویٹر پر یا کسی ملازم پر جو اپنی ملازمت کی ذمہ داریاں پوری طرح بجا لاتا ہے۔ کسی بھی صورتِ حال پر مطمئن رہنا تخلیقی قوتوں کی نفی کرنا ہے اپنے آپ کو نیچے گرانا ہے، اور "ہر لحظہ ہے مومن کی نئی آن نئی شان" کے اعزاز سے اپنے آپ کو محروم کرنا ہے۔ "قناعت نہ کر عالمِ رنگ و بو پر" میں اسی مضمون کی طرف اشارہ ہے۔

معمولاتِ زندگی میں پھنسے رہنے والے شخص کی مثال کامو (CAMUS) کے نزدیک سیسیفس (SISYPHUS) کی سی ہے، جسے دیوتاؤں نے اس کے جرم کی یہ سزا دی تھی کہ سارا دن ایک بھاری پتھر کو پہاڑ کی چوٹی پر لے جانے میں صرف کرتا اور جب شام کے وقت چوٹی پر پہنچتا تو پتھر پہاڑی سے نیچے اپنے وزن سے از خود گر جاتا اور سیسیفس اگلے روز پھر اس عمل کو دہراتا۔ پتھر لے جانے کا بے کیف و مہمل عمل وہ ہر روز کرتا۔ ایک دفتر میں ملازم شخص بیس برس کی عمر میں دفتر میں ملازمت اختیار کرتا ہے اور ہر روز سرخ فیتے میں بندھی ہوئی فائلوں کے ڈھیر اوپر نیچے کرتا رہتا ہے اور اٹھاون برس کی عمر تک وہ یہی عمل ہر روز دہراتا ہے اور آخر کار دفتر

سے رخصت کر دیا جاتا ہے۔ اِس ملازم کا دفتر میں ملازمت اختیار کرنا اور دفتر سے ریٹائر ہونے تک کا سارا کاروبار سیسیفس کے عمل سے مختلف نہیں۔ یہی حال منڈیوں یا بارونق بازاروں میں بیٹھنے والے دوکانداروں کا ہے۔ تمام زندگی صبح سے لے کر شام تک بین دین کے چکر میں پھنسے رہتے ہیں اور انہیں اپنی تخلیقی قوتوں کا احساس تک نہیں ہوتا۔ ان کے مقابلے میں سترھویں صدی کے مشہور عالم مفکر سپائینوزا (SPINOZA) کو لیجیے، پیشہ کے لحاظ سے وہ چشمہ سازی کا کام کرتا تھا مگر جونہی روزمرّہ کے اخراجات کے لیے رقم اکٹھی ہوتی سپائینوزا دوکان بڑھا کر اندر سے دروازہ بند کر کے رات گئے تک تخلیقی عمل میں مصروف رہتا۔ اُس کے لیے زندہ رہنا بذاتِ خود کوئی نصب العین نہیں تھا، وہ تو ایک 'جہانِ نو' کی تخلیق کے لیے اپنی فکری صلاحیتوں کو وقف کیے ہوئے تھا۔ انفعالی اور فعالی ہیجانات ... (PASSIVE AND ACTIVE EMOTIONS) کا تصوّر اور 'ہمہ اوست' کا فلسفہ جس نے اس کی کارگاہِ فکر میں جنم لیا۔ تاریخ نے انسانی شعور میں ان تصوّرات کو ہمیشہ کے لیے محفوظ کر دیا۔ سپائینوزا کی زندگی "خویش را دیدن بنورے خویشتن" کی ایک منہ بولتی تصویر ہے۔

نورِ خویشتن کا مفہوم ایک جہانِ معنی اپنے اندر سموئے ہوئے ہے۔ اس میں تاریخی، سماجی اور نفسیاتی عوامل شامل ہیں۔ میری ذات کی تکمیل میں لاکھوں برس کا تاریخی عمل شامل ہے۔ انسان اوّل سے میرا رشتہ قائم ہے۔ مَیں تاریخ کے انسان کا امین ہوں، نفسِ واحدہ کا پرتو ہوں۔ رُومیؔ پنجاب بلّھے شاہ نے انہی پیچیدگیوں کی بنا پر یہ کہا تھا 'بلّھیا! کی جاناں مَیں کون' مَیں ایک سماجی حقیقت بھی ہوں۔ معاشرے کے رسم و رواج، اوامر و نواہی، تہذیبی پابندیوں زبان اور ثقافت، مذہب اور اخلاق کی زنجیروں میں جکڑا ہوا فرد، یہ سب باتیں تخلیقی عمل کے لیے رکاوٹیں بھی ہیں اور سہارا بھی۔ ان سب کی نفی سے مَیں انسانِ اوّل کا ہمعصر تو بنتا ہوں مگر لاکھوں برس کے انسانی حاصلات سے

اپنے آپ کو محروم بھی کرتا ہوں۔ میں ایک نفسیاتی قوّت بھی ہوں، شعور و لاشعور کا مرکّب، اس میں ذاتی لاشعور کے علاوہ نسلی لاشعور بھی شامل ہے۔ میری شخصیّت کا شعوری پہلو لامکانیّت کا مظہر ہے، شعور مکاں سے ماوراء ہے۔ ذہنی کیفیات مکانی نہیں ہوتیں صرف زمانی ہوتی ہیں۔ مکانی تعقّلات اُن پر چسپاں نہیں ہوتے میری شخصیّت کوئی شئے نہیں جیسے میز یا کرسی۔ یہ قصّہ ٔ ماضی بھی نہیں۔ مَیں تو اپنے وجود کی ممکنات ہوں۔ میری تخلیقی قوّتوں اور وجودی ممکنات کا اندازہ نہیں کیا جاسکتا۔ 'کوئی اندازہ کرسکتا ہے اُس کے زورِ بازو کا' والا معاملہ ہے۔ مجھے اپنے آپ کو ماضی کی بجائے مستقبل کے حوالے سے دیکھنا ہے۔ مستقبل میں قدم رکھتے ہوئے ایک جہانِ نو کو جنم دے سکتا ہوں۔ اور اپنی شخصیّت کو نیا رنگ بخش سکتا ہوں۔ اپنے آپ کو اپنے نور میں دیکھنے سے اِس بات کی تصدیق مطلوب ہے کہ میری حقیقت جو ایک تخلیقی امر ہے (امرِ ربّی) اس میں کہیں جمود تو طاری نہیں کیا میں رسم و رواج یا مروّجہ قدروں میں پھنس کر تو نہیں رہ گیا۔ کیا دام و دد کی سطح پر تو نہیں گر گیا۔ یہ دراصل معیار کی ایک اعلیٰ سطح سے اپنے اعمال کا جائزہ لینا ہے۔ کسی ایک صورتِ حال کو اپنے وجود کی ممکنات کی حدِّ آخر تصوّر کرنے کی نفی کرنا ہے۔ "تیرے سامنے آسماں اور بھی ہیں" کی عملی تصویر بننا ہے۔ خود آگاہی کی منزل مستقل ریاضت کی مرہُونِ منّت ہے۔ آزمائش کی یہ پہلی سطح ہے اور اس پر اگر آپ پورے اتریں تو دوسری سطح کا مرحلہ آتا ہے۔

دوسری سطح 'دیدنِ خود را بنورِ دیگرے' کی سطح ہے۔ یہاں سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ دیگرے کا مفہوم کسی ایک فرد پر دلالت کرتا ہے یا کسی ایک معاشرہ کی طرف اشارہ کرتا ہے۔ فرد یا معاشرہ جو کچھ بھی ہو اُس کا چناؤ کیسے کیا جائے۔ اکبر اِلٰہ آبادی کو چند بیبیاں بے پردہ نظر آئی تھیں اور وہ اس بات سے زمین میں غیرتِ قومی کی وجہ سے گڑ گیا تھا۔ اِس کے برعکس مس فلورنس نائٹ انگیل نے نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنے کے لیے اپنی خدمات حکومت کے سپرد کیں تو وکٹورین

سوسائٹی اس کے اس فیصلے سے ہل گئی تھی۔ اخبارات میں اس کے خلاف اداریتی نوٹ لکھے گئے۔ جلسے منعقد کئے گئے جن میں خواتین کے لیے نرسنگ کا پیشہ اختیار کرنے کے خلاف قرار دادیں منظور کی گئیں اور بعض اصحاب نے یہاں تک کہا کہ اگر مس فلورنس نائٹ انگیل اپنے کسی مرد دوست کے ساتھ بھاگ جاتی یا اپنے والد کی تمام کمائی گھوڑ دوڑ پر شرط بد کر ہار دیتی تو یہ باتیں اتنی زیادہ قابلِ مواخذہ نہ تھیں جتنا کہ اُس کا یہ فیصلہ کہ وہ جنگ کریمیا میں زخمیوں کی دیکھ بھال کے لیے نرس بن کر سقوطری جائے۔ اِن باتوں کے علاوہ ایک اور دقت جو معاشرہ کے انتخاب کے سلسلے میں پیش آتی ہے وہ یہ ہے کہ اگر کسی معاشرہ میں طبقاتی حد بندیاں ہوں تو کس طبقے کے نور سے اپنے آپ کو دیکھنا ہے۔ علامہ نے فرمایا تھا ؎

خواب سے بیدار ہوتا ہے ذرا محکوم اگر
پھر سُلا دیتی ہے اُس کو حکمراں کی ساحری

محکوم کے لیے "نورے دیگرے" حکمران طبقہ کے طور طریقے سے عبارت ہے۔ سرمایہ دارانہ نظام میں ہیں تلخ بہت بندۂ مزدور کے اوقات، کا شعور سرمایہ دار کو نہیں ہوتا۔ جاوید نامہ میں ابوجہل کی رُوح حرم کعبہ میں نوحہ کرتی ہوئی پیش کی گئی ہے۔ محمد عربیؐ نے جو اقدار اپنے معاشرہ میں ترویج دیں اُن پر ابوجہل آہ و فغاں کرتا ہے۔ ابوجہل اپنے آپ کو اپنے معاشرہ کی مروّجہ اقدار کے حوالے سے دیکھتا ہے اور اُسے رسولِ عربیؐ کی تعلیمات، لات و منات کو پاش پاش کرتی ہوئی معلوم ہوتی ہیں۔ اس لیے وہ "انتقام از وے بگیر اے کائنات" کا ورد کرتا ہے۔ آج کی دنیا میں سماجی ماحول کا تعیّن صرف قربتِ مکانی سے نہیں کیا جاسکتا اس دَور کا انسان عالمی ماحول میں بسنے والا انسان ہے۔ وہ کنبہ، مدرسہ، ادارہ اور حکومت کی تنگ حدود سے نکل کر عالمی برادری میں قدم رکھتا ہے اور وہ پوچھتا ہے کہ "نورے دیگرے" کے لیے اسے تیسری دنیا کے سر بکفن لڑتے ہوئے عوام کے شعور سے اپنے آپ کو دیکھنا ہے یا سیکورٹی کونسل کے فیصلوں کی روشنی میں

اپنے آپ کو پرکھنا ہے۔ فلسطینی حریت پسندوں کے کارناموں کو اسرائیلی کس نظر سے دیکھتے ہیں اور اہل پاکستان کس نظر سے؟ جاگیرداری نظام میں جاگیردار کھیتوں میں کام کرنے والے کسانوں اور مزدوروں کو ایک ایسے "نورے دیگرے" سے دیکھتا ہے جو اس کے جاگیرداری طریقے کو دوام بخشنے کی ضمانت دیتا ہے۔ غرضیکہ فرد معاشرہ میں رہ کر ایک خاص قسم کی اقدار کی روشنی میں، ایسی اقدار جنھیں ہم مروّجہ اقدار (OPERATIVE VALUS) کہتے ہیں، ان اقدار کی روشنی میں اپنے کردار پر نظر رکھتا ہے اور چونکہ ماحول کا اثر فرد پر مضبوط گرفت رکھتا ہے اس لیے اکثر و بیشتر افراد ماحول کی کجی اور ناہمواری زیر بحث نہیں لاتے اور اپنی زندگی کی معراج ماحول سے مطابقت رکھنے میں مضمر سمجھتے ہیں۔ ایسے لوگوں کو ہم شریف لوگ کہتے ہیں۔ یہ لوگ انتظامیہ کے لیے کوئی مسئلہ کھڑا نہیں کرتے، یہ تخلیقی عمل سے یکسر عاری ہوتے ہیں اور رسم و رواج کے بندھنوں کو حرفِ آخر سمجھتے ہیں۔ ان لوگوں کے سینوں میں آرزو کی شمع فروزاں نہیں ہوتی اور کسی قسم کا خطرہ مول لینے کے لیے ہرگز تیار نہیں ہوتے۔ معاشرے کے اپنائے ہوئے اُصولوں کی پاسداری میں ایسے لوگ مگن رہتے ہیں۔

بعض فلاسفہ موضوعی طور پہ درست اور معروضی طور پہ درست افعال میں تمیز کرتے ہیں موضوعی درست ہر وہ فعل ہے جس پر عمل پیرا ہونے سے پہلے فرد "نورے خویشتن" اور "نورے دیگرے" کی روشنی میں اس فعل کی صحت پر صاد کرتا ہے۔ اس "نورے خویشتن" اور "نورے دیگرے" میں زمان و مکان اور تعلیم و استعداد کی تحدیدات اثر انداز ہوتی ہیں اور یہ عین ممکن ہے کہ جو فعل سقراط کے لیے موضوعی طور پہ درست تھا وہ بعد میں آنے والے لوگوں کے لیے درست نہ ہو یعنی معروضی طور پہ درست نہ ہو۔ معروضی طور پہ درست فعل وہ فعل ہے جس کے نتائج اس فعل کی صحت پہ صاد کرتے ہیں۔ اس لحاظ سے دیکھا جائے تو ہر وہ فعل جو موضوعی طور پہ فرد کے لیے درست ہے وہ موضوعی طور پہ درست ہونے کا دعویٰ بھی رکھتا ہے مگر

اس فعل کے نتائج ہی اس بات کی تصدیق کریں گے کہ وہ فعل معروضی طور پر درست ہے یا نہیں۔ مگر وہ افعال جو "نورِ خویشتن" اور "نورِ دیگرے" کی روشنی میں طے نہیں کیے جاتے نیکی سے متصف تصور نہیں کیے جا سکتے۔ اس ساری بحث کا حاصل یہ ہے کہ 'نورے خویشتن' اور 'نورِ دیگرے' سے تصدیق و توثیق اس بات کی ضمانت نہیں کہ شخصیت یا خودی اپنی معراج تک پہنچ چکی ہے۔ زمانے کی آنکھ پر اپنے تصورات کو منعکس کرنا اور زمانے سے ٹکراؤ کی صورت میں اپنا لوہا منوانا سب سے کٹھن مرحلہ ہے اور یہ مرحلہ شعوری زندگی کی تیسری اور آخری سطح پر ہی ممکن ہے اس عمل کو اقبال نے "دیدنِ خود را بنورے ذاتِ حق" سے تعبیر کیا ہے۔ اس سطح کے بارے میں گفتگو کرنے سے پہلے ایک بات کی طرف اشارہ کرنا ضروری سمجھتا ہوں اور وہ "نورے دیگرے" ہی سے متعلق ہے۔ فرانسیسی مفکر سارت کے نزدیک دوسرے افراد کا وجود فرد کے لیے جہنم کا سماں پیدا کرتا ہے۔ فرد کی دُنیائے معانی کو زیر و زبر کرتا ہے، فرد کی آزادی میں خلل اور رکاوٹ پیدا کرتا ہے۔ اُسے ایک شعوری قوت سے شیئیت میں تبدیل کرتا ہے۔ اس کے برعکس علامہ کے نزدیک دوسروں کا وجود شخصیت کی تعمیر و پختگی، بلندی و عظمت کی ضمانت مہیا کرتا ہے، فرد کو جہانِ نو کی تخلیق کے لیے تیار کرتا ہے۔ اجتماعی زندگی کے لیے اعلیٰ اقدار فراہم کرنے کا پیش خیمہ بنتا ہے۔ فرد کو جہانِ رنگ و بُو کی تحدیدات کا احساس دلاتا ہے اور نیا زمانہ اور نئے صبح و شام پیدا کرنے کی دعوت دیتا ہے اور اُس کے انتخاب کی درستگی اور صحت پہ مہرِ تصدیق ثبت کرتا ہے۔ فرد کسی سماجی خلد میں جنم نہیں لیتا جو دوسرے افراد سے یوں فرار ڈھونڈے جیسے پانی سے سگ گزیدہ۔ سماج میں رہ کر ہی سماج کی اصلاح ممکن ہو سکتی ہے۔

آزمائش کی تیسری سطح کو اقبال نے 'دیدنِ خود را بنورے ذاتِ حق' سے تعبیر کیا ہے۔ یہ امتحان کی سخت ترین منزل ہے اور شعور کی اس سطح تک رسائی پانا زندگی کی عمیق ترین گہرائیوں میں اترنا ہے۔ علامہ کے نزدیک بہت

مضبوط شخصیتیں ہی اس تجربہ و مشاہدہ کی حامل ہوتی ہیں۔ ریاضت کی یہ گذرگاہ خاصی کٹھن ہے۔ سپائینوزا نے سچ کہا تھا کہ "اگر مکتی اتنی آسان ہوتی اور اس کا پانا بغیر کسی ریاضت کے ممکن ہوتا تو پھر یہ کیسے ممکن تھا کہ اکثر لوگ اس سے بے اعتنائی برتتے۔ تمام اعلیٰ اشیاء کا حصول اتنا ہی مشکل ہے جس قدر کہ وہ نایاب ہیں"
'دیدنِ خود را بنورِ ذاتِ حق' کو اقبال نے زبورِ عجم میں 'اندر خود سفر کردن' یعنی اپنے من میں ڈوبنے کے عمل سے تعبیر کیا ہے۔ اور "زبورِ عجم" ہی میں ایک مقام پر فرماتے ہیں :۔ ؎

خوشا کسے کہ حرم را درونِ سینہ شناخت   دمے تپید و گذشت از مقامِ گفت و شنود

خوش نصیب ہے وہ شخص جس نے اپنے سینہ میں پوشیدہ حرم کو پہچان لیا۔ کچھ عرصہ کے لیے سوز و گذاز میں مبتلا رہا مگر بحث و تکرار کے مقام سے گزر گیا اور پھر "زبورِ عجم" میں ایک دوسری جگہ کہتے ہیں۔

چراغے در میانِ سینۂ تست   چہ نور است ایں کہ در آئینۂ تست
مشو غافل کہ تو او را امینی   چہ نادانی کہ سوئے خود نہ بینی

"تیرے سینہ میں ایک چراغ ہے، یہ کیسا نور ہے جو تیرے آئینے میں موجود ہے۔ تجھے غافل نہیں ہونا چاہیے کہ تو اس نور کا امین ہے۔ یہ کیا حماقت ہے کہ تو اپنی طرف نہیں دیکھتا"

میر تقی میر نے بھی اسی حقیقت کی طرف توجہ دلائی تھی جب اُس نے کہا تھا ؎

پہنچا جو آپ کو تو میں پہنچا خدا کے تئیں   معلوم اب ہوا کہ بہت میں بھی دور تھا

اس مقام تک رسائی حاصل کرنے کے لیے معاشرہ میں شرکت اور معاشرہ سے کنارہ کشی، جلوت پذیری اور خلوت نشینی دونوں ضروری ہیں۔ خدا کی ذات تمام اقدار اور تخلیق کا منبع ہے۔ مشاہدۂ حق سے اس امر کی تصدیق ہوتی ہے کہ کہاں تک آپ نے صفاتِ باری تعالیٰ اپنائی ہیں۔ یہ امر شعور میں ایک عظیم انقلاب برپا کرتا ہے اور جہانِ نو کی تخلیق پر منتج ہوتا ہے اور فرد نفسِ امّارہ اور نفسِ لوّامہ کی منزلوں سے گزر

کر نفسِ مطمئنہ کے مقام پہ فائز ہوتا ہے، اس سے فردِ مصدّقہ یا مردِ بزرگ کی تخلیق ہوتی ہے۔ تکمیلِ خودی کی اس امر سے ضمانت ملتی ہے۔ بے جان اور مردہ قدریں نئی اور فعال قدروں میں تبدیل ہوتی ہیں اور معاشرہ میں ایک عظیم انقلاب پیدا ہوتا ہے۔ حکیم دیوجانس کلبی کسی ایسے ہی فرد کی تلاش میں دن کی روشنی میں چراغ لے کر اپنی بستی میں گھوم رہا تھا۔ تخلیقی عمل سے محروم لوگ اس کے نزدیک حیوانوں کی سطح پہ زندگی بسر کر رہے تھے۔

خدا کی صفات یا اقدارِ حقیقی کو اپنانا ایک تخلیقی عمل ہے۔ آپ کی اقدار یا آپ کے اصول، آپ کے اعمال سے واضح ہوں گے۔ برطانوی فلسفی ہیر (HARE) نے درست کہا ہے کہ اعمال الفاظ سے زیادہ بلند آواز میں آپ کے اصولوں اور آپ کی اقدار کو بیان کرتے ہیں۔ اگر آپ کے قول و فعل میں تفاوت ہے تو آپ اپنی قدروں اور زندگی کے اصولوں سے وابستگی نہیں رکھتے۔ آپ اپنے مقام سے دُور ہیں اور اجنبیّت کا شکار ہیں۔ اس صورت میں آپ ایک بہت بڑے سماجی کمپلکس میں ایک فالتو پرزہ سے زیادہ نہیں۔ کمالِ زندگی دیدارِ ذات میں مضمر ہے اور اس ضمن میں علّامہ فرماتے ہیں :-

چناں با ذاتِ حق خلوت گزینی ترا اُو بیند و اُو را تو بینی
منوّر شو ز نُورِ مَن یَّرَانِی مژہ برہم مزن تو خُود نہ مانی
بخود محکم گُذر اندر حُضُورش مشو ناپید اندر بحرِ نُورش

(ذاتِ حق کے ساتھ اس طرح خلوت نشیں ہو کہ تجھے وہ دیکھے اور تو اسے دیکھے۔ جو کچھ تو دیکھے اُس کے نور سے منوّر ہو جا، آنکھ نہیں جھپکنا ورنہ تم نہیں رہو گے یعنی مٹ جاؤ گے۔ اُس کے حُضور مضبوطی اور خود اعتمادی سے رہ اور اُس کے نُور کے سمندر میں ناپید نہ ہو جا۔)

خدائی صفات پیدا کرنا در اصل شعور میں ایک عظیم انقلاب لانا ہے۔ ذکر کی یہ ایک ایسی کیفیّت کو دوام بخشتا ہے جہاں "تُرا اُو بیند و اُو را تو بینی" ایک علیق تخلیقی

(بقیہ صفحہ ۷۲ پر)

ہر فرد ہے ملّت کے مقدّر کا ستارہ

جناب خالد لیم اسحاق صاحب۔ کراچی

گرد و نواح میں نظر دوڑائیے، آپ دیکھیں گے کہ ہر شخص شاکی نظر آتا ہے۔ باپ بیٹے سے شاکی کہ وہ ناخلف ہے کیونکہ وہ ملّی و خاندانی روایات کو مٹا رہا ہے اور اس فعل سے باز نہیں آتا۔ بیٹا باپ سے شاکی کہ وہ اُس کی بات نہیں سمجھتا۔ زمانے کے تقاضوں کو نہیں سمجھتا اور جس طرزِ عمل کی باپ توقع رکھتا ہے وہ فی زمانہ ناممکن ہے۔ مزدور کارخانہ دار سے شاکی کہ کم اُجرت پر ہمارا استحصال کرتا ہے۔ کارخانہ دار اس امر پر شاکی کہ مزدور بغیر کام کئے اُجرت چاہتا ہے اور اُجرت کے مطابق کام نہیں کرتا۔ زمیندار کاشتکار سے شاکی کاشتکار زمیندار سے۔ گاہک دوکاندار سے کہ مہنگا بیچتا ہے اور ملاوٹ کرتا ہے۔ یا کم تولتا یا ماپتا ہے۔ دوکاندار گاہک سے کہ وہ صرف سستا مال چاہتا ہے چاہے کتنا ناقص ہی کیوں نہ ہو۔

عوام حکّام سے شاکی ہیں اور حُکّام عوام سے۔ عام آدمی کی شکایت ہے کہ حاکم نشۂ اقتدار میں چُور ہیں، انھیں نہ افراد کے حقوق کا پاس ہے اور نہ ان کی عزّت کا، اور بہر نوع انہیں انصاف نہیں ملتا۔ حاکموں کی شکایت یہ ہے کہ قوم وہ تقاضے کرتی ہے جو پورے نہیں ہو سکتے اور افراد کو حکومت کی بے انصافیوں کی شکایت زیب نہیں دیتی۔ کیونکہ افراد خود ایک دوسرے

کے ساتھ انصاف نہیں کرتے اور اپنی دھاندلیوں اور بے ایمانیوں سے حکومت کی نیک نیت کوششوں کو ناکام بنا دیتے ہیں۔

غرضیکہ شکایات کا یہ سلسلہ نامتناہی ہے اور آپ ہم سبھی بحیثیت مجموعی اس امر کے شاکی ہیں کہ ہمارے درمیان نہ ایک دوسرے کی عزت محفوظ ہے نہ مال اور نہ جان۔ ایک کیفیتِ بے اطمینانی ہے جو سب کو گھیرے میں لیے ہوئے ہے۔ ہماری بداعمالیوں نے ہماری گردنوں میں انسانوں کی غلامی کے طوق ڈال رکھے ہیں، ہماری زبانیں گنگ ہیں۔ ہمارے ہاتھوں ہر روز اسلامی اقدار کی غارت گری ہوتی ہے اور ہم نہ اُن کا سدِ باب کرتے ہیں اور نہ اُن کے خلاف احتجاج۔ چاہے یہ فساد ہماری اپنی بداعمالیوں کی وجہ سے ہو یا یہ غلط رسومات کی وجہ سے یا حاکموں کی بے انصافی و استبداد سے!!!

ہمارے درمیان شکایت زیادہ ہے شکر کم۔ کھوٹ اور ملاوٹ زیادہ ہے، انصاف و عدالت کم۔ بے راہ روی زیادہ ہے عفت کم شک زیادہ ہے حسنِ ظن کم۔ بے اعتباری زیادہ ہے اعتبار کم ——— اگر اہلِ عالم اسلام کی تعلیمات کے فوائد کا اندازہ ہمارے طرزِ عمل کو دیکھ کر لگانا چاہیں تو ہماری گردنیں شرم سے جھک جائیں گی اور ہم بانگِ بلند کہیں گے کہ ہمارے کردار سے اسلام کا اندازہ نہ لگاؤ۔

حقیقت یہ ہے کہ باوجود ہمارے محبتِ اسلام کے دعوے کے ہمارے اعمال بحیثیتِ مجموعی کچھ ایسے گر گئے ہیں کہ اکثر افراد اپنے ضمیر کی آواز کو یہ کہہ کر سُلا دیتے ہیں کہ ایک غیر اسلامی بے اخلاق اور دُنیا دار معاشرے میں اسلامی اقدار کا نفاذ غیر ممکن ہے۔ کوئی اسلامی معاشرہ قائم کرے تو ہم بھی اسلامی چلن میں اس کے شریک ہو جائیں گے۔

واقعہ یہ ہے کہ نہ مسئلہ نیا ہے اور نہ راہِ گریز نئی۔ تمام انبیاء کی بعثت

کا مقصد ہی یہ ہے کہ غیر اسلامی معاشرے میں کیسے ایک اسلامی انقلاب لایا جائے۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی صفتِ خاص یہ ہے کہ انہوں نے ہمارے معاشرے سے بھی بدتر معاشرے میں انقلاب لاکر یہ ثابت کر دیا کہ یہ تبدیلی ممکن ہے۔ رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کا چلن اور اُن کی سُنّت ہم پر حُجّت ہے۔

مقاصدِ بعثت کے متعلّق فرمانِ الٰہی ہے :

"وہ انہیں نیکی کا حکم دیتا ہے، بدی سے روکتا ہے، اُن کے لیے پاک چیزیں حلال کرتا ہے اور ناپاک چیزیں حرام کرتا ہے اور اُن پر سے وہ بوجھ اتارتا ہے جو اُن پر لدے ہوئے تھے اور وہ طوق جو ان پر تھے۔" (۷ - ۱۵۷)

بعثت کے تیئیس[۲۳] سالہ دَور میں ہم ختمی مرتبت صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کو مختلف قسم کے حالات میں دیکھتے ہیں۔ شدید عُسرت کے حالات میں جب نہ دولت تھی اور نہ قوّت۔ غیر تو غیر، عزیز و اقربا بھی سوائے ظلم ڈھانے کے اور کچھ نہ کرتے تھے۔ آزادانہ چلنا پھرنا، تبلیغ کرنا، کام کرنا ناممکن ہو گیا تھا۔ شعبِ ابی طالب میں تین سالہ زمانۂ عُسرت کا شدید ترین دَور تھا۔ اس دَور کا حاصل بمشکل تین سَو ساتھی ہیں جن میں معدودے چند صاحبِ عزّت و ثروت لوگ تھے۔ باقی تمام وہ لوگ جنھیں آج کل کی زبان میں عوام کہا جاتا ہے، سوسائٹی کے چھوٹے لوگ۔ لیکن کچھ عرصہ بعد ہی ہم رسالت مآب صلی اللہ علیہ وسلّم کو تمام جزیرہ نمائے عرب کے محبوب ترین اور واحد فرمانروا کی حیثیت میں دیکھتے ہیں۔ اس دور میں بھی انصاف ہے تو رحم بھی اس کے ساتھ ہے، عفو ہے تو عنایت بھی دُور نہیں۔ وہی گذشتہ کل کے معمولی لوگ، مدینہ منوّرہ کی حکومتِ الٰہیہ کے درخشندہ ستارے نظر آتے ہیں۔ ان تمام ادوار میں ختمی مرتبت اور ان کے ساتھیوں کا عمل رہتی دنیا تک مثال ہے۔

رسولِ اکرمؐ کے بارے میں ارشادِ الٰہی ہے :-

"درحقیقت تم لوگوں کے لیے اللہ کے رسول میں ایک بہترین نمونہ ہے۔ ہر اُس شخص کے لیے جو اللہ اور یومِ آخر سے امید رکھتا ہے اور کثرت سے اللہ کو یاد کرتا ہے" (۳۳-۲۱)

رسولِ اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کے ساتھیوں کے متعلق فرمایا :-

"پہلے مہاجرین اور انصار میں سے سبقت لے جانے والے نیز وہ جنھوں نے اچھائی کے ساتھ ان کی پیروی کی۔ اللہ اُن سے راضی ہوا، اور وہ اللہ سے راضی ہوئے" (۹-۱۰۰)

پہلے مسلمانوں میں سے کچھ ایسے بھی تھے جو ہجرت سے پہلے انتقال کر گئے اور مہاجرین اوّلین میں سے اکثر نے زندگی کا ایک بیشتر سختیوں کا دور مکّہ کے اس معاشرے میں گذارا تھا جو "ظالمانہ، قہرمانہ اور خالص دنیادار" تھا اس کے باوجود وہ ایسی زندگی گذار گئے کہ اللہ ان سے راضی ہوا اور وہ اللہ سے۔ قرآن پاک میں اللہ تعالیٰ نے صاف صاف فرما دیا ہے۔

"اے ایمان والو اپنی فکر کرو۔ کسی دوسرے کی گمراہی تمھیں نقصان نہیں پہنچا سکتی جب تم ہدایت پہ ہو" (۵-۱۰۵)

ہر ایک کی جواب دہی اسی کے حالات اور قوّتوں کے مطابق ہو گی، نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم سے مروی ہے :-

"قیامت کے دن اللہ کے کسی عبد کا پیر نہیں پھسلے گا جب تک وہ چار چیزوں کے بارے میں جواب دے دے گا۔ ۱ یہ کہ اس نے اپنے جسم کو کیسے استعمال کیا ۲ اس کی زندگی اور اُس نے اُسے کن کاموں میں گذارا ۳ اُس کی دولت اُس نے کیسے کمائی اور خرچ کی ۴ اور اس کا علم اور اُس کو کیسے استعمال کیا"

اکثر مسلمان اپنی بہت سی ذمّہ داریوں سے یہ کہہ کر فرار اختیار کر لیتے

ہیں کہ کوئی اہم اور عظیم اسلامی کام تو ہو نہیں سکتا، اِن چھوٹی باتوں سے کیا ہوگا۔ اس سلسلہ میں بھی فرمانِ الٰہی صاف ہے کہ فوری نتائج کی فکر میں مت گھلو۔ اگر اللہ چاہتا تو ساری دنیا کے اختلافات مٹا کر اُن کو ایک اُمّت بنا دیتا اور کُفّار کی گردنیں جُھکا دیتا ——— لیکن اللہ نے بندوں کو آزادی کی نعمت عطا کی ہے اور آزادی کا یہ خاصّہ ہے کہ انسان اپنے لیے اگر اچھائی کا فیصلہ کر سکتا ہے تو برائی کا فیصلہ بھی کر سکتا ہے۔

ایک مسلمان تو ایمان لے آنے پر اللہ سے کیے ہوئے عہد کی وجہ سے بہت سی ذمّہ داریاں اپنے سر لے لیتا ہے۔ جو اسے بہر کیف عُسر ہو یا یُسر پوری کرنا ہیں چاہے کوئی اور اپنی ذمّہ داریاں پُوری کرے یا نہیں۔

اگر السّابقون الاوّلون کی فہرست پر نظر ڈالیں تو ہم دیکھتے ہیں کہ شروع دور کے مسلمانوں میں رُؤساءِ مکّہ تو کم اور عام لوگ زیادہ ہیں۔ حضرت بلال، حضرت سعد، حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہم ابتدائی دور میں کچھ ایسے بڑے لوگ نظر نہیں آتے۔ لیکن جب تعلیمِ نبویؐ ان میں سرایت کر جاتی ہے۔ رُوح و قلب مسلسل سختیاں جھیل کر، قربانیاں دیکر آدابِ بندگیٔ الٰہی میں پختہ ہو جاتے ہیں تو ان سے بھی وہی نور پھُوٹ نکلتا ہے جس کو نبی اکرم بنی نوع انسان تک پہنچانے پر مامور تھے۔ ان تمام حضرات نے مکّی دَور میں تربیّت پائی، جب نہ حکومت تھی نہ دولت، نہ غزوات تھے نہ فتوحات، نہ لمبے چوڑے کاروبار ——— اس سے معلوم ہوا کہ معاشرے کے ناسازگار ہونے سے اسلام کا کچھ نہیں بگڑتا، اس کی ضرورت کی شدّت بڑھ جاتی ہے۔ ایسی حالت میں اہلِ اسلام کی ذمّہ داری بڑھ جاتی ہے۔ اگر بیمار زیادہ ہو جائیں اور بیماری عام ہو تو طبیب اپنی دواؤں کو سمیٹ کر گوشہ نشیں نہیں ہو جاتا۔ یہی تو موقعے ہوتے ہیں اُس کے سرگرمِ عمل ہونے کے۔ سیاسی آزادیاں ہوں یا نہ ہوں، معاشی فراوانیاں حاصل ہوں

یا نہ ہوں بات صاف ہے بندے کو اپنے خالق سے کیے ہوئے عہد نامے کے پورا کرنے کی آزادی اس سے کوئی نہیں چھین سکتا۔ اس زمانہ میں وہی غیر اللہ کا غلام ہے جس نے کسی غیر اللہ کو معبود مان لیا اور بخوشی اپنی آزادی کو اس کے دروازے پر نذر کر دیا ـــــــ یہ معبود اس کی شہوانی خواہشات ہوں یا مال و دولت یا کوئی فرعون۔

رسول اللہ صلی اللہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے مشن کے آغاز کی سُورتیں المدثّر الہمزہ، الماعون، اللیل، البلد ہیں۔ ان میں گنہگاروں کی وہ جماعت جس کو سخت ترین الفاظ میں تنبیہ کی گئی ہے وہ لوگ ہیں جو معاشی بے انصافیوں میں ملوّث ہیں۔ لالچی امراء جو اللہ کے دیئے ہوئے مال سے بندوں پر خرچ نہیں کرتے اور وہ مغرور لوگ جن کے دل دُکھی اور ضرورت مند لوگوں کی طرف سے پتھر ہو چکے ہیں۔ وہی تو تھے جو کہتے تھے کہ اللہ خود کیوں نہیں نہیں دے دیتا۔

اِسلام کا اوّلین چیلنج مظلوموں، حاجت مندوں اور غریبوں کی طرف سے تھا۔ یہ نقشہ روزِ اوّل ہی طے ہو گیا تھا اور حقیقت یہ ہے کہ جب تک مسلمان اپنی اس ذمّہ داری کو پورا کرنے میں سرگرمِ عمل رہے، اُن کے گرد نُور کا ایک ہالہ رہا۔ وہ دنیا میں بھی اتنے ہی کامیاب رہے جیسا وہ آخرت میں رہیں گے۔ حقیقت یہ ہے کہ جو جذبہ قرونِ اُولیٰ کے جہاد میں کارفرما رہا وہ یہی تھا۔

سُورۃ النسّاء میں فرمانِ الٰہی ہے :۔

"آخر کیا وجہ ہے کہ تم اللہ کی راہ میں اور ان بے بس مردوں، عورتوں اور بچّوں کی خاطر جنگ نہیں کرتے۔ جو کہتے ہیں اے ہمارے رب ہم کو اس بستی سے نکال جس کے رہنے والے ظالم ہیں اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی ولی بنا اور اپنی طرف سے ہمارا کوئی مددگار بنا۔" (۴ : ۷۵)

اس آیتِ کریمہ کی روشنی میں ہی وہ گفتگو سمجھ میں آتی ہے جو ایرانی فوجوں کے سپہ سالار رستم اور حضرت مغیرہ کے درمیان ہوئی۔ جب رستم نے حضرت مغیرہ کو زمین، زر، لونڈی غلام اور تجارت سب کی پیش کش کی تو انہوں نے صاف کہہ دیا کہ ان میں سے وہ کسی چیز کے حاجت مند نہیں۔ رستم کی حیرت کی کوئی انتہا نہ رہی جب اس نے بقیہ جواب سُنا۔ حضرت مغیرہ نے فرمایا کہ ہماری لشکر کشی کی غرض و غایت صرف ایک ہے کہ "انسانوں کے غلاموں کو صرف اللہ کا غلام بنا دیں۔" (ابن کثیر حصّہ ۷ صفحہ نمبر ۳۹ - ۴۰)

نسل، علاقائیت، لسان و رنگ کی بنیادوں پر بٹی ہوئی دنیا کو نبی اکرمؐ نے ایک انوکھا تصورِ حیات دیا۔ اُس کے مطابق پُرانے اور مستعمل معیارِ برتری سب ردّ ہو گئے۔ بڑائی اور برتری کا معیار صرف تقوی بنا اور برتری کی یہ راہ سب پر کھُلی ہے۔ مرد ہو عورت ہو، باپ ہو بیٹا ہو، امیر ہو غریب ہو آزاد ہو غلام ہو، حاکم ہو محکوم ہو، اعمالِ صالحہ کا میدان کھُلا ہے۔ روزانہ زندگی میں عملِ صالح کے ہر لمحہ ہر لحظہ کئی مواقع آتے ہیں۔ اپنی حیثیت، اپنے مال و دولت، ذاتی محنت و تعلقات ہر پوزیشن میں انسان ایک مردِ صالح بن سکتا ہے۔ روحانی ترقّی کا راستہ قربانی ہے۔ عُسر میں قربانی کے مواقع کہیں زیادہ ہوتے ہیں۔ یہ راہ راہروؤں کے لیے آج بھی اتنی ہی کشادہ ہے جیسی قرونِ اُولیٰ میں تھی۔

اسلام لانے پر ہر فرد اللہ سے عہد کرتا ہے کہ اب سے میرا جینا مرنا، میری عبادت اور میرا مال و دولت سب تیرے لیے ہیں اور تیری ہی مقرر کردہ اقدار کے مطابق صرف ہوں گے۔ اِس صَرف کا راستہ خود اللہ نے مقرر کر دیا ہے۔ فرمانِ نبویؐ ہے: "یوم قیامت اللہ تعالیٰ کہے گا": اے ابنِ آدم! مَیں بیمار تھا اور تو نے میری خبر گیری نہ کی۔ وہ کہے گا یا رب مَیں تیری عیادت کیسے کرتا اور تُو تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میرا

فلاں بندہ بیمار ہے اور تونے اُس کی مدد نہیں کی کیا تُو یہ نہیں جانتا تھا کہ اگر تو اس کی خبر گیری کرتا تو تُو مجھے اس کے قریب پاتا۔

اے ابنِ آدم مَیں نے تجھ سے کھانے کا سوال کیا اور تونے مجھ کو نہیں کھلایا۔ بندہ جواب دے گا کہ اے رب العالمین میں تجھے کیسے کھلاتا اور تُو تو رب العالمین ہے۔ اللہ کہے گا کیا تو نہیں جانتا تھا کہ میرے فلاں بندے نے تجھ سے رزق کا سوال کیا اور تونے اُس کو نہیں کھلایا۔ کیا تو نہیں جانتا تھا کہ اگر تو اس کو کھلاتا تو آج اس عمل کو میرے پاس پاتا۔

اے ابنِ آدم میں نے تجھ سے پانی مانگا لیکن تونے مجھے پانی نہ دیا۔ وہ کہے گا اے رب العالمین! مَیں تجھ کو پانی کیسے دے سکتا تھا؟ اللہ جواب دے گا میرے فلاں بندے نے تجھ سے پانی مانگا اور تُونے اس کو نہیں دیا۔ کیا تجھے یہ نہیں معلوم تھا کہ اگر تو اس کو پانی دیتا تو آج اِس عمل کو میرے پاس پاتا" (مسلم)

حجۃ الوداع کے عظیم خُطبے میں اگر ایک بات نکھر کر سامنے آتی ہے تو وہ ہے فرد کی عظمت، اُس کی جان، آبرو اور مال کی حرمت۔ کچھ اسی طرف اشارہ ہے نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم کی اس بے مثال حدیث میں جو ابنِ ماجہ نے اِن الفاظ میں بیان کی ہے۔ ایک دفعہ خانۂ کعبہ کا طواف کرتے ہوئے گویا خانۂ کعبہ سے مخاطب ہو کر آپؐ نے فرمایا:

"کتنے اچھے ہو تم اور کتنی اچھی ہے تمھاری خوشبو۔ کتنے محترم ہو تم اور کتنی عظیم ہے تمھاری حرمت۔ لیکن قسم ہے اُس کی جس کے ہاتھ میں محمدؐ کی جان ہے ایک مومن کا رتبہ تم سے بھی اُونچا ہے۔ بہ نسبت اُس کی جان و مال کے اور یہ کہ نہ سوچیں ہم ایک مسلمان کے بارے میں مگر حُسنِ ظن کے ساتھ" (حدیث نمبر ۳۹۳۲)

ایک دوسرے سے گوناگوں تعلّقات میں ہم بارہا اس فرمانِ نبویؐ کو بھلا

دیتے ہیں۔ نہ ہم ایک دوسرے کی عزّت وآبرو اور حقوق کا خیال رکھتے ہیں نہ لین دین میں انصاف برتتے ہیں۔

ہم غلافِ کعبہ کو تو آنکھوں سے لگاتے ہیں، حرمین کے اماموں سے والہانہ عقیدت کا اظہار کرتے ہیں۔ لیکن بھول جاتے ہیں کہ ایک مسلمان کی جان ومال اور آبرو کی نگہبانی کو بہت عظیم مرتبہ حاصل ہے۔ اور جب حالات ناسازگار ہوں تو اس عمل کی اہمیّت اور بڑھ جاتی ہے۔

شعبِ ابی طالب میں مسلمانوں نے بے پناہ مصائب میں باہمی ہمدردی سے دُکھ، درد، خوراک، کپڑا بانٹ کر سب صعوبتیں بہادری اور سرخروئی کے ساتھ جھیلیں۔ نبی اکرم صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم نے مسلمانوں کی برادری کو ایک جسم سے تشبیہ دی ہے۔ فرمایا کہ جب آنکھ دُکھتی ہے تو ہر عضو تکلیف محسوس کرتا ہے۔ جب ایک مسلمان پر ظلم ہو تو ہر ایک کا فرض ہے کہ اس کی اعانت کرے۔ حقیقت یہ ہے کہ دنیا میں انصاف قائم ہی اُس وقت ہوتا ہے جب دیکھنے والا بھی ظالم کی چوٹ کو اس شدّت سے محسوس کرے جیسا مظلوم کرتا ہے۔ یہی جذبہ کارفرما تھا جب خلافت کی ذمّہ داریاں سنبھالتے وقت حضرت ابوبکرؓ نے فرمایا :" تم میں سے کمزور میری نگاہ میں سب سے طاقتور ہے جب تک مَیں اُس کو اُس کا حق نہ دلوادوں اور سب سے طاقتور میری نگاہ میں کمزور ترین ہے۔ جب تک مَیں اُس سے وہ کچھ نہ دھروالوں جو دوسرے کا حق ہے"۔ بالفاظِ دیگر اُمّت کی تفویض کردہ طاقت کا اوّلین استعمال مظلوم کو ظلم سے چھڑوانے کی خاطر ہونا چاہیئے۔

یہی جذبہ تھا جس نے حجّاج کو آمادہ کیا کہ اُن تین مظلوم عورتوں کی خاطر سندھ کی طرف لشکر کشی کرے۔ وہ عورتیں جن کو لنکا سے واپسی پر جیراً راجہ داہر کے سمندری ڈاکوؤں نے لوٹ لیا اور گرفتار کر لیا تھا ـــــ تین مظلوموں کی آہ نے سندھ کے علاقے کو تاقیامت اسلام کی برکتوں سے رُوشناس کرایا اور سندھ

کا نام "باب الاسلام" ٹھہرا۔ اور وہ صرف اِس لیے کہ علاقے کے گورنر نے دادرسی کی خاطر ہر چیز کو داؤ پر لگانے کا فیصلہ کر لیا۔

ایک مرتبہ نبی اکرم صلّی اللّٰہ علیہ وسلّم نے فرمایا :

"مَیں دیکھتا ہوں کہ ایک ایسا وقت آئے گا جب ایک عورت اپنی اُونٹنی پر اکیلی حضرموت سے مکّہ آئے گی اور اس راستہ میں وہ اپنے دل میں خدا کے خوف کے علاوہ کسی کا خوف نہیں پائے گی"

ختمی مرتبت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کے ساتھیوں نے یہ پیش گوئی سچ کر دکھائی کیونکہ وہ تمام قوّتیں جو انسان کو بغاوت پر آمادہ کرتی ہیں اب احکامِ الٰہی کے تابع کر دی گئیں۔ ہر ایک جانتا تھا کہ کوئی ظالم کی خوشامد نہیں کرے گا بلکہ مظلوم کی پاسبانی کے لیے ہر مسلمان اُٹھ کھڑا ہوگا۔ ہر ایک یہ یقین رکھتا تھا کہ پیش پا افتادہ مٹ جانے والی منفعتوں سے کہیں زیادہ اہم اور خوبصورت اور دائمی منفعتوں کی زندگی ابھی آنی ہے۔ جب ہر عمل کا بخوبی حساب ہوگا جب سب راز افشا ہو جائیں گے اور سب پردے چاک ہو جائیں گے۔ چلتی زبانیں گنگ ہو جائیں گی اور آدمی کے ہاتھ پاؤں اس پر گواہی دیں گے۔

ہم ذرا سوچیں کہ اس روز ہم رسولِ اکرم صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کو کیا مُنہ دکھائیں گے کہ ہم نے اُن کے اِس دعوے کی تکمیل کی خاطر کیا کیا؟ کیا یہ جواب کافی ہوگا کہ ہم نے اُن کی بہت تعریف کی اور کہا کہ وہ بنی نوعِ انسان کے لیے مینارِ نور ہیں۔ لیکن اس روشنی سے اپنے دلوں کے ظلمت کدوں کو کبھی روشن نہیں کیا۔ ہم نے یہ تو ہمیشہ کہا کہ اُن کی لائی ہوئی کتاب بہترین ضابطۂ حیات ہے لیکن اسے اپنی زندگیوں کا ضابطہ نہیں بنایا۔ کیا ہم نے ختمی مرتبت صلّی اللّٰہ علیہ و آلہٖ وسلّم کا یہ فرمان نہیں سُنا کہ :-

"تم میں جو بھی کوئی غلط کام ہوتا دیکھے وہ اس کو اپنے ہاتھ سے درست کر دے۔ اگر یہ نہیں کر سکتا تو زبانی احتجاج کرے اور اگر یہ بھی ممکن

نہ ہو تو کم سے کم اس فعل کو دل میں بُرا جانے اور اِس سے کم تر ایمان کا کوئی درجہ نہیں"

قرآن مجید ایک کتابِ عمل ہے نہ جادو منتر کی تھیلی ہم محبتِ رسول میں اکثر ایسی باتیں کر جاتے ہیں جن سے عام انسانوں کے ذہن قرآن کی تعلیمات سے دُور ہو جاتے ہیں۔ کچھ ایسی غلو کی باتیں کرتے ہیں گویا رسول انسانوں کے لیے مثال بن کر نہیں آئے تھے اور توحید پہ ایمان اور عمل کی کوئی ضرورت نہیں اور وہ قیامت کے دن خود ہی نام نہاد اُمّت کے لیے کوئی راہِ نجات نکال لیں گے۔ ہم اکثر بھول جاتے ہیں کہ اللہ تعالیٰ کا وعدہ صاف ہے :-

"آرزوئیں نہ تمھاری پُوری ہونی ہیں نہ اہلِ کتاب کی۔ جو کوئی بُرائی کرے گا اُس کا بدلہ پائے گا اور وہ اپنے لیے اللہ کے مقابل کوئی کارساز اور مددگار نہ پا سکے گا، اور جو نیکی کرے گا خواہ مرد ہو یا عورت اور وہ مومن بھی ہو تو یہی لوگ ہیں جو جنّت میں داخل ہوں گے اور اُن کی ذرا بھی حق تلفی نہ ہو گی" (۴، ۱۲۵، ۱۲۶)

آئیے دُعا کریں کہ اللہ ہمیں توفیق دے کہ ہماری تبلیغ ہمارے اعمال کی عکاسی کرے اور ہمارے اعمال ہماری تبلیغ کی ترجمانی کریں تاکہ ہم اس گناہِ کبیرہ سے بچ جائیں جس کے متعلق فرمانِ الٰہی ہے :-

"اے ایمان والو! تم وہ بات کیوں کہتے ہو جو کرتے نہیں۔ اللہ کے نزدیک یہ سخت بیزاری کی بات ہے کہ تم وہ کہو جو تم کرتے نہیں" (۶۱-۳)

قرآن مجید کی
معجزانہ تاثیر

ڈاکٹر ذوالفقار علی ملک صدر شعبہ عربی، جامعہ پنجاب

اہلِ عرب کو فصاحت و بلاغت کا ایک قدرتی مذاق حاصل تھا۔ مرد و عورت چھوٹے بڑے، غلام اور آقا سب ہی اس چاشنی سے آشنا تھے اور اپنی فصاحت و بلاغت کے مقابلے میں غیر عرب اقوام کو عجمی یعنی گونگا خیال کیا کرتے تھے۔ ان کے شاعر اور خطیب خاص طور پر ماہر فن اور قادر الکلام ہوتے تھے۔ ایک دوسرے کے مقابلے میں اس زور و شور سے قصیدے لکھتے کہ اُس کی مثال کسی دوسری قوم کی ادبی تاریخ میں نہیں ملتی۔ ان کو اپنی شیریں بیانی اور سلاست پر بڑا ناز تھا۔ لوگ ان کی بڑی عزت کیا کرتے تھے۔ اور فصاحت و بلاغت اور قادر الکلامی کی بنا پر انہیں ساحر اور فرشتوں اور شیطانوں کا دوست سمجھا جاتا تھا۔

لیکن جب قرآنِ پاک نازل ہوا تو اُس کے اسلوب بیان کو دیکھ کر سب فصحاء و بلغاءِ عرب حیران ہو گئے۔ کیونکہ الفاظ کی بندش، تراکیب کی نزاکت، کلمات کی لطافت اور اُسلوب کی فصاحت و بلاغت میں قرآن ان شعراء و بلغاء کے کلام سے کہیں بلند ہے۔ باوجود اس بات کے کہ قرآن مجید نے کفار و مشرکین کو بار بار چیلنج دیا کہ قرآن مجید کی سی ایک سورت بنا لائیں مگر کسی کو مقابلے کی ہمت نہ ہوئی۔ ایک دفعہ کسی صحابی نے شعراءِ عرب کو قرآنی بلاغت سے آشنا کرنے کے لیے سورۃ الکوثر لکھ کر دیوارِ کعبہ پر لٹکا دی۔ شعراء نہایت غور سے

پڑھتے تھے مگر دم نہیں مار سکتے تھے۔ آخر ایک بڑے شاعر نے یہ ایک جملہ لکھ دیا واللہ ما ھٰذا کلام البشر (بخدا یہ انسان کا کلام نہیں ہے)۔ سکاکی جو فنِ معانی و بیان کا مسلّم الثبوت امام تھا کہتا ہے کہ قرآن کا اعجاز ایک ذوقی و وجدانی کیفیت ہے جو طبیعت کو محسوس ہوتی ہے لیکن زبان سے بیان نہیں کی جاسکتی۔

قرآن مجید کی ان معجزانہ خوبیوں میں سے ایک اس کی بے پناہ تاثیر ہے جس کا اعتراف اعدائے اسلام تک نے کیا ہے۔ عشق و محبت کے ایسے ایسے پیکر ہوئے جنھوں نے قرآنِ پاک کی صرف ایک ایک آیت سے متاثر ہوکر اپنا سرمایۂ حیات قربان کردیا۔ قرآنِ پاک کی اس جاذبانہ قوتِ تاثیر اور مؤثر طرزِ بیان کے بارے میں چند تاریخی شواہد پیشِ خدمت ہیں :-

طفیل بن عمرو دوسی ایک مشہور شاعر تھا۔ جب مکّہ آیا تو کفّارِ مکّہ نے اُس سے کہا کہ تم محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم کا کلام (قرآن مجید) ہرگز نہ سننا۔ کیونکہ اُس کا کلام جادو کا اثر رکھتا ہے، کہیں تم پر بھی یہ جادو نہ چل جائے۔ طفیل بن عمرو دوسی کہتے ہیں کہ مجھے کفّارِ قریش نے اتنا مجبور کیا کہ مَیں اس بات پر راضی ہوگیا کہ نہ آنحضرتؐ سے بات کروں گا اور نہ قرآن سُنوں گا۔ علی الصّبح جب مَیں خانہ کعبہ کے پاس سے گزرنے لگا تو مَیں نے اپنے کانوں میں کپڑا ٹھونس لیا کہیں میرے کان میں قرآن کے الفاظ نہ پڑجائیں۔ آنحضرتؐ اُس وقت نماز ادا فرما رہے تھے۔ مَیں وہاں تھوڑی دیر کے لیے ٹھہر گیا اور مَیں نے سوچا کہ مَیں ایک عظیم شاعر ہوں اور سحر اور فصاحت میں امتیاز کرسکتا ہوں۔ مجھے محمّد صلّی اللہ علیہ وسلّم سے نہیں ڈرنا چاہیئے، اگر اُن کا کلام اچھّا ہوگا تو اُس کو قبول کرلوں گا اور اگر معاذاللہ خراب ہوا تو اُسے ترک کردوں گا۔ جب مَیں نے کانوں سے کپڑا نکالا اور اُن آیات کو سُنا جو آپؐ تلاوت فرما رہے تھے تو مجھ پر اتنا اثر ہوا کہ فوراً دربارِ نبوّت میں حاضر ہوا اور عرض کی واللہ ما سمعت قولاً احسن منہ

(بخدا میں نے اس سے بہتر کلام کبھی نہیں سُنا) چنانچہ میں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

صحیح بخاری میں روایت ہے کہ حضرت جبیر بن مطعم جب جنگِ بدر میں گرفتار ہو کر آئے تو انہوں نے آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کو یہ آیتیں تلاوت فرماتے ہوئے پایا :-

اَمْ خُلِقُوْا مِنْ غَيْرِ شَيْءٍ اَمْ هُمُ	کیا وہ (کفار) خود بخود معرضِ وجود
الْخٰلِقُوْنَ ۝ اَمْ خَلَقُوا السَّمٰوٰتِ	میں آگئے ہیں یا وہ خود خالق ہیں یا
وَالْاَرْضَ بَلْ لَّا يُوْقِنُوْنَ ۝	انہوں نے آسمانوں اور زمینوں
اَمْ عِنْدَهُمْ خَزَآئِنُ رَبِّكَ اَمْ	کی تخلیق کی ہے نہیں وہ یقین نہیں
هُمُ الْمُصَيْطِرُوْنَ ۝	کرتے۔ کیا اُن کے پاس تیرے رب

کے خزانے ہیں یا اُن کو لوگوں پر داروغہ لگایا گیا ہے (۳۵ تا ۳۷۔ الطور)

حضرت جبیرؓ فرماتے ہیں کہ یہ آیات سنتے ہی میرے دل پر اتنا گہرا اثر ہوا کہ میں نے فوراً اسلام قبول کر لیا۔

ابو نعیم اور بیہقی نے حضرت عبداللہ بن عباس سے روایت کی ہے کہ نضر بن حارث نے قریش کی اسلام دشمنی کو دیکھ کر اُن سے کہا : اے قریش جب محمد صلی اللہ علیہ وسلم کم عمر تھے تو تم سب سے بہتر تھے اور تم سب سے زیادہ راست گو اور امین تھے۔ اب جب اُن کے بال سفید ہو گئے ہیں اور وہ تمھیں اپنے دین کی طرف دعوت دیتے ہیں تو تم اُن کو ساحر کہتے ہو۔ بخدا وہ ساحر نہیں ہم نے ساحروں کا منتر اور اُن کے گنڈوں کو دیکھا ہے۔ تم کہتے ہو کہ وہ شاعر ہیں واللہ وہ شاعر بھی نہیں۔ ہم شعر کہتے ہیں اور شعراء کا کلام بھی پرکھ سکتے ہیں۔ تم کہتے ہو کہ نعوذ باللہ ان پر شیطان اُترتا ہے' واللہ ! ایسی بات نہیں ہے ہم نے ان لوگوں کو بھی دیکھا ہے جن پر شیطان آیا ہے۔ محمد صلی اللہ علیہ وسلم میں وسوسہ اور پریشانی بھی نہیں ہے۔ بخدا محمد صلی اللہ علیہ وسلم ایک بہت

بڑے امر کے ساتھ آئے ہیں۔ تمہارا فرض ہے کہ اُس میں غور و فکر کرو اور اس کی تہ تک پہنچو۔

مسند ابن حنبل میں مذکور ہے کہ حضرت عثمان بن مظعون نے فرمایا کہ جب میں نے یہ آیت :- اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ (بے شک اللہ تعالیٰ عدل، احسان اور رشتہ داروں کے ساتھ حُسنِ سلوک کا حکم دیتا ہے اور بدکاری، بُرائی اور ظلم سے روکتا ہے اور تمھیں نصیحت کرتا ہے تاکہ تم نصیحت حاصل کرو۔ (۹۰ النحل) سُنی تو اسلام فوراً میرے دل میں گھر کر گیا اور میں حلقہ بگوشِ اسلام ہو گیا۔

ولید بن مغیرہ ایک بے نظیر محقق شاعر تھا اور کسی کو قصائد و رجز اور اشعار میں اپنا مثل نہیں سمجھتا تھا مُتعصّب بھی بلا کا تھا۔ اُسے اسلام سے دلی دشمنی تھی۔ ابوجہل کے ساتھ شامل ہو کر اُس نے جس جس طرح مسلمانوں کو تکلیف پہنچائی اُس کو سُن کر رونگٹے کھڑے ہو جاتے ہیں۔ ایک دفعہ کفّارِ قریش نے اسے دولت و ثروت کی طمع دلا کر قرآن جیسا کلام پیش کرنے پر مجبور کیا تو اُس نے عاجز و لاچار ہو کر قرآن مجید کی فضیلت کا اعتراف ان الفاظ میں کیا۔

اے قریش تم نے آنحضرتؐ کو ساحر کہا، واللہ وہ ہرگز ساحر نہیں۔ میں نے سحر اور جھاڑ پھونک دیکھا ہے۔ تم نے اُن کو شاعر کہا، خدا کی قسم وہ شاعر نہیں۔ میں شعر کی ہر صنف کا ماہر ہوں۔ تم نے اُن کو معاذ اللہ مجنوں کہا خدا کی قسم وہ مجنوں نہیں۔ میں نے جنون اور اس کی کیفیات کا مشاہدہ کیا ہے۔ اے قریش! اپنے موقف پر غور کرو۔ یہ کوئی امرِ عظیم ہے جو تمہارے لیے نازل کیا گیا ہے۔ اسی ولید بن مغیرہ نے جب آنحضرتؐ کو اِنَّ اللّٰهَ يَأْمُرُ بِالْعَدْلِ وَالْاِحْسَانِ وَاِيْتَآءِ ذِي الْقُرْبٰى وَيَنْهٰى عَنِ الْفَحْشَآءِ وَالْمُنْكَرِ وَالْبَغْيِ يَعِظُكُمْ لَعَلَّكُمْ تَذَكَّرُوْنَ ۝ پڑھتے سُنا تو پکار اُٹھا : خدا کی قسم یہ کلام

شیریں ہے، اِس میں حُسن و خوبی کوٹ کوٹ کر بھری ہوئی ہے۔ یہ سرتاپا شاداب درخت کی مانند ہے جو نیچے سے اور اوپر سے بھرا ہو۔ انسان کی طاقت نہیں کہ اتنا بلیغ کلام کہہ سکے۔

دورِ جاہلیت کے ایک مشہور شاعر لبید بن ربیعہ نے جس کا شمار اصحابِ معلّقات میں ہوتا ہے، جب قرآن مجید کی ایک سورت کو کعبہ میں آویزاں دیکھا تو قرآن کی فصاحت و بلاغت اور اس کے مؤثر اُسلوب بیان کی وجہ سے اسے فوراً الیقین ہوگیا کہ یہ کلامِ خدا ہے۔ چنانچہ وہ فوراً دائرۂ اسلام میں داخل ہوکر آنحضرت کے فدائیوں کی صف میں شامل ہوگیا۔

ضماد الازدی بن ثعلبہ یمن کے رہنے والے تھے اور جھاڑ پھونک کیا کرتے۔ یہ سن کر کہ نعوذ باللہ محمدّ صلّی اللہ علیہ وسلّم دیوانے ہوگئے ہیں، آپؐ کے علاج کے لیے آئے۔ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلم نے ان کے روبرو مختصر الفاظ میں اللہ تعالیٰ کی حمد بیان کی اور کلمۂ شہادت پڑھ کر سُنایا، وہ سن کر متحیّر رہ گئے اور تین مرتبہ کلمۂ شہادت آپؐ سے سُنا اور بالآخر پکار اُٹھے : خدا کی قسم مَیں نے کاہنوں کی بولی، جادوگروں کے منتر اور شاعروں کے قصائد سنے ہیں لیکن آپؐ کا کلام کچھ اور ہی ہے۔ محمدّ صلّی اللہ علیہ وآلہٖ وسلّم ! خدا کے لیے ہاتھ بڑھائیے کہ مَیں اسلام کی بیعت کرلوں۔

نجاشی شاہِ حبشہ کے سامنے جب حضرت جعفر طیارؓ نے سورۂ مریم تلاوت فرمائی تو بادشاہ اتنا متاثّر ہوا کہ رونے لگا اور کہا "محمدؐ تو وہی رسول ہیں جن کی خبر یسوع مسیحؑ نے دی تھی اللہ کا شکر ہے کہ مجھے اُن کا زمانہ ملا۔

قرآنِ پاک نے اسی واقعہ کو ان الفاظ میں بیان کیا ہے :۔

وَ اِذَا سَمِعُوْا مَآ اُنْزِلَ اِلَى الرَّسُوْلِ تَرٰۤى اَعْيُنَهُمْ تَفِيْضُ مِنَ الدَّمْعِ مِمَّا عَرَفُوْا مِنَ الْحَقِّ يَقُوْلُوْنَ رَبَّنَآ اٰمَنَّا فَاكْتُبْنَا مَعَ الشّٰهِدِيْنَ۝

(جب وہ اِس کلام کو سُنتے ہیں جو رسولِ کریم صلّی اللہ علیہ وسلّم پر نازل ہوا تو تو

ان کی آنکھوں کو دیکھتا ہے کہ اُن سے آنسو رواں ہیں۔ اس لیے کہ اُنھوں نے حق کو پہچان لیا ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ ہمارے پروردگار ہم ایمان لے آئے ہمیں گواہی دینے والوں کے ساتھ لکھ لے۔) (۸۳۔ النحل)

نجاشی نے یہ بھی کہا "خدا کی قسم یہ کلام اور انجیل دونوں ایک ہی چراغ کے پرتو ہیں"۔ بعد ازاں حضرت جعفر طیارؓ نے حضرت عیسیٰ کی نسبت قرآن کا عقیدہ بیان کیا تو نجاشی نے زمین سے ایک تنکا اٹھایا اور کہا:۔

"واللہ جو کچھ تم نے بیان کیا حضرت عیسیٰؑ اس تنکے کے برابر بھی زیادہ نہیں" حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کے قبول اسلام کا واقعہ زبان زد خاص و عام ہے۔ آپ قرآن مجید کی چند آیات سُن کر اتنے متاثر ہوئے کہ اسلام قبول کر لیا۔

زمانۂ جاہلیت کے فضلاء پر قرآن مجید کے نادر اُسلوب اور عدیم النظیر فصاحت و بلاغت نے جو معجزانہ اثر ڈالا اُس کا مختصر تذکرہ کیا جا چکا ہے مختصر ادوار میں قرآنی بلاغت لوگوں کو اس طرح متاثر کرتی رہی۔ اکابر صوفیہ اور ائمۂ دین کے قرآن کے ساتھ شغف و عشق اور قرآنی آیات سے متاثر ہونے کی نادر حکایات تذکرے کی کتابوں میں موجود ہیں۔ بعض بزرگوں پر تو قرآنی بلاغت نے اتنا اثر ڈالا کہ قرآن پڑھتے پڑھتے بے خود ہو کر دنیا سے کوچ کر گئے۔

دورِ حاضر کے غیر مسلم علماء پر بھی قرآن مجید نے گہرا اثر ڈالا۔ اگرچہ انہوں نے جاہل حکماء کی طرح اسلام تو قبول نہیں کیا تاہم قرآن مجید کی تاثیر کے بارے میں انہوں نے اپنے خیالات کا اظہار اپنی تالیفات میں کیا ہے۔ اس مختصر سے وقت میں فضلاء و محققین یورپ کی قرآن کی صداقت اور آنحضرت کی فضیلت پر شہادتوں کا تذکرہ ممکن نہیں۔ رُوس کے نامور محقق کونٹ ٹالسٹائی، فرانس کے متبحر عالم ڈاکٹر لیبان، ہیروز اینڈ ہیرو ورشپ کے مؤلف ٹامس کارلائل DOWN FALL OF THE ROMAN EMPIRE کے مؤلف سر

ایڈورڈ گبن APOLOGY FOR MUHAMMAD کے مصنف جان ڈیون پورٹ، قرآن مجید کے انگریزی مترجم جارج سیل، ڈاکٹر لائٹنر اور دیگر شرق شناسانِ قرآن مجید کی فصاحت اور اُس کی سحر آفرینی کی تعریف میں رطب اللسان ہیں۔

دورِ حاضر کے مشہور برطانوی مستشرق پروفیسر اے۔جی، آربری نے قرآن مجید کا انگریزی ترجمہ THE QURAN INTERPRETED کے نام سے کیا ہے۔ اسی ترجمے کے مقدمے میں پروفیسر موصوف لکھتے ہیں کہ یہ کام میں نے شدید ذہنی پریشانی کے عالم میں شروع کیا تھا لیکن اس عظیم کتاب کی برکت سے میری ساری پریشانیاں دُور ہوگئیں۔ فصاحت و بلاغت کے علاوہ قرآن مجید کی معجزانہ تاثیر کا ایک اور سبب اُس کی جامعیّت ہے۔ دنیا کے جتنے آسمانی صحیفے اس وقت کسی نہ کسی صورت میں موجود ہیں۔ ان میں سے قرآن کے علاوہ دیگر سب جامعیّت کے وصف سے محروم ہیں۔ تورات اقوامِ عالم کی تاریخ اور احکام و قوانین کا مجموعہ ہے، زبور دعاؤں اور مناجاتوں کا ذخیرہ ہے۔ سفر ایوّب میں صرف عقیدۂ تسلیم و رضا کی تعلیم ہے۔ امثالِ سلیمان صرف مواعظ و حکم پر مشتمل ہیں۔ انجیل صرف حضرت مسیحؑ کی سرگزشت اور اخلاقی تعلیمات کا مجموعہ ہے لیکن قرآن مجید ان سب کا جامع ہے، وہ تورات بھی ہے اور انجیل بھی اور ان سے زیادہ بھی، وہ تاریخ اقوام بھی اور اخلاق و مواعظ بھی، اِس میں دعائیں بھی ہیں اور مناجاتیں بھی اور دین کامل کے تمام عقائد بھی۔ اس میں عبادات کے مراسم بھی ہیں اور معاملات کے احکام و فرامین بھی غرض یہ کہ ایک مسلمان کی زندگی کے ہر دور اور ہر شعبے کے لیے اس میں کامل ہدایات اور واضح تعلیمات موجود ہیں۔ وہ مسلمانوں کی ہر ضرورت کا کفیل اور ہر سوال کا مجیب ہے۔

مولانا محمد مالک کاندھلوی شیخ الحدیث
جامعہ اشرفیہ۔لاہور

مقالہ

اعجازِ قرآن

بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

الحمد للّٰہ الذی انزل علیٰ عبدہ الکتاب ولم یجعل لہ عوجا قیّما لینذر بأسا شدیدا من لدنہ ویبشر المومنین الذین یعملون الصالحات ان لھم اجرا حسنا۔ والصلوٰۃ والسلام علیٰ اشرف الخلق سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین۔

اَعُوْذُ بِاللّٰہِ مِنَ الشَّیْطٰنِ الرَّجِیْمِ۔ بِسْمِ اللّٰہِ الرَّحْمٰنِ الرَّحِیْمِ ۝

قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتِ الْاِنْسُ وَالْجِنُّ عَلٰی اَنْ یَّاْتُوْا بِمِثْلِ ھٰذَا الْقُرْاٰنِ لَا یَاْتُوْنَ بِمِثْلِہٖ وَلَوْ کَانَ بَعْضُھُمْ لِبَعْضٍ ظَھِیْرًا۔ (۸۸۔ بنی اسرائیل)

صَدَقَ اللّٰہُ الْعَظِیْمُ ۝

حضرات! پیشِ خدمت مقالہ کا عنوان "اعجازِ قرآن" ہے۔ موضوع کی اہمیت اور عظمت محتاجِ بیان نہیں۔ اپنی علمی بے مائگی پر نظر کرتے ہوئے مجھے اس بات کا پورا پورا احساس ہے کہ میں اس بلند پایہ موضوع کا حق تو ادا نہیں کرسکتا لیکن کچھ منتشر باتیں عرض کردیتا ہوں۔ جس سے اُمید ہے کہ حضرات سامعین کتابِ الٰہی کے اعجاز اور اُس کی عظمت و بلندی کا کچھ اجمالی سا اندازہ لگاسکیں گے۔ مَا اسْتَطَعْتُ وَمَا تَوْفِیْقِیْ اِلَّا بِاللّٰہِ۔

یہ مسئلہ اعجازِ قرآن ہمیشہ سے اُمّت میں نہایت مہتم بالشّان مسئلہ رہا ہے۔ ہر دَور اور قرن میں علماء و محقّقین اس پر مستقل کتابیں تالیف فرماتے رہے۔ ائمہ متقدّمین میں خطابی، رمانی، ابن سراقہ، الزمانی، امام رازی، ابوبکر باقلانی، ابوالسعود اور علّامہ ابوحیان کی اعجازِ قرآن پر کتابیں بنیادی حیثیّت رکھتی ہیں۔ ابوبکر الباقلانی کی کتاب "اعجاز القرآن" کے متعلق ابن العربی کا قول ہے کہ ایسی کوئی کتاب دنیا میں تصنیف نہیں ہوئی۔ شیخ ابوالسعود کی کتاب "ارشاد العقل السلیم الیٰ مزایا القرآن الکریم" بھی اس موضوع پر نہایت بلند پایہ تالیف ہے۔ علّامہ زمخشری کی تفسیر کا موضوع اگرچہ عام ہے لیکن قرآنی اعجاز پر دورانِ تفسیر اُن کے کلام اور تحقیقات نے قرآنی اعجاز کے فہم کے لیے بہت اُصولی اور بنیادی ابواب کھول کر رکھ دیئے۔ شیخ جلال الدّین سیوطیؒ نے تفصیل کے ساتھ اس موضوع پر تصنیف کردہ کتابوں کا ذکر کیا ہے۔ متقدّمین کے عُلوم سے استفادہ کرتے ہوئے متأخّرین بھی اس موضوع پر مفید مقالے اور کتابیں اُمّت کے سامنے پیش کرتے رہے۔

حضرات! اسلام میں ایک متّفق علیہ عقیدہ کے درجہ میں یہ بات طے شدہ ہے کہ قرآنِ کریم کلامِ الٰہی ہے۔ اور اللہ ربّ العزّت کی دیگر صفات مثلاً سمع و بصر اور قدرت کی طرح کلام بھی ایک صفتِ الٰہیہ ہے۔ اور فرمانِ خداوندی وَکَلَّمَ اللّٰہُ مُوْسٰی تَکْلِیْمًا ط اسی صفتِ الٰہیہ کو ذاتِ خداوندی کے لیے ثابت کر رہا ہے۔ اور جیسے حق تعالیٰ شانہٗ اپنی ذات اور جملہ صفات میں لَیْسَ کَمِثْلِہٖ شَیْءٌ کا مصداق ہے کہ کائنات میں اُس کی کوئی نظیر اور مثال ممکن نہیں اسی طرح اُس کے کلام کی بھی کوئی مثال نہیں ہوسکتی۔ اور دنیا کی ہر کوشش اس جیسا کلام پیش کرنے سے عاجز رہے گی۔ طاقتِ بشریّہ کے اسی عجز و قصور کو نہایت ہی واضح اور پُرشوکت عنوان کے ساتھ تعبیر کیا گیا۔ قُلْ لَّئِنِ اجْتَمَعَتْ کہ اے ہمارے پیغمبر آپ یہ اعلان کردیں کہ اگر تمام عالم اور جنّ و

انس جمع ہوجائیں اِس بات کے لیے کہ قرآن جیسا کلام پیش کردیں تو ہرگز ہرگز وہ قرآن کے مثل کوئی کلام نہیں لاسکیں گے۔ خواہ وہ ایک دوسرے کے مددگار ہوں اور ساتھ ہی اس اعلان کی صداقت میں تردّد کرنے والوں کو مقابلہ کی دعوت بھی دے دی گئی۔

وَاِنْ كُنْتُمْ فِيْ رَيْبٍ مِّمَّا نَزَّلْنَا عَلٰى عَبْدِنَا فَاْتُوْا بِسُوْرَةٍ مِّنْ مِّثْلِهٖ وَادْعُوْا شُهَدَآءَكُمْ مِّنْ دُوْنِ اللّٰهِ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝ (۲۳-البقرہ)

کہ اگر تم کسی تردّد اور شبہ میں پڑے ہوئے ہو اس کلام کے بارہ میں جو ہم نے اپنے بندہ پر اتارا تو پھر تم بھی بنالاؤ اس جیسی کوئی سورت (اور ٹکڑا) اور خدا کے سوا جس کو چاہو مدد کے لیے بلالو۔ اگر تم (اپنے دعویٰ میں) سچے ہو۔

اور یہ دعوت عرب کے ان مایۂ ناز فصحاء و بلغاء اور بلند پایہ شعراء و خطباء کو دی گئی جن کا بچّہ بچّہ شعر گوئی اور گہوارۂ فصاحت و بلاغت میں تربیت پاتا تھا تاریخ گواہ ہے کہ دنیا اس کلامِ الٰہی کا مثل پیش کرنے سے عاجز رہی۔ کسی نے بھی اجتماعی یا انفرادی طور پر اس بات کی جرأت نہ کی کہ یہ کہہ دیتا لو میں نے قرآن کے اِس اعلان و دعوت کا جواب دیتے ہوئے یہ کلام پیش کردیا ہے۔ قریشِ مکّہ اسلام اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے ساتھ غایت درجہ عناد اور دشمنی رکھتے تھے۔ اگر ان میں اس امر کا ذرّہ برابر بھی امکان ہوتا وہ ہرگز قرآن کے مقابلہ سے پیچھے ہٹنے والے نہیں تھے۔ لیکن اپنی تمام تر امکانی جدّ و جہد اور کوششوں سے تھک جانے کے بعد اس کے سوا اور کوئی چارہ کار نہ پایا کہ مہمل اور بے معنی باتیں کرنے لگیں۔ کسی نے کہا قرآن کہانت ہے، کسی نے کہا شعر ہے، کوئی کہتا کہ آپ کو جنون ہوگیا۔ اور بحالتِ جنون یہ باتیں اور کلام آپ کی زبان سے جاری ہوتا ہے۔ مگر خود ہی ان باتوں کو کہتے

ہوئے شرماتے اور اعتراف کرتے کہ قطعاً یہ کلام اِس نوع کی چیزوں میں سے کوئی بھی چیز نہیں۔ ولید نے کہا اے لوگو! یہ سب غلط ہے آپ کاہن بھی نہیں کیونکہ میں کہانت سے بخوبی واقف ہوں اور یہ کلام کاہنوں کے کلام کی مشابہت نہیں رکھتا۔ میں شعر کا بھی ماہر ہوں اور اس کلام کو شعر سے بھی کوئی مناسبت نہیں اور آپ ساحر بھی نہیں اور نہ آپ کا کلام ساحروں کا سا دم کرنا اور پھونکنا ہے۔ خدا کی قسم محمدؐ کے کلام میں ایک عجیب قسم کی حلاوت اور شیرینی اور اس پر عجیب قسم کی رونق ہے۔ اس کلام کی جڑ نہایت مضبوط و تر و تازہ اور اس کی شاخیں ثمردار ہیں اور جو کچھ تم کہتے ہو وہ سب لغو اور باطل ہے۔ مگر اس گروہ کو قرآنِ کریم سے متنفر اور برگشتہ بنانے کے لیے کوئی نہ کوئی بات بنانی تھی اس وجہ سے یہ طے پایا کہ سب سے بہتر بات یہ معلوم ہوتی ہے کہ اس کو سحر کہو۔ کیونکہ سحر میں تاثیر ہوتی ہے اور اس کا خاصہ میاں بیوی میں تفریق، باپ بیٹے میں جدائی، بھائی سے بھائی کو بیزار اور قبیلوں و خاندانوں میں اختلاف اور بیزاری ڈالنا ہے اور اس کلام نے بھی ایسا ہی کیا ہے کہ باپ بیٹے، میاں بیوی اور قبائل میں تفریق ڈال دی ہے اس لیے سحر کہنا ہی مناسب ہے۔ گویا انہوں نے قرآنِ کریم کے خلاف لوگوں کو برگشتہ بنانے کے لیے اس پروپگنڈے کو زیادہ بہتر اور اپنے گمان میں کامیاب سمجھا۔ اور یہ خیال کہ اس کلام کی رُوحانی تاثیر جو محسوس کی جاتی ہے لوگوں کے ذہنوں کا رخ روحانی اور غیبی تاثیر سے ہٹا کر جادو کی تاثیر کی طرف کر دیں۔ مگر یہ تدبیر بھی کارگر نہ ثابت ہوئی۔ بلکہ جس قدر مقابلہ اور مخالفت کی گئی اسی قدر اس کی حقانیت اور کلامِ الٰہی ہونا واضح ہوتا گیا۔

(جس طرح تمام دنیا خدا کے کسی کام کا مقابلہ نہیں کر سکتی اسی طرح اس کے کلام کا بھی مقابلہ نہیں کر سکتی) یہ بات ظاہر ہے کہ کارخانۂ عالم اور اس کی تمام مصنوعات قدرتِ خداوندی کا کرشمہ ہیں۔ زمین و آسمان، شمس و قمر،

شجر و حجر، جنّ و انس اور غرض تمام کائنات اللہ کی مخلوق ہے اور عالمِ دنیا میں پیش آنے والے جملہ انواعِ تغیّرات اللہ ربّ العزّت کی قدرت اور خالقیت کی دلیل ہیں اور یہ کام اللہ ہی کے افعال ہیں۔ ان میں کوئی ایک چیز بھی مخلوق بنانے پر قادر نہیں خواہ کتنی اپنی طاقت خرچ کر ڈالے۔ اسی لیے حق تعالیٰ مصنوعاتِ عالم اور ان میں تغیّر و انقلابات سے اپنے وجود اور قدرتِ کاملہ پر استدلال فرماتا ہے۔ مثلاً

اِنَّ فِیْ خَلْقِ السَّمٰوٰتِ وَالْاَرْضِ	بلاشبہ آسمانوں اور زمین کے پیدا
وَاخْتِلَافِ الَّیْلِ وَالنَّهَارِ	کرنے میں اور رات دن کے
وَالْفُلْكِ الَّتِیْ تَجْرِیْ فِی الْبَحْرِ	ادل بدل میں اور جہازوں کے
بِمَا یَنْفَعُ النَّاسَ وَمَآ اَنْزَلَ اللّٰهُ	چلنے میں جو لوگوں کے فائدوں کے
مِنَ السَّمَآءِ مِنْ مَّآءٍ فَاَحْیَا	لیے سمندر میں چل رہے ہیں اور
بِهِ الْاَرْضَ بَعْدَ مَوْتِهَا وَبَثَّ	جو بارش اللہ نے آسمان سے
فِیْهَا مِنْ كُلِّ دَآبَّةٍ ۪ وَّتَصْرِیْفِ	برسائی پھر اُس سے زمین کو شاداب
الرِّیٰحِ وَالسَّحَابِ الْمُسَخَّرِ	بنایا بعد اس کے مردہ اور بنجر ہو
بَیْنَ السَّمَآءِ وَالْاَرْضِ	جانے کے اور ہر قسم کے جانور جو
لَاٰیٰتٍ لِّقَوْمٍ یَّعْقِلُوْنَ ۝	زمین میں پھیلا دیئے اور ہواؤں
(۱۶۴- البقرہ)	کے رخ ایک سمت سے دوسری

سمت پھیرنے میں اور بادلوں میں جو خدا کے حکم سے آسمان و زمین کے درمیان معلق ہیں۔ ان سب میں بے شک عظیم نشانیاں ہیں اُن لوگوں کے لیے جو عقل رکھتے ہیں۔

تو جس طرح آسمان اور اس میں بنائے ہوئے سیارات، چاند، سورج اسی طرح زمین اور اس میں پیدا کی ہوئی جملہ مخلوقات غذائیں رنگ برنگ کے پھل اور پھول سب کچھ اللہ کی مخلوقات ہیں۔ کسی کی طاقت نہیں کہ ان میں کسی بھی معمولی سے

معمولی چیز کو بھی پیدا کر دے اور اس کا مثل بنا لائے۔ حتیٰ کہ اگر ساری کائنات مل کر ارادہ کرے کہ ایک مکھی اور مچھر ہی پیدا کر دے تو عاجز ہو کر بیٹھ رہے گی۔ جیسے کہ ارشادِ خداوندی ہے :-

اِنَّ الَّذِیْنَ تَدْعُوْنَ مِنْ دُوْنِ اللّٰہِ لَنْ یَّخْلُقُوْا ذُبَابًا وَّلَوِ اجْتَمَعُوْا لَہٗ ط

(۷۳ - الحج)

کہ اے لوگو! جن چیزوں کو تم خدا کے سوا معبود بناتے ہو وہ تو ہرگز ایک مکھی بھی پیدا نہیں کر سکتے اگر وہ سب کے سب اس کیلئے جمع ہو جائیں (اور گویا اپنی تمام اجتماعی طاقتیں اور کل مادی وسائل ایک مکھی جیسی حقیر چیز پیدا کرنے کے لیے بروئے کار لے آئیں تب بھی وہ ہرگز کامیاب نہ ہو سکیں گے۔)

تو جیسے تمام دنیا اللہ کے فعل اور کام کا مقابلہ کرنے سے عاجز ہے بالکل اسی طرح اُس کا کلام بھی بے مثال ہے۔ دنیا اپنی ساری کوششیں صرف کر ڈالے لیکن اُس کے کلام کا مقابلہ کرنے سے اور اُس کا نمونہ پیش کرنے سے عاجز رہے گی اور جس طرح اللہ کی مخلوق اور انسانی مصنوع میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ اور کسی درجہ میں بھی ان دونوں میں التباس نہیں ہو سکتا مثلاً قدرتِ خداوندی سے پیدا کیا ہوا گلاب کا پھول اور انسانوں کے بنائے ہوئے کاغذ کے پھول قطعاً جُدا جُدا ہیں، زمین و آسمان سے بھی زائد فرق ہے انسان کا بنایا ہوا پھول خواہ کتنا ہی خوبصورت ہو اصلی پھول کا مثل اور شبیہ نہیں ہو سکتا۔ بلکہ ہر ایک شخص ایک نظر میں اصلی پھول اور کاغذی پھول میں فرق پہچان لے گا۔ بالکل اسی طرح کلام الٰہی انسانی کے کلام سے جدا اور ممتاز ہے اور انسانوں کا کلام کسی درجہ میں بھی کلام الٰہی جیسا نہیں

ہوسکتا۔ انسان درختوں پھلوں پھولوں اور جاندار چیزوں کی تصویر کھینچ لیتا ہے۔ مجسمے تیار کرلیتا ہے۔ مگر ایک مچھلی کی آنکھ، ایک مکھی کا پر اور مچھر کی ٹانگ نہیں بنا سکتا الغرض جس طرح مخلوق کا کام اللہ کے کام سے مشابہ نہیں ہوسکتا۔ بالکل اسی طرح مخلوق کا کلام اللہ کے کلام سے کوئی مماثلت اور مشابہت نہیں اختیار کرسکتا۔ اللہ ربّ العزّت کا جلال وجمال اُس کے کلام میں اس طرح جھلکتا ہے کہ ہر ایک اس کو سن کر یقین کرلیتا ہے کہ یہ اللہ کا کلام ہے ؎

در سخن مخفی منم چوں بوئے گل در برگ گل ہر کہ دیدن میل دارد در سخن بیند مرا

معجزہ

لفظِ معجزہ اعجاز سے مشتق ہے جس کے معنی عاجز کردینے والی چیز کے ہیں۔ اصطلاحِ شریعت میں ہر ایسے خارق امر واقعہ کو کہا جاتا ہے جو محض اللہ کی قدرت سے بلا توسّطِ اسباب اور مادّی وسائل و ذرائع پیغمبر کے ہاتھوں اور اس کے ذریعہ ظاہر ہو اس طرح کہ طاقتِ بشریّہ اس جیسی چیز پیش کرنے سے عاجز رہے۔

یقیناً جب ایسی چیز لوگ دیکھیں گے جو طاقتِ بشریّہ سے بالا و برتر اور مادّی اسباب سے خارج اور ظاہری احاطۂ وسائل سے بعید ہے تو اللہ کے پیغمبر کی نبوّت و رسالت کو تسلیم کریں گے۔ چنانچہ متکلّمین نے اس بات کی تصریح کی ہے کہ معجزات دلائلِ نبوّت ہیں اس لیے حق تعالیٰ اپنے تمام پیغمبروں کو معجزاتِ قاہرہ دے کر مبعوث فرماتا ہے۔ تاکہ قدرتِ خداوندی کی ان عظیم نشانیوں کو دیکھ کر لوگوں کی گردنیں انبیاء علیہم السّلام کی اطاعت کے لیے خم ہوجائیں۔ انبیاءِ بنی اسرائیل کو جو معجزات دیئے گئے وہ معجزاتِ حسّیہ تھے جیسے حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا معجزہ "عصا" اور "یدِ بیضا" اور سمندر پر عصا مارنے سے بارہ راستے پیدا ہوجانا۔ اور پتھّر سے پانی کے بارہ چشموں کا جاری ہوجانا اور حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کا اللہ کے حکم سے مادر زاد نابیناؤں کو بینا اور اکمہ و ابرص یعنی جذام اور کوڑھ کی بیماری میں مبتلا مریضوں کو تندرست

کر دینا، مُردوں کو زندہ کرنا، پرندوں کی ہیئت بنا کر اُڑا دینا۔ حضرت ابراہیم علیہ السّلام کے لیے دہکتی ہوئی آگ کا برد و سلام ہو جانا اور حضرت داؤد علیہ السّلام کے ہاتھ میں لوہے کا موم کی طرح نرم ہو جانا وغیر ذٰلک، یہ سب معجزاتِ حسّیہ انبیاءِ سابقین کو دیئے گئے۔ وہ قومیں چونکہ بالعموم کم فہم اور بلید تھیں اس بنا پر اُن کو ایسے ہی معجزات دیئے گئے جو آنکھوں سے نظر آسکیں۔ اس کے برعکس امّتِ محمّدیہ کو زیادہ تر معجزاتِ عقلیہ دیئے گئے۔ جن کا تعلّق فہم و بصیرت اور عقل و تدبّر سے تھا۔ کیونکہ اہلِ عرب بہ نسبت دیگر اقوام کے فہم و تدبّر اور عقل و دانائی میں امتیازی خُصُوصیّت رکھتے تھے۔ اور جو ان میں اُمّی سابقہ کی طرح کودن اور احمق تھے اُن کی خاطر حسّی معجزات بھی معنوی معجزات کے ساتھ جمع کر دیئے گئے

نیز اس وجہ سے بھی کہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کا دین اور آپؐ کی شریعت قیامت تک کے واسطے تھی۔ اِس بنا پر آپؐ کی نبوّت کے لیے ایسے ہی معجزات مناسب تھے جو ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والے ہوں۔ انبیاءِ سابقین کے معجزاتِ حسّیہ کی طرح ایسے نہ ہوں کہ وہ اُن انبیاء کے ساتھ ساتھ ختم ہو جائیں۔ اور ظاہر ہے کہ یہ شان معنوی اور روحانی معجزات ہی میں ہو سکتی ہے۔ اِس لیے آپؐ کی نبوّت کے دلائل زیادہ تر معجزاتِ عقلیہ ہی بنائے گئے جن میں سب سے زیادہ بلند پایہ اور عظیم المرتبت معجزہ قرآن کریم ہے جو قیامت تک زندہ رہنے والا معجزہ ہے کہ ہمیشہ لوگ اس کو دیکھتے رہیں گے اور آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت پر اس ذریعہ سے ایمان لاتے رہیں گے۔ صحیح مسلم میں ابوہریرہ رضی اللہ عنہ سے روایت ہے :-

ان رسول اللہ صلّی اللہ علیہ	کہ رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم
وسلّم قال ما من الانبیاء من	نے فرمایا انبیاءِ سابقین میں کوئی
نبی الا قد اعطی من الآیات	نبی بھی ایسا نہیں گذرا کہ اسے نہ

ما مثلہ اٰمن علیہ البشر وانما کان الذی اوتیت وحیا اوحی اللہ الیّ۔ فارجو ان اکون اکثرھم تابعا یوم القیامۃ۔	دیا گیا ہو آیات و معجزات میں سے ایسا کوئی معجزہ کہ اس پر انسان ایمان نہ لایا ہو۔ (بلکہ ہر پیغمبر کو ایسے معجزات دیئے گئے ہیں کہ لوگ ان پر ایمان لائے) اور جز ایں نیست کہ جو چیز مجھ کو دی گئی وہ اللہ کی وحی ہے جو اللہ نے میری طرف بھیجی۔ (یعنی قرآن کریم) پس میں اُمید کرتا ہوں کہ میں متّبعین کی تعداد کے اعتبار سے قیامت کے روز سب سے زائد ہوں گا۔

یہ کلماتِ مبارکہ اسی مضمون کی جانب رہنمائی کر رہے ہیں کہ انبیاءِ سابقین کے معجزات بے شک اپنی اپنی جگہ نہایت عظیم الشّان اور قدرتِ خداوندی کی واضح نشانیاں اور اُن کی نبوّت کے لیے براہینِ قاطعہ ہیں۔ لیکن وہ معجزات ان کی حیات میں رہے اور ان کا زمانہ ختم ہونے کے ساتھ ختم ہوگئے۔ چنانچہ اب حضرت موسیٰ علیہ السّلام کا معجزہ عصا اور یدِ بیضا اور حضرتِ عیسیٰؑ کے معجزہ اِحیاءِ موتٰی کا مشاہدہ نہیں کیا جاسکتا۔ مگر اس کے بالمقابل نبی آخر الزّمان محمّد رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم کا یہ معجزۂ قرآنِ حکیم ایسا معجزہ ہے جو کبھی ختم نہ ہوگا۔ بلکہ دنیا فنا ہو جائے گی اور یہ معجزہ آفتاب کی طرح ہمیشہ تاباں و درخشاں رہے گا اور ہر دَور و قرن میں لوگ اس آفتابِ ہدایت کے ذریعہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی نبوّت و رسالت پر ایمان لاتے رہیں گے۔ اس وجہ سے لامحالہ آپ کے متّبعین کی تعداد تمام پیغمبروں کے متّبعین سے زائد ہوگی۔

کُفّارِ مکّہ جب اس وحیِ الٰہی کے مقابلہ سے عاجز رہے اور اس اعلانِ

صداقت کے مقابلہ میں کوئی آواز بلند کرنے کی قدرت نہ ہوئی تو کہنے لگے کیوں نہیں آپ پر آپ کے رب کی طرف سے نشانیاں اتاری جاتیں۔ اس پر ان کے اس احمقانہ سوال یا طلب پر جواب نازل فرمایا گیا۔

اَوَلَمْ یَکْفِهِمْ اَنَّآ اَنْزَلْنَا — کہ کیا ان کو یہ حجت و برہان

عَلَیْكَ الْكِتٰبَ یُتْلٰی عَلَیْهِمْ — کافی نہیں کہ ہم نے آپ پر کتاب

اُتاردی جو اُن کے سامنے تلاوت کی جاتی ہے۔ (۵۱۔ العنکبوت)

یعنی قرآن کریم سے بڑھ کر ان کو اور کیا نشانی درکار ہے۔ یہی تو سب سے بڑی نشانی اور دلیل ہے اس کا ایک ایک لفظ آپؐ کی نبوّت کی عظیم تر نشانی اور دلیل ہے۔

بہرحال قرآنِ کریم صرف معجزہ ہی نہیں بلکہ جس طرح حق تعالیٰ شانہٗ کی ذات پر کبھی فنا اور عدم طاری نہیں ہوسکتا وہ ابدی اور دائمی ہے اسی طرح یہ کلامِ خداوندی بھی دوام و ابدیّت کی شان اپنے اندر لیے ہوتے ہے۔

قرآن کے وُجُوہِ اعجاز

قاضی عیاضؒ "شِفاء" میں فرماتے ہیں کہ اعجازِ قرآن کی صورتیں تو بہت ہیں جن کا احاطہ مشکل ہے۔ لیکن بنیادی طور پر تمام وجوہِ اعجاز کو حاوی چار شکلیں ہیں۔

(۱) قرآنِ کریم کی حُسنِ تالیف یعنی کلمات و آیات کا باہمی ارتباط و تناسب اور اُس کا وہ معیارِ فصاحت و بلاغت جس نے دنیا کو عاجز کردیا۔

(۲) نظمِ قرآنی کا وہ عجیب و غریب اور امتیازی طرزِ بیان جو اہلِ عرب کے ہر اُسلوبِ نظم و نثر سے جُدا اور ممتاز نظر آتا تھا۔ جس کو دیکھ کر عرب کے تمام ماہر شعراء و بُلغا حیران تھے اور کلامِ الٰہی کا اندازِ بیان اور طرزِ تعبیر اُن کو ہر مروّج اُسلوب سے جُدا نظر آتا تھا۔

(۳) اُمم سابقہ اور گذرے ہوئے زمانوں کے واقعات و احوال کا ذکر جن کو کوئی اُمّی شخص تو درکنار بہت سے خواص اور عُلماءِ اہلِ کتاب بھی نہیں جانتے تھے۔ جو اس امر کا کھلا ہوا ثبوت ہے کہ قرآن اللہ کا کلام ہے اور دنیا میں کوئی اس کا مثل نہیں پیش کرسکتا۔ بلکہ قرآنِ کریم نے تو اس ضمن میں بہت سے ایسے حقائق کو منکشف اور ثابت کیا جن میں اُمم سابقہ اور اہلِ کتاب کا شدید اختلاف چلا آرہا تھا۔ ظاہر ہے کہ تاریخ قدیم کے ایسے مختلف فیہ اور الجھے ہوئے واقعات میں ٹھوس اور واضح حقائق ثابت کر دینا صرف کلامِ الٰہی کا کام ہے۔

(۴) آنے والے واقعات اور غیب کی خبروں کا بیان، یہ بھی قرآن کی معجزانہ شان ہے کہ آنے والے جن جن واقعات کی خبر دی وہ صبح صادق کی روشنی کی طرح دنیا کے سامنے رونما ہوئے۔ مثلاً حق تعالیٰ نے ایران پر رُوم کے غلبہ کی خبر دی ایسے وقت میں جب کہ عالمِ اسباب میں بظاہر اس کا کوئی امکان نہیں تھا۔

الٓمّٓ ۝ غُلِبَتِ الرُّوْمُ ۝ فِيْٓ اَدْنَى الْاَرْضِ وَهُمْ مِّنْۢ بَعْدِ غَلَبِهِمْ سَيَغْلِبُوْنَ ۝ فِيْ بِضْعِ سِنِيْنَ ۝

مغلوب ہوگئے ہیں رُومی قریبی سرزمین یعنی ملکِ فارس میں لیکن یہ لوگ (رُومی) اپنے مغلوب ہونے کے بعد چند ہی سالوں میں اُن پر (ایران کے مجوسیوں پر) غالب آجائیں گے۔

مشرکینِ مکّہ فارس کے آتش پرستوں کو مذہباً اپنے سے قریب سمجھتے ہوئے اپنا بھائی کہا کرتے تھے اور رومی چونکہ اہلِ کتاب تھے، خدا اور آخرت پر اُن کا ایمان تھا اس بناء پر اُن کو مسلمانوں کا دوست یا بھائی کہا جاتا تھا تو رومیوں پر جب فارس کا غلبہ ہوا تو مشرکینِ مکّہ بہت خوش ہوئے اور کہنے لگے آج ہمارے بھائی تمھارے بھائیوں پر غالب آئے ہیں اور ان کو مٹا دیا ہے۔ اسی طرح کل یعنی آئندہ ہم بھی تم پر غالب آئیں گے اور تمہیں مٹا ڈالیں گے۔ اس وقت ظاہری اسباب میں رُوم کے غلبہ کے کوئی امکانات نہ تھے لیکن قرآن نے اعلان کیا کہ بے شک وہ آج مغلوب ہوئے ہیں لیکن اس مغلوبی کے بعد چند ہی سالوں میں

وہ فارس پر غالب آئیں گے۔ اور اسی پر اکتفا نہیں کیا گیا بلکہ یہ بھی اعلان کر دیا گیا کہ اور وہ دن ایسا ہوگا کہ اُس وقت اہلِ ایمان اللہ کی مدد اور فتح مندی پر خوش ہو رہے ہوں گے۔ چنانچہ قرآن کریم کی یہ پیش گوئی عین اُس وقت ظاہر ہوئی جب کہ بدر کی فتح پر مسلمان خوشیاں منا رہے تھے۔ قرآن کریم کی اس عظیم الشان پیشین گوئی کی صداقت کا مشاہدہ کر کے بہت سے لوگ مشرف باسلام ہوئے۔

قاضی ابوبکر العربی نے اِن وُجُوہ کے علاوہ مزید انواعِ اعجاز ذکر کرتے ہوئے فرمایا قرآنِ کریم کا یہ بھی بہت بڑا اعجاز ہے کہ تالیف و ترتیب اور کلمات و آیات کا تناسب اور طرزِ بیان ایک نرالا اُسلوب رکھنے کے ساتھ بدیع اور محاسنِ کلام کی جس قدر بھی انواع ہیں اِن سب پر آیاتِ قرآنیہ مشتمل ہیں۔ فرمایا خداوند عالم کی یہ سُنّت ہمیشہ رہی ہے کہ جس زمانہ میں جو ہنر اور فن عروج کو پہنچا اُسی نوع کا معجزہ پیغمبر کو دیا جاتا تاکہ لوگ اس معجزہ کو دیکھ کر مادّی وسائل و طاقتوں اور قدرتِ خداوندی کے درمیان بخوبی امتیاز کر سکیں اور اس طرح وہ خدا کے پیغمبر پر ایمان لے آئیں۔ حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں سحر (جادو) کا زور تھا۔ سرزمینِ مصر میں مایۂ ناز جادوگر تھے تو عصا اور یدِ بیضا کا معجزہ دیا گیا جس نے تمام جادوگروں کو عاجز کر کے یہ دکھا دیا کہ یہ کسی انسان کا کوئی ہنر اور کرتب نہیں بلکہ اللہ کا فعل ہے جو اُس کے پیغمبر کے ہاتھ پر ظاہر ہُوا۔ اس وجہ سے جادوگر اس کے مقابلہ سے عاجز رہے۔ حضرت عیسیٰ علیہ السّلام کے زمانہ میں فنِّ طب عُروج پر تھا تو اُن کو احیاءِ مَوتیٰ اور مادر زاد نابیناؤں کو بینا کر دینے کا معجزہ دیا گیا جس سے دُنیائے طب عاجز تھی۔ اب جبکہ آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کی بعثت کا زمانہ آیا تو عرب میں فصاحت و بلاغت شباب پر تھی۔ ایک سے ایک بلند پایہ شاعر، مایۂ ناز خطیب اپنے اشعار و قصائد بیتُ اللہ کی دیواروں پر اس اعلان کے ساتھ لٹکایا کرتا

هَلْ مِنْ مُّبَارِزٍ۔ (ہے کوئی مقابلہ کرنے والا) آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم نے اس ماحول میں جب قرآنِ کریم کی آیات سُنائیں، فصاحت و بلاغت کے تمام پیشوا اور امام عاجز رہے۔ اور جس وقت بیتُ اللہ کی دیوار پر کسی صحابی نے سُورۃ کوثر لکھ کر چسپاں کی اور کاغذ کے نیچے بہت سی جگہ چھوڑ دی تاکہ جس کو مقابلہ کا زعم ہو وہ اُس کے نیچے کچھ لکھ دے۔ دیکھنے والے غور سے دیکھتے رہے، سوچتے رہے، کوشش بھی کی کہ اس کے نیچے کچھ لکھ دیں۔ لیکن ایک بہت بڑے ادیب اور فصیح و بلیغ شاعر نے یہ الفاظ لکھے مَا هٰذَا كَلَامُ الْبَشَرِ کہ یقیناً یہ کسی بشر کا کلام نہیں ہے۔

پھر اس دلربا انداز کے ساتھ آیاتِ کلام اللہ میں ان بُلند پایہ حقائق و معارف کا جمع ہونا خصُوصًا ایک ایسے شخص کی زبانی جس نے نہ کسی معلّم سے کچھ سیکھا اور نہ کبھی کسی درسگاہ کو دیکھا، یقیناً اس بات کا واضح ثبوت ہے کہ یہ کلامِ الٰہی ہے۔

(۶) قرآنِ کریم کے الفاظ میں وہ حلاوت و شیرینی ہے جس کو ہر شخص محسوس کرتا ہے خواہ وہ عربی جانتا ہو یا نہ جانتا ہو۔ بلکہ وہ شخص بھی غیر اختیاری اور غیر شعوری طور پر اس حلاوت و جاذبیّت کو محسوس کرتا ہے جو قرآن پر ایمان بھی نہیں رکھتا۔ اور عجیب بات ہے کہ الفاظِ قرآنی کا حُسن و جمال اس قدر نمایاں ہے کہ جس کسی کلام کے دَوران کلمات و آیاتِ قرآنیہ آجائیں اُن کا حُسن و جمال مجموعۂ کلام میں اُسی طرح ممتاز نمایاں ہوگا جیسے آسمان کی سطح پر ستارے خود بخود نظر آتے ہیں۔

(۷) ہر قوم اپنے مزاج اور ذوق کے لحاظ سے مختلف ہوتی ہے۔ یہ ممکن نہیں ہے کہ ایک کلام اگر کسی قوم کو مرغوب اور پسندیدہ معلوم ہوتا ہے تو جُملہ اقوام بھی اُس کو پسند کریں۔ لیکن قرآنِ کریم کی حلاوت و لذّت دُنیا کی ہر قوم عرب عجم ہو، ایشیا یورپ والے ہوں یا افریقہ کے غرض ہر قوم اس سے لطف اندوز

ہوتی ہے۔ حالانکہ وہ کسی کے بھی معیار اور اُسلوبِ بیان کے تابع نہیں ہے۔
(۸) ہر طویل کلام میں یہ بات دیکھی جاتی ہے کہ اگر آغازِ کلام حسین و جمیل اور پُرشوکت الفاظ سے مرصّع ہوتا ہے تو بسا اوقات درمیان کلام وہ رونق تعبیر اور زیبائش الفاظ نہیں رہتی اور کبھی کوئی بات درمیان میں بے موقع یا گری ہوئی آجاتی ہے۔ مگر قرآنِ کریم کو جہاں سے بھی دیکھئے تعبیری عظمت، کلمات کی فصاحت و بلاغت اور معارف و حقائق کی بلندی یکساں ہی نظر آئے گی۔ بلکہ قرآنی اُسلوبِ بیان سے مناسبت رکھنے والے یقیناً ایسا محسوس کریں گے کہ ابتدائے کلام سے مضمون کی بلندی اُفق سے نمایاں ہونے والے نُور کی طرح روشن ہو رہی ہے۔ درمیانِ کلام اس کی تکمیل و تصدیق کر رہا ہے اور مقطع کلام اِن حقائق و معارف پر مہر کا کام دے رہا ہے۔
(۹) ہر کلام سے متکلّم کی شان نمایاں ہوا کرتی ہے۔ عُرفا کا کلام پڑھنے سے دل پر نورانی کیفیات محسوس ہوتی ہیں اور ایسا معلوم ہوتا ہے یہ کسی شیریں چشمہ کا پانی ہے۔ بادشاہوں کے کلام سے اُن کا شاہانہ عظمت و جلال ٹپکتا ہے۔ شہوت پرستوں کے کلام سے نفسانی شہوتوں کی گندگی اور بدبو محسوس ہوتی ہے۔ فلسفہ کی دلدل میں پھنسے ہُوؤں کا کلام اُن کے فلسفیانہ تکدّر و تحیّر کا مظہر، لیکن کلامِ ربّانی حق تعالیٰ کی عظمت و کبریائی اور شانِ اُلوہیّت کا آئینہ ہوتا ہے۔

ایک اعرابی نے کسی قاری کو یہ آیت تلاوت کرتے سُنا :۔ قِیْلَ یٰٓاَرْضُ ابْلَعِیْ مَآءَکِ وَیٰسَمَآءُ اَقْلِعِیْ وَغِیْضَ الْمَآءُ وَقُضِیَ الْاَمْرُ طُوفانِ نوح کے سلسلہ میں ارشاد ہے، کہا گیا اے زمین اپنا پانی نگل لے اور اے آسمان تو رُک جا، اور پانی جذب کر دیا گیا اور کام تمام کر دیا گیا یعنی طوفان آیا اور کافروں کو غرق کر ڈالا۔ اِس آیت کو سنتے ہی یہ اعرابی اسلام لے آیا۔ زمین و آسمان کے نام یہ شاہانہ جلال و ہیبت سے لبریز احکام صرف وہی ذات

جاری کر سکتی ہے جو آسمان و زمین کی خالق و مالک ہے جس نے تمام کائنات کو پیدا کیا اور سب پر اُسی کا تصرّف ہے۔

(۱۰) ایک مضمون یا قصّہ بار بار بیان کیا جائے سامعین اس سے بے لطفی اور انقباض محسوس کرنے لگتے ہیں۔ لیکن کلامِ الٰہی کی شان یہ ہے کہ ہر مضمون کے اعادہ اور آیت کے تکرار سے ایک نیا لطف اور عجیب لذّت و حلاوت محسوس ہوتی ہے۔ دُنیا میں کسی بشر کا کلام اس صفت کا ہرگز حامل نہیں ہو سکتا۔

(۱۱) دُنیا میں ہر فصیح و بلیغ اس بات سے عاجز ہے کہ ایک مضمون سے دوسرے مضمون اور ایک موضوع سے دوسرے موضوع کی طرف ایسے لطیف انداز میں منتقل ہو جائے کہ کلام کی حلاوت اور سلاست میں کوئی فرق نہ آئے۔ یہ خوبی اور خصوصیت جس سے دُنیا عاجز ہے صرف قرآنِ کریم کو حاصل ہے کہ مضمون کسی جگہ عقائد سے اخلاق کی طرف، کہیں احکامِ نکاح و طلاق سے صلوٰۃ و زکوٰۃ کی جانب کسی جگہ تعلیم اخلاق سے مفسدین کی سرکوبی اور کفّار سے جہاد کی جانب، کہیں عبادات سے معاشرت کی طرف، کہیں حدود و تعزیرات سے تقویٰ و طہارت کی طرف منتقل ہو رہا ہے۔ مگر کلام کے ربط اور تسلسل میں ذرّہ برابر فرق نہیں۔ حلاوت و لطافت میں قطعاً تفاوت نہیں۔ بلاشبہ تسلیم کرنا پڑے گا کہ قرآن کی یہ شانِ جامعیّت کلامِ الٰہی ہونے کا روشن ثبوت ہے جس سے تمام دنیا عاجز ہے۔ اور کلامِ الٰہی کی یہ عظمت و بلندی اُس مقام پر پہنچی ہوئی ہے کہ عقل کی پرواز سے بالا و برتر ہے۔

امام العصر حضرت مولانا انور شاہ قدس اللہ سرّہٗ اعجازِ قرآنی کے بیان میں ایک نہایت ہی بلند پایہ بات فرما گئے۔ حضرت شاہ صاحب کی یہ تحقیق آسمانِ علم کا ایک درخشاں ستارہ ہے۔ "فرمایا قرآنِ کریم میرے نزدیک من کل الوجوہ معجزہ ہے، اس کا اعجاز اس کے مفرداتؔ میں، ترتیبؔ کلمات میں اور اُس کے حقائق و معارف میں جاری و ساری ہے۔ غرض قرآن از روئے لفظ ترکیب و

ترتیب، اغراض و مقاصد اور حقائق و معارف ہر طرح معجزہ ہی ہے۔"

حضرت شاہ صاحب کے کلام میں از روئے مفردات قرآنِ کریم کا معجزہ ہونے کا یہ مطلب ہے کہ قرآنِ کریم الفاظ و کلمات کی تعبیر میں جس جگہ جو لفظ اختیار کرتا ہے وہ اس مقام پہ اس معنی اور حقیقت مقصودہ کو ادا کرنے میں اس قدر جامع اور بلیغ ہے کہ اس لفظ کے بجائے کوئی دوسرا لفظ جو اگرچہ اس کے ہم معنی ہو اس حقیقت کو واضح کرنے سے قاصر ہے۔ مثلاً موت کے لیے اہلِ عرب کے یہاں متعدد الفاظ استعمال کئے جاتے تھے :۔ الحتف، المنون، الحمام، الشعوب، السّام، القاضیہ، المنیۃ، الشجب۔ مگر قرآن نے ان الفاظ کے بجائے موت کے واسطے لفظ توفّی استعمال کیا۔ جیسے ارشاد ہے قُلْ يَتَوَفَّاكُمْ مَّلَكُ الْمَوْتِ الَّذِي وُكِّلَ بِكُمْ جس کے معنی کسی چیز کو پُورا پُورا لے لینا ہے۔ اِس لفظ توفی کو بجائے دیگر الفاظ کے اختیار کرنے کی وجہ یہ ہے کہ موت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ رُوحِ حیوانی جو تمام اجزاءِ جسم میں سرایت کی ہوئی ہے اس کو اجزاءِ جسم میں سے سمیٹ کر اس طرح پُورا پُورا نکال لینا کہ جسم کے کسی حصّہ میں ادنیٰ مادّۂ حیات باقی نہ رہے۔ جیسے کہ دھکتے ہوئے انگارے کے ایک ایک جز میں مادّہ آتشی سرایت کئے ہوئے ہو اور اس پر جب پانی ڈال دیا جائے تو اس کے ایک ایک ریزہ سے آتشی مادّہ حرارت نکل کر وہ بجھ جاتا ہے۔ تو موت کی اس حقیقت کو اس لفظ کے سوا کوئی دوسرا مترادف لفظ ادا نہیں کر سکتا تھا اور نہ اس سے زیادہ جامع تھا۔ اِس بنا پر قرآن نے اس لفظ کو استعمال کیا اور یہ لفظ اپنی انفرادی حیثیت سے اعجازِ قرآن کا پیکر بنا ہُوا ہے۔ نیز اس لفظ کو اختیار کرنے میں مشرکین کے اس اعتقاد باطل کی بھی تردید ہو گئی جو انہوں نے موت کے بارہ میں قائم کیا ہوا تھا کہ موت فناءِ محض اور عدمِ مطلق کا نام ہے تو اس کلمہ کو بول کر قرآن نے اس حقیقت کو روشن کر دیا کہ موت فنا محض اور اعدام کا نام نہیں بلکہ موت

کی حقیقت ارواح کے تعلق کو اجسام سے قطع کر دینا ہے کہ موت کی اصل حقیقت یہی ہے کہ حق تعالیٰ انسان کی رُوح اس کے جسم سے نکال کر کسی دوسرے مستقر کی طرف منتقل کر دیتا ہے پھر جب چاہے گا ان ارواح کو اپنے اجسام کے ساتھ جمع کر دے گا اور اُٹھا دے گا۔ اسی حقیقت کی طرف یہ کلمات رہنمائی کر رہے ہیں :۔ وَهُوَ عَلٰى جَمْعِهِمْ اِذَا يَشَآءُ قَدِيْرٌ (۲۹ - الشوریٰ)

الغرض لفظِ توفی نے جہاں موت کا مفہوم واضح اور متعیّن کیا اسی کے ساتھ مسئلہ بعث بعد الموت بھی حل کر دیا۔ تو یہ ہے اس ایک لفظ مفرد کی معجزانہ شان، جس سے ثابت ہو رہا ہے کہ تعبیرِ قرآنی میں ایک ایک لفظ بھی اپنے محلِ استعمال میں معجزہ ہے۔ اعجازِ مفردات میں یہ چیز بھی ہے کہ قرآنِ کریم بعض مقام پر ایک ایسا لفظ استعمال کرتا ہے کہ اگر وہی لفظ اس نظمِ قرآنی کے علاوہ کسی اور جگہ ہو تو وہ اپنے مترادفات کے درمیان کچھ زائد فصیح اور اہلِ ذوق کے نزدیک زیادہ لذیذ و شیریں محسوس نہ ہو۔ مثلاً لفظِ ضِيْزٰى جو آیت تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى میں آیا ہے اس کے ہم معنی لفظ جائرۃ اور ظالمۃ وغیرہ بھی ہیں۔ اور جائرۃ و ظالمۃ جیسے الفاظ بہ نسبت ضِيْزٰى کے زیادہ مستحسن اور لطیف ہیں۔ اس کے بالمقابل لفظِ ضِيْزٰى میں کچھ ثقل علی اللّسان اور کراہۃ فی السّمع (یعنی زبان پر بھاری اور سننے میں لطافت کی کمی) کی بھی آمیزش ہے۔ مگر یہ قرآنِ کریم کی معجزانہ شان ہے کہ یہ لفظ جب اس آیت میں استعمال کیا گیا تو اس قدر مناسب اور لطیف ہوا کہ اگر اس کے بجائے کوئی دوسرا کلمہ بولا جاتا تو اُس میں یہ خوبی نہ ہوتی جو اس لفظ میں ہے۔ کیونکہ یہ مضمون کُفارِ مکّہ کی بت پرستی اور اس سلسلہ میں ایک احمقانہ تقسیم کے بیان پر مشتمل ہے۔ بتوں کو اللہ کی بیٹیاں تجویز کیا اور خود اپنے حق میں بیٹی کو کسی حال میں بھی گوارا نہیں کرتے بلکہ بیٹے پسند کرتے ہیں۔ جیسے کہ فرمایا جا رہا ہے :۔ اَلَكُمُ الذَّكَرُ وَلَهُ الْاُنْثٰى کہ کیا تمہارے واسطے

بیٹے ہوں اور اللہ کے لیے بیٹیاں تو اس احمقانہ اور ظالمانہ تقسیم کو اس
سے تعبیر کیا گیا تِلْكَ اِذًا قِسْمَةٌ ضِيْزٰى۔ تو لفظ ضِيْ
اگرچہ ثقیل ہے لیکن یہ مقام نفرت و ناگواری کے جذبہ کے اظہار کا ہے ا
سے ایسا لفظ استعمال کیا گیا جو ہیبت ناک بھی ہے اور زبان پر ثقیل بھ
اور یہ چیز تعبیری محسّنات میں ہے کہ ناگوار بات کے اظہار میں بجائے لطیف
اور ملیح کلمات کے ثقیل اور ہیبت ناک لفظ ہی استعمال کیا جائے تاکہ
لفظ کا تلفّظ اور اس کی ہیئتِ لفظیہ بھی ناگواری کی کیفیّت کو لفظ میں
طرح رچا دے جیسے پھول کی پتیوں میں اُس کی خوشبو رچی ہوئی ہو اور
پر سنتے ہی تنفّر اور ہیبت کے آثار واقع ہو جائیں۔

بہرکیف سمجھ میں آیا کہ قرآنِ کریم کا استعمال کیا ہوا ایک ایک لفظ
معجزہ ہے۔ اور یہ ممکن نہیں کہ اِس لفظ کی جگہ کوئی دوسرا لفظ استعمال
جا سکے۔ اعجازِ قرآن باعتبارِ ترکیب و ترتیبِ کلمات یہ ہے کہ قرآن کر
تعبیر بھی اختیار کرتا ہے بحیثیتِ مجموعی اس مقصد کو ادا کرنے کے لیے
اور ترکیبِ کلمات بلاغت و خوبی رکھتی ہے۔ اور اگر اس ترتیب کو بدل
وہ بلاغت معنوی خوبی اور بلندی باقی نہ رہے گی جو قرآن کی اختیار کر
میں ہے۔ اگرچہ یہ تبدیلی الفاظِ قرآنیہ سے ہی کر دی جائے اور بظاہر دونو
کا مضمون بھی یکساں ہو لیکن پھر بھی جو لفظ قرآن نے جس جگہ بولے ہیں وہی
طریقہ سے مضمون متعلّق کو ادا کر سکتے ہیں۔ اور اگر ایک جگہ کا کوئی لفظ ہٹا
لفظ وہاں رکھ دیا گیا تو کلام کی وہ بلندی اور مقصد کی وہ عظمت باقی نہ
گی جس کو تعبیرِ قرآنی ادا کر رہی ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے
واقعہ میں قرآن کریم نے فرعون کے لشکر کے تعاقب پر قوم کی گھبراہٹ
پریشانی کا تذکرہ کیا کہ قوم کہنے لگی اِنَّا لَمُدْرَكُوْنَ کہ ہم تو پکڑ لیے گ
کے جواب میں حضرت موسیٰؑ کی قرآن نے یہ تعبیر بیان کی كَلَّا اِنَّ مَعِيَ

یہدِیۡنَ ؁ "۔ خبردار! (ہرگز ایسا نہیں) یقیناً میرا رب تو میرے
رہے ہے " تو اس طرح موسیٰ علیہ السّلام نے قوم کو تسلّی دی۔ اسی مضمون
ریب وہ الفاظ ہیں جو رسول اللہ صلّی اللہ علیہ وسلّم نے غارِ ثور میں حضرت
ر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کو تسلّی دیتے ہوئے فرمائے جب کہ کُفّارِ مکّہ کے تعاقب
بہ سے پریشان تھے اور کہہ رہے تھے یارسول اللہ! ایسا نہ ہو کہ کوئی
دیکھ پائے تو ہم پکڑ لیے جائیں۔ فرمایا :۔ لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا ۔
دونوں مقولے بظاہر ایک ہی مضمون ادا کر رہے ہیں لیکن حقیقت یہ ہے
رآنِ کریم نے جو تعبیر جس جگہ اختیار کی وہی اِس مقام کی صحیح غرض ادا
ہی ہے۔ اگر ہم ایک جگہ کی تعبیر دوسری جگہ لگا دیں یا ایک جگہ کے الفاظ بدل
دوسری جگہ لے جائیں تو وہ بلاغت اور معنوی بلندی ختم ہو جائے گی جس کو
کی ادا کردہ تعبیر ادا کر رہی ہے۔

حضرت موسیٰ علیہ السّلام کے جواب میں "کَلَّا" حرفِ تنبیہ ہے اور مَعِیَ
واحد مُتکلّم ہے۔ کیونکہ اُن کے مخاطب وہ لوگ تھے جن پر مایوسی غالب
ور رحمتِ خداوندی کے شاملِ حال ہونے کا اُن پر کوئی اثر نہ تھا۔ اس وجہ
اُن کے جواب میں یہی مناسب اور بلیغ ہُوا کہ تنبیہ کا عنوان اختیار کرتے
مَعِیَ کہا جائے۔ واحد متکلّم ضمیر کے ساتھ کہ خبردار میرے ساتھ تو میرا
ہے۔ برخلاف آنحضرت صلّی اللہ علیہ وسلّم کے جواب کے کہ آپ کے مخاطب
ت ابوبکر صدّیق رضی اللہ عنہ تھے، جو پیکرِ صداقت تھے اپنے دل میں ایمانِ محکم، اور
خداوندی کا یقینِ کامل لیے ہوئے تھے اور حضور صلّی اللہ علیہ وسلّم کی ادنیٰ
کا تصوّر بھی ان کے واسطے رنج وغم کا پہاڑ تھا تو اس موقعہ پر یہی
ن زیب دیتا تھا جو اختیار کیا گیا لَا تَحۡزَنۡ اِنَّ اللّٰہَ مَعَنَا "(اے
) غمگین نہ ہو۔ بے شک اللہ ہمارے ساتھ ہے " ابوبکر مُحبّ تھے نہ کہ
وسیٰ کی طرح خدا اور اُس کے رسول سے باغی اور رحمتِ خداوندی سے

مایوس تو ان کو اسی طرح مخاطب بنانا مناسب تھا کہ غم نہ کرو اور ضمیر جمع متکلم معنا میں اختیار کی گئی۔ کیونکہ یہاں مخاطب اور متکلم دونوں ہی رحمتِ خداوندی کے ساتھ ہونے پہ کامل یقین رکھتے تھے اس لیے یہاں یہی مناسب تھا کہ جمع متکلم کا عنوان اختیار کیا جائے۔ اور ظاہر ہے کہ یہ دونوں مقصد صرف یہی عنوان اختیار کر سکتے تھے جو اپنی اپنی جگہ اختیار کئے گئے۔ اگر ان دونوں مقام کی تعبیروں میں کچھ بھی تغیر کر دیا جائے یا ایک جگہ کا کوئی لفظ بدل کر دوسری جگہ رکھ دیا جائے تو بلاشبہ یہ مقصد اور معنوی خوبیاں فوت ہو جائیں گی۔ یہی وہ اعجازی شان ہے جو ترتیب اور ترکیب کلمات میں ہے۔ اسی طرح حضرت یوسف علیہ السلام کے قصہ میں امرأۃ عزیز (زلیخا) کا یوسف علیہ السلام کو اپنی جانب مائل کرنے کے بیان میں یہ تعبیر اختیار کی :- وَرَاوَدَتْهُ الَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا عَنْ نَّفْسِهٖ وَغَلَّقَتِ الْاَبْوَابَ وَقَالَتْ هَيْتَ لَكَ ط :- "یعنی اور پھسلایا یوسف کو ان کے نفس سے اس عورت نے کہ جس کے گھر میں وہ تھے اور دروازے بند کر لیے اور کہا کہ جلدی کر" (۳۳ - یوسف)

تو اپنی جانب بہلانے والی اس عورت کے لیے اور بھی بہت سی تعبیریں تھیں۔ اُس کا نام یا امراءۃ العزیز یا سیدۃ البیت وغیرہ اور امرأۃ العزیز عنوان تو خود قرآن نے آگے چل کر بولا بھی ہے۔ لیکن یہاں نام ولقب یا ایسا ہی کوئی اور مختصر عنوان اختیار کرنے کے بجائے :- اَلَّتِيْ هُوَ فِيْ بَيْتِهَا اختیار کیا جو ایک ایسے مقصد اور معنی کو ادا کر رہا ہے کہ کسی دوسرے عنوان سے ممکن نہ تھا۔ وہ یہ کہ مخاطب اس عنوان کے ذریعہ یہ جان لے کہ یوسف کو مائل کرنے والی کوئی حسین عورت نہ تھی کہ وہ صرف جنسی میلان اور طبعی دواعی وتقاضوں سے مائل کر رہی تھی۔ بلکہ پھسلانے والی تو وہ تھی جس کے گھر میں یوسف تھے خود اسی کی طرف سے اظہارِ رغبت و مدعی تھا۔ وہ گھر کی مالکہ بھی تھی، اس کے یہاں کی عطاؤں اور انعامات سے یوسف مرہونِ منت تھے۔ جن کا تقاضا تھا کہ وہ

اپنی محسنہ کی پیش کش سے بے رُخی نہ اختیار کریں۔ اُسی کے گھر میں تھے، تنہائی و خلوت بھی تھی اور اِن سب باتوں کے علاوہ نکلنے کے دروازے بھی بند کر دیئے گئے تھے۔ اِسی حد تک بس نہیں بلکہ اُس کے تقاضوں پر لبیک نہ کہنے پر تنبیہی عنوان بھی تھا، آخر آمادگی کیوں نہیں، جلدی کیوں نہیں کرتا؟ مگر اللہ اکبر! کیا عفّت و پاکدامنی کہ اِن تمام احوال اور اسباب کے جمع ہونے کے باوجود پیکرِ عفّت کا جواب تھا مَعَاذَ اللّٰہِ تو اس جگہ مقصدِ بیان حضرت یوسف کی عفّت و پاکدامنی تھی جو اس تعبیر میں جس عظمت و بلندی کے ساتھ ذکر کی گئی ممکن نہیں تھا کہ یہ شانِ عفّت و پاکدامنی کسی اور تعبیر سے ادا ہو سکتی۔ اور اگر اس تعبیر میں کسی بھی لفظ کی ترتیب میں ردّ و بدل کر دیا جائے تو یقیناً یہ حقائق و معارف ختم ہو جائیں گے۔ یہی وہ چیز ہے جس کو امام رازی رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں۔

ومن تأمّل لطائف النظم وبدائع ترتیبها علم ان القرآن کما انّه معجز بحسب فصاحة الفاظه وشرف معانیه فهو ایضا معجز بحسب ترتیبه ونظم آیاته۔ (تفسیر کبیر ص۲۶۲، ج ۲)	اور جو شخص نظمِ قرآنی کے لطائف اور آیاتِ قرآنیہ کی ترتیب اور اُس کے حقائق پر غور کرے گا وہ بالیقین یہ بات سمجھ لے گا کہ قرآن جس طرح اپنے الفاظ کی فصاحت اور شرفِ معانی کے لحاظ سے مُعجزانہ شان رکھتا ہے اسی طرح وہ ترتیب کلمات اور ربطِ آیات کے اعتبار سے بھی معجزہ ہے

قرآن کریم اسی طرح مقاصد کے اعتبار سے بھی درجۂ اعجاز رکھتا ہے مقاصدِ قرآن مبداء و معاد کی تحقیق۔ انسان کے معاد و معاش کی بہتری۔ دنیا و آخرت کے فلاح و نجاح کے اُصول۔ اصلاحِ عقائد، اعمال و اخلاق اور معاملات کے طریقے۔ صانع عالم، خالقِ کائنات کی معرفت۔ اُس کی ربوبیّت و توحید کی

تعلیم۔ دلائلِ نبوّت کا بیان اور یہ کہ خالقِ کائنات کی اطاعت انسانی فطرت کا تقاضا ہے۔ عبادت و بندگی کی ترغیب اور معصیت و نافرمانی پر وعید۔ دنیا کی بے ثباتی، جزا و سزا کا معیار۔ غرض یہ مقاصدِ قرآن ہیں جن کو قرآن کریم نے ایسے معجزانہ انداز کے ساتھ بیان کیا ہے کہ دنیا کا کوئی بلیغ سے بلیغ کلام ایسی پاکیزہ مؤثر اور محیّر العقول تعبیرات کے ساتھ ادا کرنے سے یقیناً عاجز ہے۔ قرآن نے اِن مقاصد کو کہیں ایجاز و اختصار سے اور کہیں تفصیل و توضیح اور کسی جگہ تمثیل و تشبیہ اور کنایات اور کسی مقام پر دلائل و براہین کے انداز میں اس طرح بیان کر دیا ہے کہ عقل و انصاف سے نظر کرنے والے مخاطبین کے لیے ایک ایک آیت ہی قلب و دماغ کو اُن مقاصد کے رنگ میں رنگ دینے کے لیے کافی ہے۔

حضرات سامعین! انتہائی اختصار کے باوجود بھی مَیں نے آپ کا کافی وقت لے لیا۔ قرآنِ کریم کے یہ وجوہِ اعجاز اور اُصول جو ذکر کیے گئے ابھی مزید تفصیل و تشریح کے متقاضی ہیں۔ مگر اُن کی تشریح بذاتِ خود ایک مفصّل کتاب یا مکمّل مقالہ کی حیثیت رکھتی ہے، اِس وجہ سے مَیں اس وقت اتنا ہی عرض کر دینا کافی سمجھتا ہوں کہ قرآنی معارف و حقائق اور وجوہِ اعجاز ایک ناپیدا کنار سمندر ہے۔ جس طرح کلماتِ رب کی یہ شان ہے :-

قُلْ لَّوْ كَانَ الْبَحْرُ مِدَادًا لِّكَلِمٰتِ رَبِّيْ لَنَفِدَ الْبَحْرُ قَبْلَ اَنْ تَنْفَدَ كَلِمٰتُ رَبِّيْ وَلَوْ جِئْنَا بِمِثْلِهٖ مَدَدًا ۝

کہ کہہ دیجیے (اے ہمارے پیغمبرؐ) اگر سمندر روشنائی ہو جائے میرے رب کے کلمات کے لیے تو سمندر ختم ہو جائے گا، قبل اس کے کہ میرے رب کے کلمات ختم ہوں۔ اگرچہ ہم لے آئیں ایک اور سمندر بھی اسی جیسا اس کے اضافہ کے لیے۔

بالکل اسی طرح اس کلامِ الٰہی کے حقائق و معارف اور معجزانہ خوبیوں کی بھی یہی شانِ عظمت اور برتری ہے۔ (بقیہ ص۱۳۷ پر)

مولانا سید حامد میاں صاحب
مہتمم و شیخ الحدیث جامعہ مدینہ لاہور

فضیلتِ قرآن

الحمد للہ رب العالمین والصلاۃ والسلام علی خیر خلقہ سیدنا ومولانا محمد وآلہ واصحابہ اجمعین ۔ اما بعد :-

فضیلت قرآن کریم اس درجہ زیادہ آئی ہے کہ جو آدمی قرآن پاک بغیر ترجمہ سمجھے بھی پڑھے یا سنے اسے ثواب حاصل ہوتا ہے اور سمجھ کر پڑھنے پر تو اور بھی زیادہ ہوتا ہے ۔

حضرت ابوذر غفاری رضی اللہ عنہ نبی کریم علیہ الصلاۃ والتسلیم سے روایت فرماتے ہیں ۔

انکم لا ترجعون الی اللہ بشئ افضل مما خرج منہ یعنی القرآن ۔ رواہ الحاکم وقال ہذا حدیث صحیح الاسناد ولم یخرجاہ ۔

مستدرک ج ۱ ص ۵۵۵

تم اللہ کے دربار میں اس چیز سے بڑی افضل کوئی چیز لے کر پیش نہیں ہو سکتے جو اس کی ذات پاک سے ظہور میں آئی ہو ۔ یعنی قرآن پاک ۔

قرآن پاک کلام اللہ ہے قائم بذاتہ تعالیٰ ہے ۔

احمد بن نصر رحمۃ اللہ علیہ تو قرآن پاک کے کلام اللہ اور غیر مخلوق ہونے میں اتنی بڑی آزمائش سے گذرے ہیں کہ شہید ہی کر دیئے گئے ۔ وہ حماد بن زید سفیان بن عیینہ اور امام مالک رحمۃ اللہ علیہم کے شاگرد تھے یحییٰ بن معین رحمۃ اللہ علیہ کے

استاذ تھے ۔ ان کو خود واثق نے قتل کیا تھا ۔

امام شافعیؒ اس فتنہ کی شدت سے پہلے مصر تشریف لے گئے تھے لیکن جب یہ فتنہ جنم لے رہا تھا تو وہ یہ فرمایا کرتے تھے ۔ القراٰن کلام اللہ غیر مخلوق و من قال مخلوق فھو کافر ۔ البدایہ ج ۱۰ ص ۲۵۴

پھر امام احمد بن حنبل اور احمد بن نصر مذکور الصدر رحمہما اللہ شدید امتحان سے گذرے ۔ یہ مسئلہ بہت مشکل ہے مگر یوں سمجھ لیجئے کہ جیسے اللہ تعالیٰ کی ذات قدیم ہے اسی طرح اس کی صفات بھی قدیم ہیں جنمیں اس کی صفت علم بھی ہے اور صفت کلام بھی ۔ قرآن پاک اس کا کلام ہے وہ بھی مخلوق نہیں ہے ہماری زبان جب ہم اس کی تلاوت کرتے ہیں تو وہ اس کلام کا محل ظہور ہوتی ہے ۔ اور کلام وہی کلام قدیم ہوتا ہے ۔ اللہ پاک اپنے کلام اور وحی کے ظہور کے لئے جو طریقہ چاہے اختیار فرما سکتا ہے ۔ چاہے طور پر درخت کو بنا لے چاہے فرشتہ کو ذریعہ بنا لے ۔ اور چاہے لوح محفوظ کو ۔

اُمت محمدیہ علی صاحبہا الصلاۃ والتحیہ کو یہ نعمت عظمیٰ عطاء ہوئی کہ وہ اپنی زبانوں کو اداء کلام الٰہی کے لئے استعمال کر سکیں ۔

ہم لوگ جب کسی کی کوئی بات نقل کرتے ہیں تو یہ کہتے ہیں کہ فلاں شخص نے یہ بات کہی ۔ اس کے یہ الفاظ تھے وغیرہ اور وہ قول اسی کی طرف منسوب کرتے ہیں ۔ اسی طرح قرآن پاک کی نسبت اللہ تعالیٰ کی طرف ہے ۔ اس لئے حدیث مذکور میں اتنی عظیم فضیلت وارد ہوئی ۔

ایک اور حدیث میں نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:

خیرکم من تعلّم القراٰن وعلّمہٗ :۔	تم میں بہترین وہ لوگ ہیں جو قرآن پاک کی تعلیم حاصل کرتے ہیں اور تعلیم دیتے ہیں ۔

ارشاد ہوا :۔

من قرأ القرآن فقد استدرج النبوة بين جنبيه غير انه لا يوحى اليه ۔ مستدرک ص۵۵۱

جس نے قرآن پاک پڑھ لیا اس نے (گویا علم) نبوت اپنے پہلوؤں میں سمو لیا۔ سوائے اس کے کہ اس پر وحی نہیں ہوتی۔

ارشاد فرمایا گیا:

لا حسد الا على اثنين۔ الحديث

یعنی قابل حسد و غبطہ تو دو قسم کے آدمی ہیں ایک وہ کہ جسے اللہ تعالیٰ نے قرآن پاک عطا کیا ہے وہ دن کے اوقات میں بھی اسے (عمل و تلاوت سے) قائم رکھتا ہے۔ اور رات کو بھی تلاوت کے لئے کھڑا رہتا ہے دوسرا وہ شخص جسے اللہ نے مال عطا کیا ہے اور وہ (اس کی خوشنودی کے لئے) دن اور رات کے اوقات میں صرف کرتا رہتا ہے

نبی کریم علیہ الصلاۃ والسلام نے ارشاد فرمایا:۔

من قرأ عشر ايات في ليلة لم يكتب من الغافلين ۔ مستدرک ص۵۵۵ ج۱

جو کسی شب دس آیتوں کی تلاوت کرلے وہ غافلوں میں نہیں لکھا جاتا۔

ایک حدیث پاک کے آخر میں ارشاد فرمایا گیا ہے:۔

اتلوا فان الله يأجركم على تلاوته كل حرف عشر حسنات۔ الحديث مستدرک ص۵۵۵ ج۱

قرآن پاک کی تلاوت کرو کیونکہ اللہ تعالیٰ تمہیں اس کی تلاوت پر ہر حرف پر دس نیکیاں عطا فرمائے گا۔ دیکھو میں یہ نہیں کہتا کہ الٓمٓ ایک حرف ہے بلکہ یہ الف اور لام اور میم ہیں (یعنی تین حرف ہیں)

جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے مثال کے لئے وہ آیت پیش فرمائی ہے

جس کا مطلب اُمت میں کسی کی بھی سمجھ میں قطعی طور پر تو آ نہیں سکتا۔ اور کوئی مطلب کی قطعی تعیّن کا دعوےٰ نہیں کر سکتا۔ لیکن اسکے باوجود ثواب کا وعدہ فرمایا گیا۔ جسکی ایک وجہ تو یہ کہ جب انسان کلام الٰہی ہونے کے اعتقاد سے ان کی تلاوت کرے گا تو ایمان و ایقان کی تازگی ہوگی۔ چاہے معنی نہ سمجھ میں آرہے ہوں۔ نیز جو بھی قرآن پاک تلاوت کرنے والا تلاوت کرے گا۔ اور دل میں یہ اعتقاد قائم رکھے گا تو یقیناً اس کی توجہ ذات باری تعالےٰ کی طرف ہوگی۔ اور جتنی دیر اس طرح خداوند کریم کی طرف پڑھتے یا سنتے وقت متوجہ رہے گا۔ کہ "یہ اس کا کلام ہے" اسے ہر توجہ پر اجر ملے گا اور اس کا خداوند کریم کی اس صفت عظیمہ سے اتصال رہے گا۔ بکثرت حفاظ ایسے ہی ہوتے ہیں جن کی نظر معانی تک نہیں پہونچتی۔ مگر اجر ان کو ملتا ہے ان کی ایمانی قوت بڑھتی ہے ان کی صورت سیرت اور معاملات سب ہی میں رفتہ رفتہ تقویٰ سرایت کرتا چلا جاتا ہے۔

حدیث شریف میں آتا ہے۔

الصیام والقرآن	روزہ اور قرآن پاک بندہ کی
یشفعان للعبد	شفاعت کرتے ہیں روزہ عرض کرتا
الحدیث۔	ہے کہ خداوندا میں نے دن میں
مستدرک ص ۵۵۴ ج ۱	اس کی مرغوب چیزوں اور کھانے
ھذا حدیث صحیح	سے اسے روکا تو تو اس کے حق
علی شرط مسلم۔	میں میری شفاعت قبول فرما۔

اور قرآن کہتا ہے کہ میں نے رات کو اسے سونے سے روکا تو دونوں کی شفاعت قبول کی جائے گی۔

اس لئے آپ صحابۂ کرام کے علاوہ بزرگانِ دین کے حالات میں شغف بالقرآن بہت پائیں گے۔

منصور بن المعتمرؒ چالیس سال دن میں روزہ سے رہے اور ساری رات

عبادت میں روتے رہتے تھے۔ صبح کو آنکھوں میں سرمہ لگا لیتے تھے اور سر پر تیل وغیرہ لگا کر اپنی حالت درست کر لیتے تھے۔ ان کی والدہ فرماتی تھیں کہ کیا تم نے ارتکابِ جرمِ قتل کیا ہے وہ عرض کرتے تھے کہ میں جانتا ہوں جو میرے نفس نے کر رکھا ہے۔ تذکرۃ الحفاظ للذہبی ص ۱۴۷ ج ۱

ابو مسہر فرماتے ہیں کہ امام اوزاعیؒ ساری رات نماز، تلاوت اور رونے میں گذار دیتے تھے۔ تذکرہ ص ۱۷۹ ج ۱

ابن ابی ذئبؒ کے بھائی ان کا حال بیان کرتے ہیں کہ ایک دن روزہ رکھا کرتے تھے ایک دن نہیں رکھتے تھے۔ پھر مسلسل روزہ رکھنے لگے۔

ان ہی کے بارے میں ہے۔ کہ ساری رات عبادت میں گذارتے تھے اور اگر ان سے یہ کہا جاتا کہ کل قیامت آنے والی ہے تو (وہ پہلے ہی سے اتنی عبادت کے عادی تھے کہ) ان کی عبادت میں اور زیادتی نہیں ہو سکتی تھی

وکیع رحمۃ اللہ علیہ حسن بن صالح رحمۃ اللہ علیہ کے بارے میں فرماتے تھے کہ انہوں نے ان کی والدہ نے اور بھائی نے رات کی عبادت آپس میں تین حصوں میں تقسیم کر رکھی تھی۔ جب والدہ کی وفات ہو گئی تو دونوں بھائیوں نے آدھی آدھی رات بانٹ لی۔ بھائی جن کا نام علی تھا۔ ان کی بھی وفات ہو گئی تو ساری رات خود حسن عبادت کیا کرتے تھے۔

ابو سلیمان دارانی حسن بن صالح رحمۃ اللہ علیہم کے بارے میں فرماتے ہیں۔ میں نے کسی پہ اتنا زیادہ خوف خدا نمایاں نہیں دیکھا جتنا ان میں دیکھا ہے کہ ایک شب انہوں نے علم یتساءلون شروع کی اسکا اثر ایسا ہوا کہ بیہوش ہو گئے۔ وہ فجر تک یہ سورت پوری نہ پڑھ سکے۔ تذکرہ ص ۲۱۶ ج ۱

امام ابو یوسف رحمۃ اللہ علیہ فرماتے ہیں کہ میں امام ابو حنیفہ رحمۃ اللہ علیہ کے ساتھ جا رہا تھا کہ ایک شخص نے دوسرے سے کہا کہ یہ ابو حنیفہ ہیں رات بھر نہیں سوتے۔ امام صاحب فرمانے لگے۔ کہ خدا کی قسم یہ مناسب نہیں ہے کہ لوگ میرے بارے

میں ایسی بات کہیں جو میں نے نہ کی ہو۔ تو اس کے بعد سے ان کے ساری رات نماز
دعاء اور گڑگڑانے میں گذرتی تھی۔ تذکرہ ص ۱۶۹ ج ۱

میں نے یہ چند واقعات ان اکابر کے نقل کئے ہیں جو علوم نبویہ کے حامل تھے اور
جن سے دنیا میں اسلام پھیلا اور ہم تک پہنچا۔ اللہ تعالیٰ ان کے درجات بلند فرمائے
ہمیں ان ہی کے راستہ پر چلا کر ہم سے اپنے دین کی خدمت لے اور ان کے ساتھ محشور
فرمائے۔

امام شافعی رحمۃ اللہ علیہ کی کثرت تلاوت بھی اسی طرح منقول ہے۔ قرآن پاک
کا یہ معجزہ ہے کہ ہمارے علاقہ میں بھی ایسے بچے موجود ہیں۔ جنہوں نے صرف سات
سال کی عمر میں قرآن پاک حفظ کر لیا۔ حالانکہ ان کی زبان عربی نہیں ہے نہ وہ عربی سمجھ
سکتے ہیں۔

اسی طرح بڑی عمر میں حفظ کرنے والوں کی بھی مثالیں موجود ہیں:۔
خود میرے والد ماجد نور اللہ مرقدہٗ نے ۶۴ سال کی عمر میں حفظ قرآن پاک کی
تمام مشاغل کے باوجود تکمیل فرمالی۔ رحمۃ اللہ رحمۃ واسعۃ۔

جلال الدین سیوطی رحمۃ اللہ علیہ نے ایک کتاب جو "احوال الموتیٰ والقبور" پر لکھی
ہے اس میں ایک روایت دی ہے جس کا مفہوم یہ ہے اگر کسی کی قرآن پاک کی تعلیم
پوری نہ ہونے پائی ہو اور موت آگئی ہو تو اللہ تعالیٰ اس کی تکمیل کے لئے فرشتہ مقرر
فرما دیتے ہیں جو اسے پورا کرا دیتا ہے۔

بعض لوگ قرآن پاک پڑھنا چاہتے ہیں۔ لیکن الفاظ باوجود کوشش کے ادا
نہیں کر پاتے ان کے بارے میں بخاری و مسلم میں روایت آتی ہے۔

والذی یتتعتع فیہ وھو	وہ آدمی جسے ادائیگی میں دشواری
علیہ شاق لہ اجران۔	ہوتی ہے اور اس میں مشقت
مسلم ص ۲۶۹ ج ۱	اٹھاتا ہے اس کو دوہرا اجر ملے گا۔

یہ دین سب ہی کے لئے ہے عربی ہوں یا عجمی کم استعداد کے ہوں یا کامل استعداد

کے اس لئے ثواب بھی سب ہی کے لئے ہوگا۔

قرآن پاک کی تلاوت سے ہر صدمہ میں سکون میسر آتا ہے حتیٰ کہ موت کے صدمہ میں بھی تلاوت سے سکون ہوتا ہے۔ اور سکون بہت زیادہ عطا ہو جائے کہ محسوس ہونے لگے تو وہ ہی سکینہ کہلاتا ہے۔ حضرت اُسید بن حضیر کو تو سکینہ متشکل بھی نظر آیا تھا جو بخاری مسلم شریف وغیرہ کی صحیح احادیث میں بیان فرمایا گیا ہے۔ مسلم ص ۲۶۹ ج ۱

مختلف سورتوں اور آیتوں کے یاد کرنے اور تلاوت کرتے رہنے کی احادیث میں جابجا تعلیم دی گئی ہے۔

ایک صحابی کو سورہ قُل ھُوَ اللّٰہُ سے محبت تھی۔ ارشاد فرمایا:

ان حبک ایاہ	تمہیں اس کی محبت جنت میں
ادخلک الجنۃ۔	لیجائے گی۔

سورہ فاتحہ۔ آیت الکرسی۔ سورہ بقرہ کی آخری آیات کی بہت فضیلتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔

پوری سورۂ بقرہ اور سورہ آل عمران کے بارے میں فرمایا گیا کہ اللہ کے دربار میں اپنے پڑھنے والے کی طرف سے عذاب سے مدافعت کریں گی۔

قُلْ ھو اللّٰہ قل اعوذ برب الفلق اور قل اعوذ برب الناس۔ کی فضیلتوں میں یہ بھی ہے کہ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سوتے وقت انہیں پڑھ کر اپنے مبارک ہاتھوں پر دم کرکے پورے جسم پر ہاتھ پھیر لیا کرتے تھے۔ اس عمل میں پیروی سنت کے ساتھ ساتھ اور بھی فوائد ہیں۔

سورۂ یٰسٓ سورۂ دخان۔ سورۂ ملک کی فضیلتیں بیان فرمائی گئی ہیں۔ سورۂ ملک عذاب قبر سے بچاتی ہے۔ سورہ ملک روزانہ پڑھنی علماء و سلف کا معمول چلا آرہا ہے۔

سورۂ کھف کی شروع کی تین آیات پڑھنے والا شخص دجال سے محفوظ

رہے گا اس سے سمجھ میں آتا ہے کہ ان آیات کے پڑھنے سے مکر و فریب اور چھوٹے وجالوں سے بھی انشاء اللہ حفاظت رہے گی۔ ہر شب سورۂ واقعہ کی تلاوت کی فضیلت بھی ارشاد فرمائی گئی اس میں ایک دنیوی نفع بھی ارشاد فرمایا گیا ہے کہ اس کا پڑھنے والا فاقہ سے محفوظ رہے گا۔

قرآن پاک جس کی عظمت کی تحدید نہیں کی جا سکتی۔ جب اتنا عظیم المرتبت ہوا تو اسی قدر اسکی تعظیم واجب ہوگی اور سرورِ کائنات علیہ الصلاۃ والسلام کے طریقے کو اس کے فہم کے وقت سب سے مقدم کرنا ہوگا۔ ورنہ اسی قدر عظیم خطرات بھی پیش آنے کا اندیشہ ہوگا۔

جب آپ حضرات عربی پڑھیں گے اور ترجمۂ قرآن پاک دیکھیں گے تو بہت سی جگہ لغت کے ترجمہ سے اکابر علماء کا ترجمہ ہٹا ہوا دیکھیں گے۔ اس کی وجہ یہی ہوتی ہے کہ شریعت مطہرہ نے اس لفظ کو خاص معنی میں استعمال فرمایا ہوتا ہے وہاں تک سوائے ان حضرات کے جو علم کی گہری بصیرت رکھتے ہوں دوسروں کی نظر نہیں جاتی۔

بخاری شریف میں تفسیر دیکھنے سے اس کا اندازہ ہوتا ہے۔

مثلاً عَمَّا كَانُوْا يَعْمَلُوْنَ کا ترجمہ تو یہ ہے کہ وہ جو کچھ کیا کرتے تھے۔ (اس کے بارے میں قیامت میں سوال ہوگا) لیکن امام بخاریؒ نے تفسیر کی ہے۔

عن قول لا الٰہ الا اللہ - یعنی ان سے قیامت کے دن لا الٰہ الا اللہ کے بارے میں سوال ہوگا۔

آپ کا جی چاہے گا کہ جہاں سہولت کی چیز ہو فوراً گنجائش نکالیں۔ یہ انسان کا نفس اپنی طرف کھینچتا ہے اس سے بچنا چاہیئے۔

امام اوزاعی رحمۃ اللہ علیہ۔ جن کے بارے میں حاکم فرماتے ہیں۔ کہ اوزاعیؒ اپنے زمانہ کے سب کے امام تھے۔ اور اہل شام کے خصوصاً۔ وہ فرمایا کرتے تھے:

خَمسَةٌ كان عليها الصحابة	پانچ باتوں پر صحابۂ کرام اور تابعین
وَالتابعون الخ	قائم رہتے تھے جماعت کے ساتھ

رہتے تھے (یعنی اقوال وعقائد میں) سنتؐ کی پیروی کرتے تھے مساجد آباد رکھتے تھے (یعنی جماعت وتلاوت وغیرہ مناسب کاموں سے جو مسجد میں ہوتے ہیں) ۳ تلاوت ۵ جہاد۔

اوزاعی فرماتے تھے:۔ آثار سلف پر قائم رہو چاہے تمہیں لوگ چھوڑ دیں۔ لوں کی رائے سے بچو اگرچہ وہ خوب عمدہ (مزین) ہو۔ معاملہ سب کھل جائے گا۔ تم ہی صراط مستقیم پر نظر آؤ گے۔

وہ فرماتے تھے:۔ جو علماء کی نادر باتیں جوڑتا ہے (اور راہ پیدا کرتا ہے) وہ سلام سے نکل جاتا ہے۔

یہ سب تذکرۃ الحفاظ جلد اوّل ص۱۸۰ سے ماخوذ ہے۔

قرآن پاک کی فضیلت کے بارے میں ایک روایت میں ارشاد فرمایا گیا ہے:

يَجِيءُ صَاحِبُ الْقُرْآنِ يَوْمَ الْقِيَامَةِ الحديث
مستدرک ص۵۵۴

اسی حدیث میں آتا ہے کہ اس سے فرمایا جائے گا۔ کہ پڑھتا جا اور درجات قرب میں) چڑھتا جا۔

اور اس کی ہر آیت پر ایک نیکی بڑھا دی جائے گی۔

سی مناسبت سے آخر میں تبرکاً ایک ایسے عالم ربانی کے دو واقعے لکھتا ہوں جو ت پر قائم اور مبلغ دین تھے۔ جو قرآن پاک کی سات متواتر قرائتوں میں ایک کے یں۔ ان کا اسم گرامی حمزہ ہے۔

خدا کی قدرت کہ حضرت عبداللہ بن مسعودؓ کی تعلیم اور حضرت علی کرم اللہ وجہہ دار الخلافہ بنانے سے کوفہ میں علماء صحابہ کی ساری دنیا کے مقامات سے زیادہ ثریت ہو گئی۔ قراء سبعہ میں سے تین کوفی ہیں جب کہ چار ساری دنیا کے مختلف امات میں تھے۔ اور قراء عشرہ میں سے چار کوفی ہیں اور چھ سارے عالم اسلام مختلف مقامات میں تھے۔ ان قراءتوں کے حق ہونے پر ہر مسلمان کا ایمان ہے۔ ہے وہ قاری ہو یا نہ ہو۔

اہل کوفہ میں ابوعبدالرحمٰن بن عبداللہ بن حبیب السلمی بھی ہیں انہوں نے حضرت عثمان غنی اور حضرت زید بن ثابت رضی اللہ عنہما سے بھی قراءت سیکھی تھی اور حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کو دو مرتبہ قرآن پاک سنایا۔ چالیس سال مسجد کوفہ میں پڑھاتے رہے حضرت علی کرم اللہ وجہہٗ کے حکم سے حضرت حسن اور حضرت حسین رضی اللہ عنہما نے ان سے قرآن پاک کی قراءت سیکھی۔ حالانکہ وہ تابعی تھے اور یہ حضرات صحابی تھے۔ امام عاصم نے حضرت علی کی قراءت ان ہی سے لی ہے یہی وہ قراءت ہے جسکے آگے راوی حفص ہیں (حفص عن عاصم)

حق ارشاد فرمایا : انا مدینۃ العلم وعلی بابھا۔

غرض حضرت حمزہ رحمۃ اللہ علیہ ان سات میں سے ایک ہیں۔ ان کے شاگرد سلیم بن عیسٰی کہتے ہیں کہ میں ان کے پاس پہونچا تو میں نے دیکھا کہ وہ اپنے رخسار زمین پر لگا رہے تھے۔ اور رو رہے تھے یہ اس حالت کو دیکھ کر ہکا بکا رہ گئے اور عرض کرنے لگے۔ کہ خدا آپ کو اپنی حفاظت و پناہ میں رکھے۔ یہ رونا کیسا ہے؟ وہ فرمانے لگے کہ میں نے گذشتہ شب یہ دیکھا۔ کہ قیامت آگئی ہے۔ اور کسی نے قرآن پاک کے۔ قرار کو بلایا تو میں بھی ان میں ہوں جو بلانے پر آئے ہیں۔

اتنے میں میں نے یہ سنا کہ کوئی شیریں گفتاری کے ساتھ یہ کہہ رہا ہے کہ یہاں وہ ہی داخل ہو جس نے قرآن پر عمل کیا ہو۔ میں یہ سن کر الٹے پاؤں لوٹ گیا تو مجھے کسی نے میرا نام لے کر آواز دی کہ حمزہ بن حبیب زیات کہاں ہے۔ میں نے کہا لبیک داعی اللہ اس پر ایک فرشتہ بڑھا اس نے کہا لبیک اللھم لبیک کہو۔ میں نے ایسے ہی کہا۔ مجھے ایک مکان میں داخل کر دیا گیا جس میں میں نے قرآن پاک تلاوت کرنے والوں کی آوازیں سنیں۔ میں ٹھہر گیا اور میں کانپ رہا تھا۔ میں نے آواز سنی کوئی کہہ رہا ہے کوئی خوف کی بات نہیں چڑھو اور پڑھو میں نے چڑھ کر ادھر اُدھر دیکھا تو میں نے محسوس کیا کہ میں سفید موتی کے ممبر پر ہوں ایک سُرخ یاقوت کی سیڑھی ہے اور ایک سبز زبرجد کی۔ کہا گیا کہ چڑھو اور پڑھو۔

میں چڑھا تو کہا کہ سورۃ الانعام پڑھو میں نے پڑھی اور مجھے یہ نہیں پتہ کہ میں کس کو سنا رہا ہوں۔ حتی کہ میں ساٹھویں آیت وھو القاھر فوق عبادہ پر پہنچا کہا اے حمزہ! کیا میں اپنے بندوں پر غلبہ نہیں رکھتا ہوں۔ میں نے کہا بلاشبہ فرمایا۔ صَدَقْتَ اِقْرَأْ۔ میں نے سورۃ اعراف پڑھی۔ حتی کہ اسکے آخر پر پہنچا تو میں آیت سجدہ پر سجدہ کرنے لگا۔ فرمایا کافی ہے چلو سجدہ نہ کرو۔

حمزہ تمہیں یہ قرارت کس نے سکھائی ہے میں نے کہا سلیمان نے کہا صَدَقَ سلیمان کو کس نے پڑھایا ہے میں نے کہا یحیٰی نے فرمایا صَدَقَ یحیٰی یحیٰی نے کس سے پڑھا ہے میں نے کہا ابو عبدالرحمٰن سے فرمایا صدق ابو عبدالرحمٰن ابو عبدالرحمٰن کو کس نے پڑھایا ہے میں نے کہا آپ کے نبی کے چچازاد بھائی علی بن ابی طالب نے، فرمایا۔ صدق علی۔ علی کو کس نے پڑھایا ہے میں نے کہا آپ کے نبی صلی اللہ علیہ وسلم نے فرمایا صدق نبیی میرے نبی کو کس نے پڑھایا ہے۔ میں نے کہا جبرئیل علیہ السلام نے۔ فرمایا جبرئیل کو کس نے پڑھایا ہے۔ میں اس کے جواب میں خاموش ہوگیا فرمایا کہو کہ تو نے۔ یہ میری زبان سے ادا نہ ہو سکا تو پھر دوبارہ تلقین فرمایا گیا۔ میں نے کہا۔ انت۔ قال صدقت یاحمزہ۔

اس کے بعد اکرام و انعام سے نوازا گیا۔ اس رویا کا حضرت حمزہ رحمۃ اللہ علیہ کی طبیعت مبارکہ پر غیر معمولی اثر تھا۔

اسی طرح ایک اور خواب میں حضرت حمزہ کو ارشاد ہوا کہ پڑھیں۔ انہوں نے تلاوت شروع کی حتی کہ سورہ طٰہٰ میں وانا اخترتک پر پہنچے تو خطاب ہوا وانا اخترناک۔ ہم نے تمہیں (بھی) چن لیا ہے۔ پھر پڑھنے کا حکم ہوا۔ تو میں نے پڑھا حتی کہ سورۃ یٰسٓ پڑھتے ہوئے میں نے آیت تنزیل العزیز الرحیم لام کے پیش سے پڑھی۔ حق تعالےٰ نے ارشاد فرمایا۔ تنزیلَ العزیزِ الرحیم اے حمزہ زبر سے پڑھو۔ یہی میرا کلام ہے۔ اسی طرح حملۃ العرش نے پڑھا ہے۔ اور ایسے ہی پڑھانے والوں نے پڑھایا ہے۔ پھر کنگن پہنائے گئے۔ اور فرمایا گیا

کہ یہ تمہارے قرآن پڑھنے پر دئے گئے ہیں۔ پھر کمر میں پٹکا پہنایا گیا اور فرمایا یہ تمہارے دن میں روزہ سے رہنے پر عطا ہوا ہے۔ پھر تاج پہنایا گیا اور فرمایا یہ تمہارے لوگوں کو پڑھانے پر ہے۔ حمزہ تنزیلک کا زبر نہ چھوڑنا۔

حضرت حمزہ کو خواب میں یہ رؤیت بلاکیف رہی ہے۔ اور کچھ حصہ مثالی بھی۔ لیکن یہ انعامات نہایت درجہ اخلاص پر اور قرآن پاک پر عمل پیرا ہونے سے ان پر فرمائے گئے۔

بعد میں آج تک اُن کا فیض تواتر سے جاری چلا آرہا ہے اور قیامت تک جاری رہے گا۔ قرآنی اعمال و اخلاق ہی سیرت رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم تھے حضرت عائشہؓ فرماتی ہیں کان خلقہ القرآن ۔ کہ قرآن پاک کے احکام اور تعلیمات ہی آپ کی عادت و اخلاق تھے۔ قرآن پاک پر عمل کے بارے میں یہ روایت پیش نظر رکھنی چاہیئے جو حضرت عبداللہ بن مسعود رضی اللہ عنہ جناب رسول اللہ صلی اللہ علیہ وآلہ وسلم سے سبعۃ احرف کی ایک تفسیر میں یہ روایت نقل فرماتے ہیں جس کا ایک حصہ یہ ہے :

زاجراً وامراً وحلالاً وحراماً ۔ الحدیث
مستدرک ص۵۵۳

زجر و امر حلت و حرمت محکم ومتشابہ اور امثال اتارے گئے ہیں۔ جو حلال ہے اسے حلال جانو جو حرام ہے اسے حرام جانو۔ جو تمہیں حکم دیا گیا ہے وہ کرو جس سے منع کیا گیا ہے اس سے باز رہو۔ جو مثالیں بیان فرمائی گئی ہیں ان سے عبرت پکڑو محکمات پر عمل کرو۔ متشابہات پر ایمان رکھو اور یہ کہو کہ ہم اس پر ایمان لائے سارا ہی کلام اللہ کے پاس سے آیا ہے۔

اللہ تعالیٰ ہم سب کو توفیق اعمال صالحہ اور اپنے قرب و رضا سے نوازے آمین و آخر دعوانا ان الحمد للہ رب العٰلمین ۔

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

شاہ ولی اللہ

اور

علوم القرآن

ازقلم

ڈاکٹر محمد مظہر بقا

(ایم اے، پی ایچ ڈی، فاضل دیوبند)

استاذ شعبۂ علوم اسلامیہ، جامعہ کراچی ۔

کسی شخصیت اور اس کے کارناموں کی اہمیت کو پوری طرح سمجھنے کے لئے ضروری ہے کہ اس دور کا کچھ تاریخی پس منظر ذہن میں رہے۔ اس لئے یہ ضروری ہے کہ شاہ ولی اللہ کے دور کے حالات مختصر طور سے بیان کر دیئے جائیں۔

شاہ ولی اللہ کا دور سیاسی معاشرتی اور علمی اعتبار سے مسلمانوں کے انحطاط کا دور ہے۔

سیاسی پس منظر

شہنشاہ اورنگ زیب عالمگیر کی وفات سلطنت مغلیہ کے انحطاط اور ہندوستان کی سیاسی تباہی کا نقطۂ آغاز تھی۔ اورنگ زیب کی وفات کے وقت شاہ صاحب کی عمر تقریباً چار سال تھی۔ شاہ صاحب نے گیارہ بادشاہوں کا زمانہ پایا اور ان میں سے

کسی کو بھی پورے اطمینان کے ساتھ حکومت کرنے کا موقع نہ ملا۔ تورانی اور ایرانی امرار باہم مخاصم تھے۔ سادات بارہہ نے فرخ سیر کے برسر اقتدار آنے کے بعد سے محمد شاہی عہد تک محض اپنے اقتدار کی خاطر سلطنت مغلیہ کو نو سال تک نقصان پہنچایا۔ روہیلوں نے بھی بقول ہاشمی فرید آبادی (۱) سلطنت کی بوسیدہ عمارت کی اینٹیں اکھاڑنے اور انہیں ملبہ کا ڈھیر بنانے میں حصہ لیا۔ مسلمانوں کی باہمی آویزش کی وجہ سے غیر مسلموں کے حوصلے بڑھے اور مرہٹوں کا زور اتنا بڑھا کہ اُن کے سپہ سالار بھاؤ نے اگست ۱۷۶۰ء میں لال قلعہ پر قبضہ کر لیا۔ (۲) اور مرہٹوں کو ابدالی سے جو جنگ درپیش تھی اگر انہیں اسکے فیصلہ کا انتظار نہ ہوتا تو اسی وقت دلی کا تخت مرہٹوں کے قبضہ میں چلا جاتا۔ سکھوں اور جاٹوں کا زور کس حد تک بڑھ گیا تھا اس کا ذکر خود شاہ ولی اللہ نے بھی فرمایا ہے۔ (۳) نادر شاہی حملہ نے بھی مسلمانوں کو مزید کمزور اور دشمنوں کو مزید قوی کیا۔ خود شاہ صاحب لکھتے ہیں خدا سے پناہ مانگتا ہوں اس بات سے کہ نادر شاہ کی طرح عمل ہو کہ وہ مسلمانوں کو زیر و زبر کر گیا۔ اور مرہٹے اور جاٹ کو سالم و غانم چھوڑ کر چلتا بنا۔ (۴) بالآخر خود شاہ صاحب نے بھی احمد شاہ ابدالی کو ہندوستان پر حملہ کی دعوت دی۔ (۵) مرکز کی کمزوری کے نتیجہ میں ۱۷۵۷ء / ۱۱۷۰ھ میں سراج الدولہ کے مقابلہ میں پلاسی کی جنگ جیت کر انگریز بنگال پر قابض ہو گئے

معاشرتی پس منظر

جب سیاست تباہ ہو تو معاشرت بھی ابتری کا شکار ہوتی ہے۔ چنانچہ شاہ صاحب کے زمانہ کے معاشرتی حالات بھی ناگفتہ بہ تھے اس لئے سلاطین، امراء اور ارکان

(۱) تاریخ مسلمانان پاک و بھارت، ہاشمی فرید آبادی، انجمن ترقی اُردو پاکستان، ۱۹۵۳ء ج ۲ ص ۳۸

(۲) سیر المتاخرین طباطبائی، غلام حسین، نولکشور بار دوم ۱۳۱۴، ج ۳ ص ۹۱۲

(۳) سیاسی مکتوبات خلیق احمد نظامی مکتوب دوم " ۹۹ - ۱۰۴ (۴) ایضاً ص ۱

دولت، فوجی سپاہی، اہل صنعت و حرفت، مشائخ کی اولاد، دین میں تنگی پیدا کرنے والے واعظ، گوشہ نشین زاہد اور عام امّت مسلمہ ان میں سے ہر ایک کو شاہ صاحب نے ان کی کوتاہیوں پر متنبہ کر کے اصلاح کی جانب متوجہ کیا ہے جس کی تفصیل تفہیمات میں موجود ہے۔ (۱)

علمی پس منظر مولانا عبدالحی لکھتے ہیں (۲)، محمد بن قاسم کے فتح سندھ کے بعد سے چار صدیوں تک ہند میں حدیث کا چرچا رہا لیکن جب عربی سلطنت کی جگہ غزنوی سلطنتوں نے لے لی اور لوگ خراسان اور ماوراء النہر سے آنے لگے۔

تو حدیث عنقا ہو گئی اور اس کی جگہ لوگوں پر نجوم، فنون ریاضیہ اور علوم دینیہ میں سے فقہ اور اصول فقہ غالب آ گئے۔ ہمایوں کے بعد ایرانی علماء کی آمد کی وجہ سے نصاب تعلیم میں معقول، فلکیات اور ریاضیات کا پلہ بھاری ہو گیا تاہم بحیثیت مجموعی نویں صدی ہجری کے آخر تک ہندوستان میں فقہ اور اصول فقہ کا غلبہ رہا۔ لیکن جب امیر فتح اللہ شیرازی (ف ۹۹۷ھ/۱۵۸۸ء) نے دوانی شیرازی اور مرزا جان ایرانی متاخرین کی کتابیں ہندوستان لا کر درس میں داخل کیں تو اس وقت سے یہاں منطق اور فلسفہ کو قبول عام حاصل ہو گیا (۳) اور وہیلوں پر فقہ کا غلبہ تھا۔ حدیث سے بُعد اور فقہ حنفی پر جمود کی جو کیفیت تورانیوں میں تھی روہیلوں نے اس میں مزید اضافہ کیا۔

اس دور کے علمی حالات کے واضح نقوش خود شاہ صاحب کی تحریروں میں بھی موجود ہیں۔ شاہ صاحب نے اس سلسلہ میں جو کچھ لکھا ہے اس کا خلاصہ

---

(۱) التفہیمات الالٰہیہ، مدینہ برقی پریس، بجنور، مجلس علمی، ڈابھیل، ۱۳۵۵ھ/۱۹۳۶ء صفحہ ۱۵

(۲) الثقافۃ الاسلامیۃ فی الہند، الحسنی عبدالحی، المجمع العلمی، دمشق ۱۳۷۷ھ ۱۹۵۸ء، ص ۱۵۔

(۳) الثقافۃ الاسلامیۃ ص ۱۵

یہ ہے کہ ہر شخص اپنی رائے کا متبع ہے لوگ متشابہات میں خوض سے بھی باز نہیں آتے ہر شخص احکام کے معانی اور اسرار میں خوض کرتا ہے اور اس خوض میں اس کا میلان معقولات کی جانب ہوتا ہے۔ مسلمانوں میں یونانی علوم کا اختلاط ہو گیا ہے۔ معقولی دقیقہ شناس ہیں۔ لیکن فیض الٰہی سے بہت دور ہیں۔ مستحدث علوم میں مشغول ہو کر انبیاء کی میراث سے محروم ہیں۔ ایک جماعت ایسی ہے جس نے ورق گردانی کے طور پر مشکوٰۃ کا مطالعہ کر لیا ہے۔ اور ان کے دماغوں میں شکوک وشبہات قائم ہو گئے ہیں۔ (۱)

شاہ صاحب نے خاص طور پر طالبان علم کو اس طرح مخاطب فرمایا ہے کہ اے علم کے طالبو! اے بے وقوفو!

تم اپنے آپ کو علماء کہلواتے ہو تم یونانیوں کے علوم اور نحو صرف اور معانی میں مشغول ہو اور سمجھتے ہو کہ علم اس کا نام ہے۔ حالانکہ علم یا تو کتاب اللہ کی آیت محکمہ ہے یا سنت قائمہ (حضور کے طریقے) یا فریضۂ عادلہ (احکام) البتہ سیر اور صحابہ وتابعین کے وہ قصے جن سے آخرت کی طرف توجہ ہوتی ہو وہ مستزاد ہیں لیکن جن علوم میں تم مشغول ہو یہ آخرت کے علوم نہیں دنیا کے علوم ہیں۔ تم اگلے فقہاء کے استحسانات میں ڈوب گئے ہو تمہیں یہ نہیں معلوم کہ حکم وہ ہے جو اللہ اور اس کے رسول نے دیا ہے۔ تم میں سے اکثر حدیث پر عمل نہیں کرتے اور کہتے ہیں کہ ہمارا عمل تو فلاں کے مذہب پر ہے۔

اللہ کی مرضی یہ ہے کہ تم ابتداء ہی سے اللہ کی کتاب اور اس کے رسول کی سنت میں اشتغال رکھو اور اللہ کی یہ مرضی بھی ہے کہ اگر تم ان علوم میں مشغول ہو جو آلہ کی حیثیت رکھتے ہیں تو صرف یہ سمجھ کر کہ وہ آلہ ہیں نہ یہ سمجھ کر کہ وہ مستقل ہیں (۲)

(۱) التفہیمات الالٰہیہ ج ۱ ص ۸۲-۸۳ "قرۃ العینین فی تفضیل الشیخین مجتبائی دہلی ص ۱۶۱، ص ۲۹۳ (۲) التفہیمات ج ۱ ص ۲۱۴-۲۱۵

(۳) الثقافۃ الاسلامیہ ص ۱۵۔

بہرحال شاہ صاحب کی تحریروں سے معلوم ہوتا ہے کہ قرآن وحدیث کی طرف لوگوں کو کوئی توجہ نہ تھی اور ان کے مقابلہ میں لوگ صرف، نحو اور معانی کے ساتھ ساتھ زیادہ تر یونانی حکمت اور فقہ میں منہمک تھے۔

شاہ ولی اللہ اور ان کے علمی اور اصلاحی کارنامے

شاہ ولی اللہ محدث دہلوی رحمۃ اللہ علیہ بتاریخ ۴ شوال ۱۱۱۳ھ (۱۰ فروری ۱۷۰۳ء) بروز چہارشنبہ بوقت طلوع آفتاب قصبہ پھلت میں پیدا ہوئے (۱)۔ اور ۲۹ محرم ۱۱۷۶ھ (۲۰ اگست ۱۷۶۲ء) بوقت ظہر اکسٹھ سال چار ماہ کی عمر میں وفات پائی۔ (۲)

شاہ صاحب نہ تو علمائے سو کی طرح دین سے غافل ہیں اور نہ عام علمائے حق کی طرح دنیا سے بے خبر، نہ علمائے ظاہر کی طرح وہ روح شریعت سے ناآشنا ہیں اور نہ جاہل صوفیاء کی طرح شریعت سے غافل وہ اپنے زمانہ کے مجدد ہیں اور ہر مجدد کی طرح ان کا ہاتھ بھی زمانہ کی نبض پر ہے۔ ظاہری اور باطنی علوم میں مہارت کے ساتھ ساتھ وہ دُنیا کے حالات اور اپنے زمانہ کی سیاست میں بھی کامل بصیرت رکھتے ہیں۔

شاہ صاحب نے "تو بازمانہ بساز" کے بجائے "تو بازمانہ ستیز" کی روش اختیار کی اور حالات کے بہاؤ کے ساتھ بہنے کے بجائے دھارے کا رُخ راہ راست کی طرف موڑا۔

زمانہ کو راہ راست پر لانے کے لئے انہوں نے وہی صورت اختیار کی جو اپنے زمانہ کا ہر مجدد کرتا ہے۔ یعنی اسلام میں جب بھی غیر اسلامی عناصر کی آمیزش اور بدعات کا شیوع ہوا تو ہر مجدد نے یہی محسوس کیا کہ اس کے اصلاح کی صورت قرآن وحدیث اور قرون اولیٰ کی طرف رجوع کے سوا کچھ نہیں۔

(۱) الجزء اللطیف (مشمولہ انفاس العارفین) مطبع احمدی دھلی۔ ص ۲۰۲۔

(۲) مقالات طریقت (المعروف بہ فضائل عزیزی) عبدالرحیم ضیاء مطبع تین کرتان حیدرآباد دکن، ۱۳۹۲ھ ص ۴۰

شاہ صاحب نے جو تعمیری اور تنقیدی کام کیا ہے اس میں وہ دوسرے مجددین سے اس حیثیت سے منفرد ہیں کہ انہوں نے اسلام کے پورے فکری، اخلاقی، شرعی اور تمدنی نظام کو ایک مرتب صورت میں پیش کیا ہے۔ (۱)

قرآن کریم تک عوام کی براہ راست دسترس کے لئے انہوں نے اس کا فارسی ترجمہ کیا۔ حدیث کے درس کو عام کر کے اور اس سے متعلق کتابیں لکھ کر انہوں نے خواص وعوام کو دین کے دوسرے اصل سرچشمہ کی طرف متوجہ کیا، مکتوب مدنی اور شرح رباعتین جیسے رسالے لکھ کر انہوں نے صوفیاء کے دو مخالف وجودی اور شہودی گروہوں کے درمیان مفاہمت کی کوشش کی۔ فلسفیانہ انداز میں تصوّف کی بعض کتابیں لکھ کر انہوں نے یونانی فلسفہ کے خوگر دماغوں کو اسلامی فلسفہ کی جانب متوجہ کیا۔ حجۃ اللہ البالغہ جیسی معرکۃ الآراء کتاب لکھ کر انہوں نے عقلیت زدہ اور شکوک وشبہات اور اوہام میں گرفتار دماغوں کو تشریع کے اصول اور شرعی احکام کے اسرار ومصالح سمجھائے۔ ازالۃ الخفاء لکھ کر انہوں نے شیعہ اور سنی فرقوں کو معقول رد یا اور علمی نقطۂ نظر پر آمادہ کرنے کی کوشش کی۔ اور فقہی جمود کو توڑ کر اور حدیث کو معیار بنا کر اس کے مطابق مسلک اختیار کرنے کی دعوت دی۔

شاہ صاحب کا علمی اور اصلاحی کام اگرچہ ہمہ گیر ہے لیکن قرآن وحدیث کو جو اسلام کے بنیادی سرچشمے ہیں شاہ صاحب نے زیادہ اہمیت دی ہے۔

شاہ ولی اللہ کو اللہ نے موجودہ علوم میں سے ہر علم میں بہرۂ وافر عطا فرمایا تھا۔ تفسیر، حدیث، کلام، فقہ، نحو ولغت، معانی وبیان، فن قرأت اور تصوّف ان تمام علوم میں انہیں خود ان کی تصریح کے مطابق (۲) اجتہاد فی المذہب جیسا درجہ حاصل تھا۔ اور ان میں سے کوئی علم ایسا نہیں جس میں قرآن سے استشہاد نہ کیا جاتا ہو۔ لیکن قرآن کریم سے براہ راست انہیں خصوصی شغف تھا۔ چنانچہ ایک جگہ قرآن کریم سے اپنے خصوصی تعلق کا اظہار ان الفاظ میں کرتے ہیں کہ "مردماں

ا۔ الفرقان شاہ ولی اللہ نمبر، مقالہ، مولانا ابوالاعلیٰ مودودی، ص ۱۰۳

چنانکہ در قرآن متلذذ می شوند در حدیث نہ و ما را ہم چنانکہ در قرآن معنی ہائے عجیب دست می دہد و آمدی باشد در حدیث نہ،، (لوگوں کو قرآن میں جو لطف آتا ہے وہ حدیث میں نہیں آتا اور ہمیں بھی قرآن میں جو عجیب و غریب معنی حاصل ہوتے ہیں۔ اور جو آمد ہوتی ہے یہ کیفیت حدیث میں نہیں ہوتی۔

ایک جگہ فرماتے ہیں "اگر درست پرسی من شاگرد بے واسطہ قرآن عظیم چنانکہ اویس روح پر فتوح حضرت رسالتم صلے اللہ علیہ وسلم مانند آنکہ مستفید بے واسطہ کعبہ حسنی ام شبیہ آنکہ اثر پذیر بے واسطہ صلواۃ عظمی ام۔،،(۱) اگر سچ پوچھو تو میں قرآن عظیم کا بے واسطہ شاگرد اسی طرح جس طرح حضرت رسالت صلی اللہ علیہ وسلم سے مجھے اویسی نسبت ہے اور جس طرح جن کعبہ حسنی سے بلاواسطہ مستفید ہوں اور جس طرح میں صلوۃ عظمی سے بے واسطہ اثر پذیر ہوں۔

ایک اور جگہ فرماتے ہیں از جملہ منن عظمی بر این ضعیف آن بود کہ چند بار در مدرسہ قرآن عظیم تدبر معانی و شان نزول در رجوع بتفاسیر بخدمت ایشاں حاضر شدم و ایں معنی سبب فتح عظیم افتاد و الحمد للہ(۲) (اللہ نے مجھ پر جو عظیم احسانات فرمائے ہیں ان میں سے ایک یہ بھی ہے کہ مجھے مدرسہ چند بار والد بزرگوار سے معانی میں تدبر اور شان نزول اور تفاسیر کیطرف رجوع کے ساتھ قرآن پڑھنے کا موقع ملا جو عظیم کشادگی کا سبب بنا۔ اللہ کا شکر ہے۔

قرآن کریم سے متعلق شاہ ولی اللہ کی خدمات

شاہ ولی اللہ نے قرآن اور علوم قرآن سے متعلق جو خدمات انجام دی ہیں وہ تین ہیں۔

(۱) فتح الرحمن کے نام سے قرآن کریم کا فارسی زبان میں ترجمہ، اس کا مقدمہ اور اس کے ضروری حواشی۔

(۱) ایضاً ص ۳۵ (۲) الجزء اللطیف ص ۲۰۳

(۲) علوم القرآن اور اصول تفسیر سے متعلق الفوز الکبیر۔
۳۔ قرآن کریم میں مذکور خوارق کو فہم عام سے قریب کرنے کے لئے تاویل الاحادیث۔

ان میں سے فتح الرحمٰن اور تاویل الاحادیث ۱۱۵۱ھ تک تصنیف کی جا چکی تھیں اور الفوز الکبیر ۱۱۵۱ھ کے بعد کی تصنیف ہے[1]۔

علم تفسیر میں شاہ صاحب کا جو مقام ہے۔ اس کا ذکر کرتے ہوئے محمد محسن ترہتی لکھتے ہیں۔

انہ لنعم الترجمان لکتاب اللّٰہ۔(۲) (وہ کتاب اللہ کے بہترین ترجمان ہیں) اسی طرح الفوز الکبیر کا ذکر کرتے ہوئے اصول تفسیر میں شاہ صاحب کے مقام کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں۔ اما اصول التفسیر فکتابہ فیہا شاھد صدق علی براعتہ علی کثیر من اھلہا والحق انہ منفرد بتحقیق ھذا الفن (۳) (اصول تفسیر میں شاہ صاحب کی کتاب الفوز الکبیر اس امر پر شاہد صدق ہے۔ کہ اصول تفسیر پر جن حضرات نے کام کیا ہے، وہ ان میں اکثر پر فائق ہیں۔ اور حق یہ ہے۔ کہ اس فن کی تحقیق میں منفرد ہیں)

تاویل الاحادیث کا ذکر ان الفاظ میں کرتے ہیں "ھو کتاب منفرد فی بابہ حجمہ صغیر و معناہ کبیر لا یوازیہ شئ من مؤلفات عظام لکبار اعلام فی علوم القرآن" (۴) یہ اپنے باب میں منفرد کتاب ہے، اس کا حجم صغیر لیکن معنی کبیر ہیں علوم قرآن میں بڑے بڑے لوگوں کی جو ضخیم مؤلفات ہیں ان میں کوئی تالیف اسکا مقابلہ

---

[1] تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے راقم الحروف کی کتاب "اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ" ادارۂ تحقیقات اسلامی" اسلام آباد، نومبر ۱۹۷۳ء

(۲) الیانع الجنی مرتبہ محسن محمد (بر حاشیہ کشف الاستار عن رجال معانی الآثار) جید برقی پریس دہلی دارالاشاعت والتدریس دیوبند ۱۳۴۹ھ۔ ص ۷۸ (۳) ایضاً (۴) ایضاً

نہیں کرتی ۔

فتح الرحمٰن

فتح الرحمٰن کے نام سے شاہ صاحب نے قرآن کا جو ترجمہ کیا ہے۔ اس کی ابتداء سفر حرمین سے قبل ہوئی ۔ زبر اوین سورۂ بقرہ و سورۂ آل عمران) کے ترجمہ تک نوبت پہنچی تھی ۔ کہ سفر حرمین کی وجہ سے سلسلہ منقطع ہو گیا کئی سال بعد جب ایک شاگرد نے ترجمہ کے ساتھ قرآن پڑھنا شروع کیا تو شاہ صاحب نے دوبارہ ترجمہ کی تسوید شروع کر دی ۔ اور روزانہ جتنا پڑھاتے گئے اتنا لکھتے گئے ۔ ثلث قرآن کے ترجمہ تک نوبت پہنچی تھی کہ اس شاگرد کے سفر کی وجہ سے سلسلہ پھر منقطع ہو گیا ۔ مدت کے بعد یہ سلسلہ دوبارہ شروع ہوا اور قرآن کے دو تہائی حصہ کا ترجمہ ہو گیا۔ اس مرحلہ پر پہنچ کر شاہ صاحب نے روز عید الاضحیٰ ۱۱۵۰ھ سے اس کی تبییض شروع کر دی اور جب اتنے حصہ کی تبییض ہو گئی جس کی تسوید ہو چکی تھی یعنی دو تہائی قرآن تو پھر شاہ صاحب نے باقی حصہ کا ترجمہ بھی مکمل کر دیا ۔ اوائل شعبان ۱۱۵۱ھ میں اس کے مسودہ کی تکمیل ہوئی اور اوائل رمضان ۱۱۵۱ھ میں اسکی تبییض مکمل ہوئی اور خواجہ محمد امین کشمیری کی درخواست پر ۱۱۵۶ھ سے اس کا باقاعدہ درس شروع ہوا۔ (۱) گویا فتح الرحمٰن سفر حجاز سے قبل شروع ہو کر ۱۱۵۱ھ میں چار فرصتوں میں مکمل ہوئی۔ اس کی تکمیل کے وقت شاہ صاحب کی عمر تقریباً ۴۸ سال تھی ۔

فتح الرحمٰن فارسی زبان میں قرآن کریم کا سب سے پہلا ترجمہ نہیں ۔ اس سے قبل بھی فارسی زبان میں قرآن کے متعدد تراجم ہو چکے تھے ۔ شاہ صاحب مقدمہ فتح الرحمٰن (۲) میں خود لکھتے ہیں ۔ کہ جب میں نے فارسی میں قرآن کریم کے ایسے ترجمہ کی ضرورت محسوس کی جس کی زبان سلیس اور متداول ہو اور اس میں تکلف ، تصنع اور غیر ضروری قصص اور توجیہات نہ ہوں تو میں نے تراجم کی تفتیش شروع کی تاکہ اگر اس معیار کے مطابق کوئی ترجمہ مل جائے تو اس

(۱) مقدمہ فتح الرحمٰن ص (ب) (۲) ص ب

کو رائج کروں بعض میں اکتا دینے والا اطناب تھا اور بعض میں خلل ڈالنے والا ایجاز اور کوئی ایک ترجمہ بھی مقررہ معیار پر پورا نہ اترا تو میں نے خود ترجمہ کرنے کا مصمم ارادہ کرلیا۔

شاہ صاحب نے فتح الرحمٰن کے کچھ حواشی بھی تحریر کیے تھے، جو اصل کے ساتھ چھپے ہوئے ہیں۔ اور بقول مولانا عبدالحی ان حواشی کو انہوں نے ایک رسالہ کی شکل میں بھی جمع کرلیا تھا[1]

ترجمہ اور حواشی کے سلسلہ میں شاہ صاحب نے امام غزالی کی تفسیر الوجیز اور جلال الدین محلی وسیوطی کی جلالین کو پیش نظر رکھا ہے۔ چنانچہ مقدمہ میں خود لکھا ہے کہ الوجیز اور جلالین اس ترجمہ کے لئے بمنزلہ اصل کے ہیں[2]

مولانا رحیم بخش دہلوی نے اپنے ایک فاضل ہم عصر کے حوالہ سے لکھا ہے کہ قرآن کریم کے ترجمہ پر کٹ ملّا شاہ صاحب کے مخالف ہو گئے اور ایک روز بعد نماز عصر مسجد فتحپوری کے دروازہ کے باہر انہیں قتل کے ارادہ سے گھیر لیا، لیکن شاہ صاحب جرأت کے ساتھ ان کے مجمع سے نکل گئے[3]

یہ ترجمہ کن خصوصیات کا حامل ہے اس کا ذکر خود شاہ صاحب نے مقدمہ میں کیا ہے۔ اور اس کے حسب ذیل امتیازات بتائے ہیں۔

۱۔ نظم قرآن کا اسی مقدار کے بقدر متعارف فارسی میں ترجمہ کیا گیا ہے۔

---

[1] نزہۃ الخواطر، الحسنی عبدالحیؒ دائرۃ المعارف العثمانیۃ، حیدرآباد (دکن)، الطبقۃ الاولیٰ، ۱۳۷۶ھ/۱۹۵۷ء ج ۶ ص ۴۰۸ [2] ص ج

[3] حیات ولی، رحیم بخش دہلوی، مکتبہ سلفیہ لاہور، ۱۹۵۵ء ص ۲۱۹-۲۲۰۔ فاضل ہم عصر نے اس واقعہ کو سفر حرمین کا سبب بتایا ہے۔ شاہ صاحب نے سفر حرمین سے قبل زہراوین کا ترجمہ کرلیا تھا، اس لئے ممکن ہے یہ واقعہ پیش آیا ہو لیکن اس روایت میں ایک بات ایسی ہے جو اسے ناقابل اعتبار بنا دیتی ہے۔ وہ یہ کہ فاضل ہم عصر نے یہ بھی لکھا ہے کہ جب شاہ عبدالعزیز کو اس واقعہ کا علم ہوا تو انہیں بہت رنج ہوا اور سب کا مشورہ ہوا کہ کچھ عرصہ کے لئے دلی کو چھوڑ دیا جائے۔ (بقیہ حاشیہ اگلے صفحہ پر)

مراد کے اظہار اور تعبیر کی لطافت کا لحاظ رکھا گیا ہے اور ترجمہ کی عبارت کا اطناب تعبیر کی رکاکت اور مراد کا ابہام جو دوسرے ترجموں میں موجود تھا، حتی الوسع اس سے احتراز کیا گیا ہے۔

۲۔ باقی ماندہ تراجم دو حال سے خالی نہیں ہیں، یا تو ان میں قرآن سے متعلق قصوں کو مطلقاً ترک کر دیا گیا ہے۔ یا پھر پورے پورے قصے بیان کئے گئے ہیں۔ اس ترجمہ میں متوسط اسلوب اختیار کیا گیا ہے۔ چنانچہ جہاں آیت کے معنی کسی قصہ پر موقوف تھے وہاں بقدر ضرورت قصہ کی چیدہ چیدہ دو تین باتیں ذکر کی گئی ہیں اور جہاں آیت کے معنی کسی قصہ پر موقوف نہ تھے وہاں قصہ کو ترک کر دیا گیا ہے۔

۳۔ مختلف توجیہات میں سے وہ توجیہ اختیار کی گئی ہے۔ جو عربیت کے لحاظ سے زیادہ قوی اور علم حدیث اور فقہ کے اعتبار سے زیادہ صحیح ہو اور جس میں ظاہر سے کم سے کم انحراف ہو۔

۴۔ یہ ترجمہ اس طور پر کیا گیا ہے کہ جو شخص نحو سے واقف ہو وہ اس کے ذریعہ قرآن کے اعراب، محذوف کی تعیین، ضمیر کا مرجع اور اس لفظ کا محل جان لے جو ذکر میں مقدم یا مؤخر ہے اور جو شخص نحو سے واقف نہ ہو وہ بھی اصل غرض سے محروم نہ رہے۔

۵۔ دوسرے ترجمے دو حالتوں سے خالی نہیں ہیں یا تو ان میں ترجمہ تحت اللفظ ہے یا حاصل معنی کو ترجمہ کی صورت دیگی ہے۔ ان دونوں حالتوں میں بڑا نقص ہوتا ہے۔ یہ ترجمہ دونوں طریقوں کا جامع ہے لیکن دونوں طریقوں میں جو نقص تھا اس کا سدباب کر دیا گیا ہے۔

(بقیہ صـ۱۲۰ کا) شاہ عبدالعزیز ۱۱۵۹ھ میں پیدا ہوئے ہیں اور سفر حرمین ۱۱۴۳ھ میں پیش آیا ہے۔ لہٰذا سوال یہ پیدا ہوتا ہے کہ سفر حرمین سے قبل شاہ عبدالعزیز پیدا ہی کب ہوئے تھے کہ اس واقعہ سے رنجیدہ ہوتے اور دلی چھوڑ دینے کا مشورہ دیتے۔

ان امتیازات کو سامنے رکھنے کے بعد شاہ صاحب نے کافی تفصیل سے بتایا ہے کہ مفعول مطلق، مفعول فیہ، ترکیب اضافی، ترکیب توصیفی، جملہ اسمیہ اور جملہ فعلیہ وغیرہ کے ترجمہ کی کیا صورت اختیار کی گئی ہے۔[1]

مناسب معلوم ہوتا ہے کہ اس موقع پر شاہ صاحب کے ترجمہ اور حواشی کے کچھ نمونے دیدیئے جائیں۔

ترجمہ کا نمونہ

ترجمہ کے نمونہ کے لئے صرف تسمیہ اور سورہ فاتحہ کا ترجمہ لیا گیا ہے، یہ نمونہ شاہ صاحب کے اسلوب ترجمہ کو سمجھنے کے لئے کافی ہے۔ بنام خدائے بخشندۂ مہربان

ستائش خدائے راست پروردگار عالمہا، بخشائندہ مہربان، خداوند روز جزاء، ترامی پرستیم و از تو مدد می طلبیم، بنما مارا راہ راست، راہ آنانکہ اکرام کردۂ برایشاں، بجز آنانکہ خشم گرفتہ شد برآنہا و بجز گمراہاں۔

حواشی کے نمونے

ان نمونوں کے انتخاب میں اس کا لحاظ رکھا گیا ہے کہ یا تو ان میں ان خصوصیات میں سے کوئی خصوصیت ہے جو شاہ صاحب نے بیان فرمائی ہیں، یا ان میں شاہ صاحب نے عام مفسّرین سے ہٹ کر کوئی بات کہی ہے۔

۱۔ شانِ نزول:- إِنَّ اللَّهَ لَا يَسْتَحْيِي أَنْ يَضْرِبَ مَثَلًا مَا بَعُوضَةً فَمَا فَوْقَهَا (۲)

---

[1] شاہ صاحب نے "المقدمہ فی قوانین الترجمہ" کے نام سے ایک مستقل رسالہ بھی لکھا ہے جس میں ترجمہ کے فن پر مفصل گفتگو کی ہے۔ شاہ صاحب نے مقدمہ فتح الرحمٰن میں اسی رسالہ کے بارے میں لکھا ہے "این سخن دراز است و در رسالہ قواعد ترجمہ بیان کردہ آید۔ (ص د) یہ مقدمہ مولانا حفظ الرحمٰن سیوہاروی کے اردو ترجمہ کے ساتھ ماہنامہ برہان، دہلی شمارہ نمبر ۴، ۵، اکتوبر نومبر ۱۹۴۵ء میں شائع ہوا تھا اور اس کا سندھی ترجمہ ماہنامہ الرحیم (سندھی) میں چھپا ہے، یہ مقدمہ اس مقدمہ سے مختلف ہے جو فتح الرحمٰن کے ابتداء میں چھپا ہے۔ مولانا غلام مصطفےٰ قاسمی، الرحیم ص ۲۶۹، اکتوبر، نومبر ۱۹۶۵ء [2] القرآن ۲: ۲۶

(حاشیہ) کافراں چوں ذکر ذباب عنکبوت در قرآن شنیدند طعن کردند و گفتند کہ خدائے تعالے بذکر ایں چیزہائے چہ ارادہ کردہ است، ایں آیت نازل شد۔ واللہ اعلم[1]

۲ ۔ قصہ کی جانب اشارہ :۔ اَوْ كَالَّذِیْ مَرَّ عَلٰی قَرْیَةٍ وَّهِیَ خَاوِیَةٌ عَلٰی عُرُوْشِهَا[2]

(حاشیہ) مترجم گوید آں شخص عزیز بود۔[3]

۳ ۔ تقدیم و تاخیر کلمہ : فَلَوْلَآ اِنْ كُنْتُمْ غَيْرَ مَدِيْنِيْنَ ۝ تَرْجِعُوْنَهَآ اِنْ كُنْتُمْ صٰدِقِيْنَ ۝[4]

(حاشیہ) مترجم گوید لفظ "لولا" داخل است بر "ترجعونها"

۴ ۔ صیغہ امر : وَاِنْ جَنَحُوْا لِلسَّلْمِ فَاجْنَحْ لَهَا[5]

(حاشیہ) مترجم گوید ایں امر برائے اباحت است۔ واللہ اعلم[6]

۵ ۔ قرآن و حدیث میں تطبیق : اِنَّمَا حَرَّمَ عَلَيْكُمُ الْمَيْتَةَ وَالدَّمَ وَلَحْمَ الْخِنْزِيْرِ وَمَآ اُهِلَّ بِهٖ لِغَيْرِ اللّٰهِ الآیۃ[7]

(حاشیہ) مترجم گوید کہ اگر گوئی دریں آیت حصر کردہ شد تحریم اشیاء را در اشیاء مذکورہ، حالانکہ در حدیث سباع و حمار و مانند آں را نیز حرام شمردہ است، پس وجہ تطبیق چہ باشد؟ گویم حصر اضافی است بہ نسبت بحائر و سوائب کہ حرام می دانستند، پس در بهیمة الانعام ہیچ چیز حرام نیست غیر اشیاء مذکورہ و در خبائث و سباع و مانند آں سخن نداشتہ۔[8]

۶ ۔ خصوصی آراء : (الف) يَسْئَلُوْنَكَ عَنِ الْاَهِلَّةِ قُلْ هِیَ مَوَاقِيْتُ لِلنَّاسِ وَالْحَجِّ الآیۃ[9]

---

[1] فتح الرحمن مطبوعہ نور محمد اصح المطابع، کراچی۔ ص ۶ [2] ۲: ۲۵۹ [3] فتح الرحمن ص ۴۸ [4] ۵۶: ۸۶، ۸۷ [5] ۸: ۶۱ [6] فتح ص ۱۸۵ [7] ۲: ۱۷۳ [8] فتح ص ۲۷ [9] ۲: ۱۸۹

(حاشیہ) مترجم گوید ظاہر نزدیک بندہ آنست کہ سوال کردند از شہر حج کہ شوال و ذیقعدہ و دہ روز از ذی الحجہ باشد کہ آیا حج موقت است بآہہا یا نہ [۱]

۷۔ (ب) أَوَلَمْ يَرَوْا أَنَّا نَأْتِي الْأَرْضَ نَنْقُصُهَا مِنْ أَطْرَافِهَا الحساب [۲]

(حاشیہ) یعنی روز بروز شوکت اسلام بزمین عرب منتشر میشود و دار الحرب ناقص می گردد و از اطراف آں۔ عامہ مفسرین این آیت را مدینہ دانند و نزدیک مترجم لازم نیست کہ مدنی باشد و مراد از نقصان دار الحرب اسلام اسلم وغفار و جہینہ و مزینہ و قبائل این است پیش از ہجرت [۳]

۸۔ (ج) الَّذِينَ إِنْ مَكَّنَّاهُمْ فِي الْأَرْضِ ۔ الامور [۴]

(حاشیہ) دراین آیت دلالت است بر صحت خلافت خلفائے اربعہ زیرا کہ ایشاں از مہاجرین اولین بودند و متمکن شدند در زمین، پس لازم آید کہ اقامت صلوۃ و ایتاء زکوۃ و امر معروف و نہی منکر از ایشاں بہ ظہور رسد تمکین فی الارض چوں باین خصال جمع شود ہماں است خلافت نبوت [۵]

۹۔ (د) وَعَدَ اللَّهُ الَّذِينَ آمَنُوا مِنْكُمْ ۔ الفاسقون [۶]

(حاشیہ) یعنی چنانکہ قاتلان عثمان کردند۔ مترجم گوید تفسیر این آیت در حدیث آمدہ، ان خلافتی بعدی ثلثون سنۃ۔ واللہ اعلم [۷]۔

۱۰۔ (ہ) وَإِذَا ضَرَبْتُمْ فِي الْأَرْضِ فَلَيْسَ عَلَيْكُمْ جُنَاحٌ أَنْ تَقْصُرُوا مِنَ الصَّلَاةِ إِنْ خِفْتُمْ الآیہ [۸]

(حاشیہ) مترجم گوید مشہور آنست کہ ایں آیت در صلوۃ مسافر نازل شدہ

---

[۱] فتح ص ۳۰۔ حضرت ابن عباسؓ سے اس کا شان نزول یہ منقول ہے کہ صحابہ میں سے دو حضرات نے رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے دریافت کیا کہ چاند گھٹتا اور بڑھتا کیوں ہے تو اس پر یہ آیت نازل ہوئی (زاد المسیر، ابن الجوزی، المکتب الاسلامی، بیروت، طبع اول، ۱۳۸۴ھ / ۱۹۶۴م اور عام مفسرین یہی کہتے ہیں۔

[۲] ۱۳: ۴۱ [۳] فتح ص ۲۵۵ [۴] ۲۲: ۴۱ [۵] فتح ص ۳۳۶ [۶] ۲۴: ۵۵ [۷] فتح ص ۳۵۶

است وخوف قید اتفاقی است، آنچہ نزدیک این بندہ رجحان یافتہ است آنست کہ این آیت در صلوٰۃ خوف نازل شدہ است و سفر قید اتفاقی است و مراد از قصر در کیفیت رکوع و سجود است کہ بایمائے میتوان اداکرد، نہ در کمیت رکعات۔ (۱)

فتح الرحمٰن کے حواشی کے مطالعہ کے دوران راقم کے سامنے یہ بات آئی ہے کہ شاہ صاحب نے جہاں جہاں "مترجم گوید" کے الفاظ سے ابتداء کرکے کوئی بات کہی ہے وہاں عام طور پر (کلی طور پر نہیں) ان کی اپنی خصوصی رائے ہوتی ہے۔

شاہ صاحب کو قرآن کریم پر کتنا عبور تھا، اس کا اندازہ ان کی اس بات سے کیا جا سکتا ہے جو انہوں نے مقدمہ فتح الرحمٰن میں لکھی ہے کہ یہ ترجمہ مختلف اوقات میں جبکہ توجہ دوسرے علوم کی طرف بھی تھی۔ کسی شخص کی اعانت یا کسی کتاب کی طرف رجوع کئے بغیر کیا گیا ہے اس لئے ہو سکتا ہے۔ کہ جن امور کا التزام کیا گیا تھا، بعض مقامات پر ان کا لحاظ نہ رہا ہو۔ (۲)

قرآن کریم کے پڑھانے کی نوبت کب آنی چاہیئے اور کس طرح پڑھایا جانا چاہیئے۔ شاہ صاحب نے اسکا ذکر وصیت نامہ میں کیا ہے۔ کہ تجربہ سے طریقہ تعلیم یہ ثابت ہوا ہے کہ طالب علم کے ذہن کے مطابق پہلے صرف ونحو کے تین تین چار چار مختصر رسالے پڑھائیں، اس کے بعد تاریخ یا حکمت کی کوئی کتاب پڑھائیں جو عربی زبان میں ہو اور اس کے ساتھ یہ بھی بتائیں کہ لغت کا تتبع کیسے کیا جاتا ہے۔ اور مشکل کو کیسے حل کیا جاتا ہے۔ جب عربی زبان پر قدرت ہو جائے تو مؤطا بروایت یحییٰ بن یحییٰ مصمودی پڑھائیں اسے ہرگز نہ چھوڑیں کہ علم حدیث کی اصل ہے اور اس کے پڑھنے میں بہت فیض ہے۔ اور ہمیں اس کا سماع مسلسل ہے پھر قرآن عظیم اس طرح پڑھائیں کہ بغیر تفسیر کے صرف ترجمہ بتائیں مگر جہاں شان نزول یا نحوی قاعدہ میں مشکل

۱۔ فتح ص ۱۹۲ / (۲) ۔ مقدمہ فتح الرحمٰن ص ۲، ۱

ہو وہاں ٹھیر جائیں اور بحث کریں۔ اس کے بعد تفسیر جلالین بقدر درس پڑھائیں اس طریقے میں بہت فیض ہے۔[1]

قرآن کی تدریس کا یہ طریقہ تو ان لوگوں کے لئے ہے جو باقاعدہ علوم عربیہ پڑھنا چاہیں لیکن شاہ صاحب نے یہ ترجمہ ان لوگوں کے لئے کیا ہے جو علوم عربیہ کی باقاعدہ تکمیل نہ کرنا چاہیں۔ چنانچہ شاہ صاحب خود لکھتے ہیں کہ یہ ترجمہ عوام پر شفقت کی بنا پر کیا گیا ہے۔ عوام کو اس کا موقع نہیں ملتا کہ لفظوں کے اعراب، کلام کی توجیہات اور قصص پر پورے طور پر عبور حاصل کر سکیں۔ اسلئے ابتدائے عمر ہی میں انہیں علم تفسیر کا کم از کم ادنیٰ درجہ حاصل ہو جانا چاہیئے۔[2] چنانچہ ایسے لوگوں کو فتح الرحمن کس طرح پڑھانی چاہیئے، اس کے متعلق شاہ صاحب فرماتے ہیں۔

فتح الرحمن اس وقت پڑھائی جائے جب متن قرآن اور فارسی کے مختصر رسائل ختم کر لئے جائیں۔ تاکہ فارسی کے سمجھنے میں تکلف نہ ہو۔ پیشہ ور دل اور سپاہیوں کے بچوں کو جن سے عربی علوم کی تکمیل کی توقع نہیں کی جا سکتی، انہیں سن تمیز کو پہنچتے ہی یہ کتاب پڑھا دینی چاہیئے تاکہ پہلی چیز جو باطن میں اترے وہ کتاب اللہ کے معانی ہوں اور ان کی سلامتی فطرت ہاتھ سے نہ جائے اور وہ ان ملحدوں کی باتوں پر فریفتہ نہ ہوں جو پاک باطن صوفیہ کے لباس میں چھپ کر لوگوں کو گمراہ کرتے رہتے ہیں۔ اور ان کی لوح دل معقولیوں اور ہنود کی بے ربط باتوں سے ملوث نہ ہوں۔ جن لوگوں کو بڑی عمر میں اللہ کیطرف رجوع کا خیال آئے اور وہ علوم کی تحصیل نہ کر سکیں، انہیں بھی یہ کتاب پڑھنی چاہیئے۔ تاکہ قرآن کی تلاوت میں انہیں حلاوت میسر آئے۔ دوسرے وہ لوگ جو اکثر اوقات شغل معاش میں مبتلا رہتے ہیں، انہیں چاہیئے کہ فراغت کے وقت حلقہ بنا کر بیٹھیں ایک شخص جسے فارسی پر قدرت ہو اور کچھ تفسیر بھی جانتا ہو پڑھتا جائے اور سب سنتے رہیں صحابہ کرام کا یہی دستور تھا کہ حلقہ میں بیٹھ جاتے تھے، ایک صاحب پڑھتے تھے۔ اور سب سنتے تھے۔

لیکن جو لوگ پورے طور پر عربی پر عبور رکھتے ہوں اور اساتذہ سے تفاسیر پڑھ چکے ہوں انہیں اس ترجمہ کے پڑھنے کی ضرورت نہیں ہے لیکن اللہ کے فضل سے امید ہے کہ اگر وہ اس کتاب کو دیکھیں گے تو ان پر بھی قرآن کا تحت اللفظ زیادہ واضح ہو جائے گا۔ اور نحو کے مختارات اور غریب کی شرح اور دوسرے ایسے فوائد حاصل ہوں گے۔ کہ انہوں نے اس کتاب سے پہلے سنے یا دیکھے نہ ہونگے۔

الفوز الکبیر الفوز الکبیر کی تصنیف سے شاہ ولی اللہ کا مقصد کیا تھا اسے انہوں نے خود اس کتاب کے مقدمہ میں ذکر کیا ہے۔ لکھتے ہیں اس فقیر پر چونکہ اللہ کے فہم کا ایک دروازہ کھول دیا گیا ہے۔ اس لئے اس فقیر نے چاہا کہ ایک مختصر رسالہ میں محض ایسے نکات ضبط کر دیئے جائیں جو کلام اللہ سے وابستگی میں دوستوں کے کام آئیں۔ اللہ کی عنایت سے امید ہے کہ ان کے سمجھتے ہی طالبان علم پر کتاب اللہ کے معانی سمجھنے میں ایک وسیع راہ پیدا ہو جائے گی اس طرح کہ اگر تفسیروں کے مطالعہ میں یا مفسرین سے، جو اس زمانہ میں بہت کم ہیں، تفسیر پڑھنے میں ایک عمر صرف کریں، تو بھی انہیں یہ ربط و ضبط میسر نہ ہوگا۔

الفوز الکبیر پانچ ابواب پر مشتمل ہے پہلے باب میں دو فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں قرآن کے علوم پنجگانہ کا بیان ہے وہ علوم پنجگانہ حسب ذیل ہیں۔ علم احکام یعنی عبادات معاملات تدبیر منزل یا سیاست مدینہ سے متعلق اس طرح کے احکام کہ فلاں چیز واجب یا مندوب یا مباح یا مکروہ یا حرام ہے۔ علم المخاصمہ یعنی قرآن کریم میں یہود نصاریٰ منافقین اور مشرکین کے چاروں گمراہ فرقوں کا کس طرح رد کیا گیا ہے علم تذکیر بآلاء اللہ یعنی زمین و آسمان کی تخلیق بندوں کو جن چیزوں کی ضرورت ہے، ان کا الہام اور اللہ کی صفات کثیرہ کا بیان اور اس طرح اللہ کی نعمتیں یاد دلا کر نصیحت و موعظت علم تذکیر بایام اللہ یعنی فرمانبرداروں کے انعامات اور نافرمانوں کے عذاب کے طریقوں

کا ذکر کرکے بندوں کو عبرت و نصیحت۔ علم تذکیر بموت و ما بعد آن یعنی عبرت و نصیحت کے لئے حشر نشر، میزان، جنت اور جہنم وغیرہ کا بیان۔

دوسری فصل الٰہی علوم پنجگانہ کے بقیہ مباحث پر مشتمل ہے۔

دوسرے باب میں اس کا بیان ہے کہ نظم قرآن کے مخفی ہونے کے اسباب کیا ہیں۔ اس میں چار فصلیں ہیں۔ پہلی فصل میں بتایا گیا ہے کہ کہیں نظم قرآن کے سمجھنے میں خفا لفظ کی غرابت کی وجہ سے ہوتا ہے۔ اور اس کے لئے شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ اس کتاب کے پانچویں باب میں ہم معتدبہ غرائب قرآن کی تشریح کی ہے اور اسے ایک مستقل رسالہ بھی بنا دیا ہے۔ تاکہ جو چاہے اسے الفوز الکبیر میں داخل کرے اور جو چاہے اسے مستقلاً یاد کرے اس پانچویں باب یا مستقل رسالہ کا نام فتح الخبیر ہے۔

دوسری فصل میں شاہ صاحب نے نسخ پر گفتگو کی ہے اور قرآن کریم کی صرف حسب ذیل پانچ آیات کو منسوخ مانا ہے۔

۱۔ كُتِبَ عَلَيْكُمْ إِذَا حَضَرَ أَحَدَكُمُ الْمَوْتُ إِنْ تَرَكَ خَيْرَنِ الْوَصِيَّةُ [1]

یہ آیت آیت میراث یعنی "يُوصِيكُمُ اللَّهُ فِي أَوْلَادِكُمْ" [2] سے منسوخ ہے۔

۲۔ إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ عِشْرُونَ صَابِرُونَ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ [3]

یہ آیت اس کے بعد والی آیت سے منسوخ ہے یعنی "إِنْ يَكُنْ مِنْكُمْ مِائَةٌ صَابِرَةٌ يَغْلِبُوا مِائَتَيْنِ" [4]

۳۔ لَا يَحِلُّ لَكَ النِّسَاءُ مِنْ بَعْدُ الایہ [5]

اس آیت کا حکم حسب ذیل آیت سے منسوخ ہے: "إِنَّا أَحْلَلْنَا لَكَ أَزْوَاجَكَ اللَّاتِي" الآیہ [6]

---

[1] ۲: ۱۸۰ [2] ۴: ۱۱ [3] ۸: ۶۵ [4] ۸: ۶۶ [5] ۳۳: ۵۲

[6] ۳۳: ۵۰

۴ - إِذَا نَاجَيْتُمُ الرَّسُولَ فَقَدِّمُوا الآیہ [1]

یہ آیت اس کے بعد والی آیت سے منسوخ ہے یعنی "أَأَشْفَقْتُمْ أَنْ تُقَدِّمُوا بَيْنَ يَدَيْ نَجْوَاكُمْ صَدَقَاتٍ [2]

۵ - قُمِ اللَّيْلَ إِلَّا قَلِيلًا الآیہ [3]

یہ آیت آخر سورہ سے منسوخ ہے اس طرح کہ سورہ کی ابتدائی آیت "قم اللیل الا قلیلا" الآیۃ میں قیام لیل کی تاکید تھی اور آخر سورہ سے یہ تاکید منسوخ ہوگئی صرف ندب باقی رہ گیا ہے[4]۔

---

[1] ۲۸ : ۱۲ [2] ۲۸ : ۱۳ [3] ۲۹ : ۲

[4] نسخ کے بارے میں متقدمین اور متأخرین کی اصطلاحوں میں فرق ہے۔ متقدمین نسخ کو مطلقاً ازالہ کے معنی میں استعمال کرتے تھے اور اسی لئے ان کے نزدیک نسخ کا مفہوم زیادہ عام ہے (الفوز الکبیر ص ۱۵، ۲۷) الخیر الکثیر مدینہ پریس بجنور، مجلس علمی ڈابھیل، ۱۳۵۴ھ/ ۱۹۳۵ء ص ۸۳، ۱۸۵) اور اسی عموم کی وجہ سے ان کے نزدیک منسوخ آیات کی تعداد پانچ سو تک پہنچ جاتی ہے بلکہ مزید غور کیا جائے تو تعداد اس سے بھی زیادہ بڑھ جاتی ہے (الفوز الکبیر ص ۱۵، ۱۶) لیکن متأخرین کے نزدیک انتہائے مدت عمل یا انتہائے مدت حکم کے سوا اور کوئی صورت نسخ نہیں کہلاتی۔ اور اس اصطلاح کے مطابق منسوخ آیات کی تعداد بہت کم ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب بھی انتہائے مدت حکم کو نسخ قرار دیتے ہیں۔ (حجۃ اللہ البالغہ، الطباعۃ المنیریۃ، مصر، جلد اول ۱۳۵۲ھ جلد ثانی ۱۳۵۵ھ ج ۲ ص ۸۸۳)

متقدمین کے نزدیک پانچ سو آیات منسوخ تھیں، لیکن ابن عربی نے اسی اصطلاح کے فرق کی بنا پر صرف اکیس[21] آیات کو منسوخ مانا اور علامہ سیوطی نے بیس[20] آیات کو شاہ صاحب اس تعداد کو گھٹا کر پانچ تک لے آئے اور باقی ان تمام آیات کی جنہیں ابن عربی یا سیوطی نے منسوخ مانا تھا (الفوز الکبیر ص ۱۶ - ۱۸) ایسی توجیہات کردیں کہ وہ منسوخ نہ رہیں۔

شاہ صاحب کے بارے میں مولانا عبیداللہ سندھی کا خیال ہے کہ وہ قرآن میں سرے سے نسخ کے قائل نہیں لیکن محض اس مصلحت کے پیش نظر کہ لوگ انہیں معتزلہ میں سے شمار کرکے ان کی بات کی طرف التفات کرنا نہ چھوڑ دیں، انہوں نے یہ حکیمانہ اسلوب اختیار کیا کہ پانچ آیتوں میں نسخ کا اقرار کرلیا۔ شاہ ولی اللہ اور ان کا فلسفہ، سندھ ساگر اکیڈمی استقلال پریس، لاہور بار سوم ۱۹۴۶ء ص ۸۶، ۸۷، ۸۹)

شاہ صاحب نے اسی فصل میں اسباب نزول کو بھی مشکل مواقع میں سے شمار کیا ہے اور پھر اس پر تفصیلی گفتگو کی ہے۔

تیسری فصل میں یہ بتایا ہے کہ حذف، ابدال، تقدیم و تاخیر، متشابہات اور تعریفات، کنایات، استعارات، اور مجاز عقلی کیوجہ سے بھی معانی میں خفا ہو جاتا ہے اور پھر مثالوں سے انہیں سمجھایا ہے۔

چوتھی فصل میں محکم اور متشابہ پر بحث کی ہے اور نظم کلام میں جن جن وجوہ سے تشابہ ہو سکتا ہے، انہیں مثالوں سے سمجھایا ہے۔

میسرا باب دو فصلوں پر مشتمل ہے۔ پہلی فصل میں قرآن کے اسلوب بدیع پر گفتگو ہے کہ اس کا اسلوب ایسا ہی ہے جیسے بادشاہ اپنی رعایا کو مختلف اوقات میں خطوط لکھتے ہیں اور بعد میں وہ خطوط جمع کر لئے جائیں۔

دوسری فصل میں یہ بتایا ہے کہ جس طرح قصیدہ کو ابیات پر تقسیم کرتے ہیں اسی طرح، انسانی ذوق کا لحاظ رکھتے ہوئے سورتوں کو آیات پر تقسیم کیا گیا ہے۔ اور اسی فصل میں تکرار مضامین اور اعجاز قرآن پر بھی گفتگو کی گئی ہے۔

چوتھے باب میں فنون تفسیر کا بیان ہے اور صحابہ اور تابعین کی تفسیروں میں جو اختلاف ہے اسکا حل پیش کیا گیا ہے۔

شاہ صاحب نے اس میں لکھا ہے کہ محدثین کی روش یہ ہے کہ وہ تفسیر بالآثار کرتے ہیں، متکلمین کا طریقہ یہ ہے کہ وہ صفات و اسماء کی، مذہب تنزیہ کے مطابق تاویل کرتے ہیں، فقہائے اصولیین اپنی تفسیروں میں استنباط احکام کا طریقہ اختیار کرتے ہیں، نحویوں کا طریقہ یہ ہے کہ وہ کلام عرب سے شواہد پیش کرتے ہوئے، نحو اور لغت کی وضاحت کرتے ہیں، ادباء کا طریقہ یہ ہے کہ وہ معانی و بیان کے لحاظ سے گفتگو کرتے ہیں، قراء کا طریقہ یہ ہے کہ وہ تفسیر میں قرآن کی ماثور قرائتوں کی روایت کرتے ہیں، صوفیاء کی روش یہ ہے کہ وہ ادنی مناسبت سے علم سلوک یا علم حقائق کے نکات بیان کرتے ہیں۔ غرض ہر شخص اپنے اپنے

نظر سے تفسیر کرتا ہے اور ہر شخص کی غرض قرآن کی تفہیم ہی ہے ۔ اور بعض حضرات نے ان تمام طریقوں کو اپنی تفسیروں میں جمع کرنے کی کوشش کی ہے۔

شاہ صاحب لکھتے ہیں کہ فقیر کو ان تمام فنون سے ایسی مناسبت ہے یسی مجتہد فی المذہب کو ہوا کرتی ہے اور ان کے علاوہ بھی دو تین فن ایسے ں جو دریائے فیض الٰہی سے میرے دل میں ڈالے گئے ہیں ۔ ۱ے

یہ باب پانچ فصلوں پر مشتمل ہے ۔ پہلی فصل میں ان آثار پر گفتگو کی ہے نہیں محدثین اپنی تفسیروں میں ذکر کرتے ہیں ۔ اور اس ضمن میں اسباب نزول خبار بنی اسرائیل ، شرح غریب اور نسخ پر بھی گفتگو کی ہے دوسری فصل میں سی باب کے باقی ماندہ لطائف کا بیان ہے مثلاً استنباطِ احکام اور توجیہ غیرہ تیسری فصل میں غریب قرآن کی اقسام بیان کی ہیں۔

چوتھی فصل میں شاہ صاحب نے علم تفسیر میں اپنے وہ علوم شمار کرائے ہیں ان کے مخصوص وہبی علوم ہیں وہ علوم حسب ذیل ہیں

قصص انبیاء کی تاویل جس کے لئے "تاویل الاحادیث" کے نام سے انہوں نے ایک مستقل رسالہ لکھا ہے ۔ قرآن کے علوم خمسہ کی تنقیح جنکا ذکر الفوز الکبیر کے پہلے باب میں کیا گیا ہے فارسی میں قرآن کا اس طرح ترجمہ عربی کے مشابہ ہو اسی ترجمہ کا نام فتح الرحمٰن ہے علوم خواص قرآن ۔

پانچویں باب میں جسے فتح الخبیر کا نام دیکر شاہ صاحب نے ایک مستقل رسالہ دیا ہے ، غریب قرآن کی وہ شرح ہے جو حضرت ابن عباس سے ابن ابی ہ اور ضحاک کے طریقوں سے مروی ہے ۔ اور حضرت ابن عباس کی جو تفسیر

۱ے واضح ہو کہ یہ علوم خمسہ شاہ صاحب کے ابتداءً دریافت کردہ علوم نہیں قرآنی علوم اور ان پر قرآن تقسیم کے متعلق لوگ پہلے بھی گفتگو کر چکے ہیں ۔ شاہ صاحب کا کام صرف اتنا ہے کہ انہوں خداداد علم اور بصیرت سے کام لے کر ان علوم کو منقح طور پر مرتب فرمایا دیا ہے ۔ اور ہ صاحب نے دعوی بھی صرف تنقیح کا کیا ہے ۔ تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمایئے ۔ اصول فقہ اور ہ ولی اللہ ص ۱۰۷ ، ۱۰۸

ان دونوں طریقوں سے مروی نہ تھی۔ اس کی تکمیل نافع بن ازرق کے مسائل اور صحیح بخاری سے کر دی گئی ہے۔ بعض دوسری کتابوں سے بھی بعض آیات کی تفسیر لی گئی ہے۔ لیکن بہت کم اور وہ بھی ایسی جو ثقات سے منقول ہو۔ بخاری ترمذی اور حاکم سے اخذ کر کے ضروری اسباب نزول بھی ذکر کئے گئے ہیں۔ باب پنجم کے متعلق شاہ صاحب نے فرمایا ہے کہ مفسر کو اتنی باتیں حفظ ہونی چاہئیں[1]

تاویل الاحادیث

بعض ائمہ لغت، تفسیر اور تاویل کو مرادف قرار دیتے ہیں۔ اور بعض حضرات دونوں میں فرق کرتے ہیں۔ متأخرین کے نزدیک زیادہ مشہور یہ ہے کہ لفظ کا بیان بطریق روایت اسے تفسیر کہتے ہیں، اور لفظ کا بیان بطریق درائیت اسے تاویل کہتے ہیں یا جو معانی عبارت سے سمجھ میں آرہے ہیں انکا بیان تفسیر کہلاتا ہے اور جو معانی اشاروں سے سمجھ میں آرہے ہیں انکا بیان تاویل کہلاتا ہے[2]

شاہ صاحب نے تاویل الاحادیث میں جو طریقہ اختیار کیا ہے، اس کے مطابق تاویل کا یہ مطلب بیان کیا ہے کہ "مراد از تاویل آنست کہ ہر قصہ کہ واقع شد آنرا مبدأ میبا شد از استعداد پیغمبر و قوم او و از تدبیر کہ خدائے تعالیٰ دران وقت خواستہ است و گویا بر ہمیں معنی اشارہ رفتہ است در آیہ ودو یعلمك من تاویل الاحادیث"[3]۔ یعنی تاویل سے یہ مراد ہے کہ جو واقعہ بھی ہوا ہے اس کا مبدأ ہوتا ہے، پیغمبر اور اس قوم کی استعداد سے اور اس تدبیر سے جسکا خدا نے اس وقت ارادہ کیا ہے۔ اور گویا قرآن کریم کی اس آیت "ویعلمك من تاویل الاحادیث" (اور تجھے سکھائیگا۔ احادیث (خوابوں) کی تاویل) میں اسی معنی کی طرف اشارہ کیا گیا ہے۔

---

(۱) ص ۴۳ - ۴۷ (۲) مناہل العرفان فی علوم القرآن الزرقانی، عبدالعظیم محمد، دار احیاء الکتب العربیۃ، عیسی البابی الحلبی، مصر الطبعۃ الثانیہ ۱۳۷۲ھ ص ۴۷۳

(۳) الفوز الکبیر ص ۴۰

قصص انبیاء کی توجیہ اور ان کی حکمت کا بیان تاویل الاحادیث کا اصل موضوع ہے ۔ ان قصوں میں جہاں خوارق آئے ہیں ۔ شاہ صاحب نے ان کی تاویلات بھی کی ہیں ۔

خوارق کی ان تاویلات سے شاہ صاحب کا مقصد یہ ہے کہ مسببات کو عادی اسباب سے وابستہ کر کے انہیں فہم عام سے قریب کر دیا جائے ۔

خوارق کے متعلق شاہ ولی اللہ کا نظریہ کیا ہے ، اس کے بارے میں خود تاویل الاحادیث میں دو متضاد باتیں ملتی ہیں اس کتاب میں انہوں نے یہ لکھا ہے والحق ان کل ما یسمی خرقا فانہ من الامور العادیۃ لکن لما کان اسبابھا قلیلۃ الوقوع ، لایظھر الا قلیلا ، وحیث کان العامۃ لا یتوقعونھا سمیت خوارق ،،

یعنی حق یہ ہے کہ ہر وہ چیز جسے خرق کہا جاتا ہے وہ بھی عادی امور میں سے ہوتے ہیں لیکن چونکہ ان کے اسباب قلیلۃ الوقوع ہوتے ہیں ، ان کا ظہور کمی کے ساتھ ہوتا ہے اور چونکہ عوام کے لئے وہ غیر متوقع ہوتے ہیں اس لئے ان کو خوارق کہا جاتا ہے ۔

اسی طرح دوسری جگہ فرماتے ہیں ۔ واعلم ان اللہ اذا یظھر خارق عادۃ لتدبیر ، فانہ انما یظھر فی ضمن عادۃ ما ولوضعیفۃ کالرجل یمرض مرضا ضعیفا اذا راٰہ الحکیم الطبیعی لم یکترث بہ و لم یظن انہ یموت ولکن یظھر قضاء اللہ فی ضمن ذالک المرض فیموت ۔ فللخوارق اسباب ضعیفۃ (۱)

یعنی یاد رکھو کہ اللہ جب کسی تدبیر کے لئے کسی خارق عادت کو ظاہر فرماتا ہے تو کسی عادت کے ضمن میں ظاہر فرماتا ہے جیسے کوئی شخص اتنا معمولی سا بیمار ہو کہ طبیب جب اسے دیکھے تو چنداں پروا نہ کرے اور اسے اسکا گمان بھی نہ کہ یہ مر جائے گا ۔ لیکن اسی مرض کے ضمن میں اللہ کا حکم ظاہر ہو جاتا ہے اور وہ

(۱) تاویل الاحادیث [illegible]

مرجاتا ہے۔ پس خوارق کے بھی ضعیف اسباب ہوا کرتے ہیں۔

نیز فرماتے ہیں۔ من علوم الانسان المجبول علیھا ان لکل حادث سببا (۱)

یعنی انسان کے لئے ان علوم میں سے جو اس کے لئے فطری علوم ہیں یہ بھی ہے کہ ہر حادث کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ ان تمام تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ ہر خارق کا کوئی سبب ہوتا ہے۔ اور خوارق عادی امور میں سے ہوتے ہیں جن کے اسباب ضعیف اور قلیل الوقوع ہوتے ہیں۔

لیکن اسی تاویل الاحادیث میں دوسرے مقامات پر جو کچھ لکھا ہے۔ وہ اس کے خلاف ہے۔ مثلاً حضرت موسیٰ علیہ السلام کو تورات جن الواح پر لکھی ہوئی ملی تھی، ان کے بارے میں لکھتے ہیں "وکان جوھر الالواح من زمرد الجنۃ ای من جوھر شبیہ بالزمرد اوجدہ اللہ بقول کن من غیر سبب عنصری (۲)

کہ ان الواح کا جوہر جنت کے زمرد یعنی ایسے جوہر کا بنا ہوا تھا جو زمرد کے مشابہ تھا جسے اللہ نے کسی عنصری سبب کے بغیر محض اپنے لفظ کن سے پیدا کیا تھا۔

ایک جگہ ان انعامات کا ذکر فرماتے ہوئے جو اللہ نے حضرت مریم پر کئے لکھتے ہیں۔ "ومنھا انہ اظھر الایات علی مریم وخلق لھا الفواکہ بقول کن من غیر سبب عنصری کالذی یخلقہ اللہ لاھل الجنۃ فی الجنۃ وکان ذکریا علیہ السلام عارفا باللہ عالما بسنتہ فی خلقہ، فعرف ان لقوی الروحانیات ظھورا عجیبا فی تلک الایام وان التکوین یومئذ لا یتوقف علی سبب عنصری کالایام التی کانت عند خلق آدم علیہ السلام (۳)

اللہ کا ایک انعام یہ بھی تھا کہ اس نے مریم پر نشانیاں ظاہر کیں اور ان کیلئے

(۱) ایضاً ۳-۴ (۲) ایضاً ص ۴۸ (۳) ایضاً ص ۷۲

بغیر کسی عنصری سبب کے فوائد پیدا کئے جیسے کہ اللہ جنت میں اہل جنت کے لئے پیدا فرمائے گا۔ اور زکریا علیہ السلام چونکہ اللہ کو پہچانتے تھے ،، اور مخلوق میں اللہ کی سنت کیا ہے ، اسے جانتے تھے ، اس لئے انہوں نے یہ جان لیا تھا کہ ان ایام میں روحانیت کا ظہور عجیب طرح پر ہو رہا ہے ۔ اور اس وقت تکوین کسی عنصری سبب پر موقوف نہیں بالکل ان ایام کی طرح جو خلق آدم کے وقت تھے۔ علیہ السلام ۔

ان تصریحات سے معلوم ہوتا ہے کہ شاہ صاحب دہریین کی طرح اس کے قائل نہیں کہ کوئی چیز مادی اور عنصری سبب کے بغیر ظہور میں نہیں آسکتی بلکہ انشقاق قمر کی تاویل کے بعد تو انہوں نے اس کا اعتراف کیا ہے کہ " وھذا القول ذکرته علی سبیل الامکان والاحتمال والا فقدرة اللہ تسع الکل" (۱) کہ (ابن ماجشون کا) یہ قول میں نے امکان اور احتمال کے طور پر ذکر کیا ہے ورنہ اللہ کی قدرت سے ہر کام ہو سکتا ہے۔

اس موقع پر یہ بات بھی دلچسپی سے خالی نہ ہوگی کہ یہاں زکریا علیہ السلام کا ذکر کرتے ہوئے تو شاہ صاحب نے یہ فرمایا ہے کہ آدم علیہ السلام کی تخلیق کے وقت تکوین کسی عنصری سبب پر موقوف نہ تھی اور خود حضرت آدم علیہ السلام کی تخلیق کا ذکر جہاں کیا ہے وہاں فرماتے ہیں ۔ اجتمعت قوی السیارات فی ناحیة من الارض وطلب امام نوع الانسان من اللہ تعالے ان یظهر فی الناسوت واعتدلت العناصر وتعفنت تعفنا طیبا ۔ فقضی اللہ بحسب هذہ الامور ان یخلق فی الارض خلیفة له" ۲

سیارات کے قوی زمین کے ایک جانب جمع ہوئے اور نوع انسانی کے امام نے اللہ سے یہ طلب کی کہ وہ عالم محسوس و مشاہد میں ظاہر ہو اور عناصر معتدل ہو گئے اور ان میں خوشگوار خمیر و تعفن پیدا ہو گیا ۔ تو اللہ نے ان امور کے مطابق یہ فیصلہ فرمایا کہ زمین میں اپنا خلیفہ پیدا کرے ۔

(۱) ... تاویل الاحادیث ... (۲) ایضاً ص ۱۰۹

خوارق کے سلسلہ میں ان مختلف باتوں کو سامنے رکھنے کے بعد راقم الحروف کو شاہ صاحب کا مسلک یہ معلوم ہوتا ہے کہ کوئی چیز سبب کے بغیر وجود میں نہیں آتی، لیکن ہر چیز کا آخری سبب اللہ کی قدرت ہے۔ یہ قدرت کبھی تو عنصری اسباب کے واسطہ سے ظاہر ہوتی ہے اور کبھی براہ راست بغیر کسی عنصری واسطہ کے ظاہر ہو جاتی ہے۔ شاہ صاحب جہاں جہاں قدرت اور خارق کے درمیان عنصری اسباب بہ تکلف تلاش کر سکے وہاں انہوں نے عنصری اسباب بیان کر دیئے اور جہاں وہ عنصری اسباب نہ پا سکے وہاں انہوں نے خارق کو براہ راست اللہ کی قدرت کی شاہ صاحب نے جن خوارق کے عنصری اور عادی اسباب بیان کئے ہیں وہاں یہ عجیب صورت حال ہے کہ بعض مقامات پر ایسے عنصری اور عادی اسباب بھی بیان کئے ہیں جو بجائے خود خوارق ہیں اور جن سے بجائے اس کے کہ خارق کو سمجھنے میں مدد ملے، خود ان اسباب کو سمجھنے میں ذہن الجھ جاتا ہے۔ مثلاً دریائے نیل سے حضرت موسیٰؑ کے پار ہونے اور فرعون کے غرق ہو جانے کی تاویل[1]، یا بنی اسرائیل کے بندر بن جانے کی تاویل[2] یا حضرت عیسیٰؑ کی ولادت کی تاویل[3]۔

بہر حال تاویل الاحادیث میں شاہ صاحب نے جو علوم ظاہر فرمائے ہیں یہ ان کے وہبی علوم میں جیسا کہ خود انہوں نے تصریح کی ہے[4]۔ اور اگر ہمیں انکے سمجھنے میں دشواری پیش آتی ہے، تو ادب کا تقاضا یہ ہے کہ ہم انہیں اپنے فہم کی کوتاہی پر محمول کریں۔

حروف مقطعات، محکم و متشابہ، اخبار و قصص بنی اسرائیل یہ مباحث بھی قرآن ہی سے متعلق ہیں اور ان پر شاہ صاحب نے اپنی مختلف تصانیف میں تفصیلی گفتگو کی ہے لیکن چونکہ راقم الحروف نے اپنی کتاب اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ میں ان پر تفصیلی گفتگو کی ہے اس لئے یہاں ان کے اعادہ کی چنداں ضرورت نہیں۔

---

[1] تاویل الاحادیث ص ۴۷ [2] ایضاً ص ۶۳ [3] ایضاً ص ۷۳، ۷۴، تفصیل کے لئے ملاحظہ فرمائیے۔ اصول فقہ اور شاہ ولی اللہ ص ۱۲۰ - ۱۲۴ [4] الفوز الکبیر ص ۴۰

ہم اپنی گفتگو کو شاہ ولی اللہ رحمۃ اللہ علیہ کی اس بات پر ختم کرتے ہیں کہ "فائدہ اصلی از نزول قرآن اتعاظ است بمواعظ آن و ابتداء است بہ ہدایت آن نہ صرف تلفظ بآں اگرچہ تلفظ آں ہم مغتنم است"[1] قرآن کے نزول کا اصلی فائدہ یہ ہے کہ اس کے مواعظ سے نصیحت اور اس کی ہدایت سے ہدایت حاصل کی جائے نہ کہ صرف اس کا تلفظ اگرچہ اس کا تلفظ بھی غنیمت ہے۔

شاہ صاحب نے اپنے اخلاف کو بھی سب سے پہلی وصیت یہ کی ہے کہ اعتقاد اور عمل اللہ کے کلام اور رسول کی حدیث کے موافق ہو ان دونوں میں غور کرتا رہے اور روزانہ دونوں کو کسی قدر پڑھتا رہے اگر خود پڑھنے کی قدرت نہ ہو تو کسی اور سے ایک دو ورق سنا کرے[2]

---

[1] مقدمہ فتح ص ج [2] وصیت نامہ ص ۲۔

(بقیہ اعجاز قرآن)

حق تعالیٰ ہمیں قرآنی حقائق اور معارف سمجھنے اور اُن پر عمل کرنے، اور اپنی زندگیاں انہی کے مطابق بنانے کی توفیق عطا فرمائے۔ آمین یارب العالمین وَاٰخِرُ دَعْوَانَا اَنِ الْحَمْدُ لِلّٰہِ رَبِّ الْعَالَمِیْنَ وَصَلَّی اللّٰہُ تَعَالٰی عَلٰی صفوۃ البریۃ سیدنا و مولٰنا محمد و اٰلہٖ واصحابہ اجمعین۔ برحمتک یا ارحم الراحمین ٥

بندۂ ناچیز
محمد مالک کاندھلوی غفرلہٗ
۱۹۔ ربیع الاوّل ۹۶ھ

کاتب محمد رمضان

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

قرآن کا تصورِ ملکیت

از قلم
مولانا محمد طاسین صاحب
ناظم مجلس علمی، کراچی

نحمدہ ونصلی علی رسولہ الکریم

خواتین وحضرات! ہم مسلمانوں کا یہ اعتقاد اور ایمان ہے کہ قرآن حکیم ان کتابوں میں سے جو اللہ نے انسانی ہدایت کے لئے اتاریں آخری، مکمل اور جامع کتاب ہے، مکمل اور جامع ہونے کا مطلب یہ کہ اس میں حیات انسانی کے ہر شعبہ سے متعلق وہ اصولی اور کلی تصورات بتمام وکمال موجود ہیں جن کی بنیاد پر ہر زمانے میں ایک بہتر سے بہتر نظام حیات کی تشکیل ہو سکتی ہے ایسے نظام کی جس کے تحت جنتی معاشرہ پیدا ہو سکتا ہے جس کی انسانیت کو تلاش ہے۔

زندگی کے معاشی پہلو سے متعلق قرآن حکیم میں جو اصولی تصورات ہیں اُن میں سے ایک اصولی تصور وہ ہے جس پر میں اس وقت مقالہ پیش کر رہا ہوں یعنی قرآن کا تصورِ ملکیت۔

الہامی ہوں یا غیر الہامی، دینی ہوں یا لادینی، قدیم ہوں یا جدید، ہر دستور و آئین اور ہر ضابطۂ قوانین اور نظام شریعت میں بطورِ ایک انسانی حق کے شخصی ملکیت کا ذکر ضرور ملتا ہے۔ حتیٰ کہ آج سوشلسٹ ممالک کے جو دساتیر اور نظام ہائے قانون ہیں اُن میں بھی شخصی ملکیت کا ذکر بنیادی انسانی حق کی حیثیت سے واضح طور پر موجود ہے یہ دوسری بات ہے کہ اُن کے ہاں شخصی ملکیت کا دائرہ تنگ اور صرف ذاتی استعمال کی چیزوں تک محدود ہے

ذرائع پیداوار اُس میں داخل نہیں، اس کا بیان روسی دستور کی دفعہ نمبر دس[1] میں پوری صراحت کے ساتھ مذکور ہے۔

ادارہ اقوام متحدہ جو آج اقوام عالم اور پوری انسانیت کا سب سے بڑا نمائندہ ادارہ ہے جس کے ممبر ہر مکتب خیال کے انسان ہیں: خدا کو ماننے والے بھی اور خدا کے منکر بھی، الہامی مذاہب پر ایمان رکھنے والے بھی اور لادینیت کے علمبردار بھی، نیز سوشلزم کے حامی بھی اور کیپیٹل ازم کے دلدادہ بھی، اسی طرح یورپی اور امریکی بھی اور ایشیائی اور افریقی بھی، آریائی بھی اور سامی النسل بھی، اس عالمی ادارے کا بنیادی انسانی حقوق سے متعلق جو منشور ہے اُس میں فرد کی شخصی ملکیت کا نہایت واضح الفاظ میں اقرار اور اعلان ہے۔ اس کا مطلب یہ کہ شخصی ملکیت کے جواز پر پوری انسانیت کا اتفاق اور اجماع ہے گویا یہ

[1] المادة ۱۰: يحمى القانون حق الملكية الشخصية للمواطنين فى دخلهم و توفيرهم الناجمين عن عملهم، وفى مساكنهم واقتصادياتهم العائلية، وفى الحاجيات والادوات المنزلية، وفى الاشياء ذات الاستعمال الشخصى، ووسائل الراحة والترفيه، وكذلك حقهم فى ارث الملكية الشخصية للاشياء الخاصة للمواطنين الدستور السوفيتي - ص ۴۸۷

دراسة تحليلية انتقادية - فؤاد محمد شبلى

اما ملكية الأشياء الاستهلاكية من ادوات منزلية ونقود وسلع فالقانون يكفلها من غير قيد، وفى ذلك تقول المادة العاشرة من الدستور السوفيتي:

ويتبين من استقراء النظام السوفيتي ان كافة مايكتسبه المواطن السوفيتي من عمله سواء اكان من الزراعة ام الصناعة ام غيرهما، ملك شخصى له - فى قدرته استخدامه والانتفاع به ونقل ملكيته بالبيع او الهبة كما ان له ان يشترى بدخله الاشياء الاستهلاكية التى تروق له، مثل السيارات وما اليها، او المعاطف او المنازل . . . . الخ ويمكن للمواطن السوفيتي ان يورث الاشياء الاستهلاكية لاولاده او لورثته الآخرين، والنقود حكمها حكم السلع الاستهلاكية۔ ص ۳۰۱

اُن مُسلّمہ اقدار اور عالمگیر صداقتوں میں سے ایک ہے جن کو انسانیت نے ہمیشہ اچھی نظر سے دیکھا اور قابلِ احترام سمجھا، اور اُن فطری حقیقتوں میں سے ایک ہے جس کی ضرورت ہمیشہ محسوس کی گئی اور انسانی فطرت کبھی اُن سے مستغنی اور بے نیاز نہ ہو سکی۔

بہر حال یہ واقعہ ہے جس سے انکار نہیں ہو سکتا کہ شخصی ملکیت سے انسان کی بہت سی انفرادی و اجتماعی اور روحانی و مادی ضرورتیں اور مصلحتیں وابستہ ہیں جو شخصی ملکیت کے بغیر پوری نہیں ہو سکتیں، اپنے شخصی مال ہی کے ذریعے فرد اپنے وہ مالی فرائض انجام دے سکتا ہے جن پر معاشرتی تعلقات کی استواری اور تمدن و اجتماع کی بقا اور تعمیر و ترقی کا دار و مدار ہوتا ہے اسی طرح جن مالی امور کے ذریعے فرد کو اخلاقی فضیلت اور روحانی عظمت حاصل ہوتی ہے جیسے صدقات، انفاق فی سبیل اللہ اور قرض حسنہ وغیرہ وہ بھی مال کی شخصی ملکیت کے بغیر انجام نہیں دیئے جا سکتے، نیز شخصی ملکیت نہ ہو تو افراد اپنی ضرورت سے زیادہ مال و دولت کمانے کے لئے محنت و مشقت اور جد و جہد نہیں کر سکتے جس کی معاشرے کو ہمیشہ ضرورت ہوتی ہے بلکہ اگر یہ کہا جائے تو غلط نہ ہوگا کہ شخصی ملکیت نہ ہوتی تو انسانوں اور عام حیوانوں کی طرز زندگی میں کچھ خاص فرق نہ ہوتا۔

قرآن حکیم چونکہ انسانی حقوق کا محافظ، عدل و انصاف کا علمبردار، حقائق فطرت کا ترجمان، اعلیٰ انسانی اقدار اور عالمگیر سچائیوں کا مجموعہ، مصالح بشریہ کا نگہبان اور اصولِ اجتماع و تمدن کا معلّم اور مبلّغ ہے لہٰذا کیسے ممکن تھا کہ وہ افراد کی شخصی ملکیت کو نہ مانتا، اور اُس کو وہ اہمیت نہ دیتا جس کی کہ وہ مستحق تھی۔

قرآن حکیم میں جو معاشی تعلیمات ہیں وہ دراصل افراد کی شخصی ملکیت پر مبنی ہیں لہٰذا اگر شخصی ملکیت کا انکار کر دیا جائے تو اس سے قرآن حکیم کے ایک بڑے حصے کا انکار ہو جاتا ہے، قرآن حکیم میں زکاۃ و صدقات، انفاق فی سبیل اللہ اور قرض حسنہ، مالی احسان و ایثار، مہر اور بدل خلع، نفقہ اور حضانت، مال یتیم کی حفاظت، دیت و خون بہا، وصیت اور وراثت، بیع و شراء بخس اور ناپ تول میں کمی، امانت و خیانت، سود اور قمار، چوری اور رشوت، بخل و سخاوت اور اسراف و تبذیر وغیرہ کے متعلق جو احکام ہیں وہ اس بات کا بیّن اور قطعی ثبوت ہیں کہ قرآن حکیم

شخصی ملکیت کے وجود اور جواز کا قائل اور اُس کا پُورا تحفظ چاہتا ہے کیونکہ ان مذکورہ الفاظ میں سے ہر لفظ کا جو عرفی معنی و مفہوم اور اس کی جو تعریف اور ماہیت ہے شخصی ملکیت اُس کا ایک لازمی جُز اور لاینفک حصہ ہے یہاں تک کہ شخصی ملکیت کے بغیر ان کا تصور بھی نہیں ہو سکتا۔ غرضیکہ اگر شخصی ملکیت کی نفی کر دی جائے تو پھر مذکورہ امور اور ان کے متعلق قرآنی احکام کا کوئی معنیٰ و مطلب ہی باقی نہیں رہتا اور وہ مہمل اور فضول قرار پاتے ہیں لہٰذا قرآن مجید پر ایمان رکھنے والا کبھی بھی افراد کی شخصی و انفرادی ملکیت کا انکار نہیں کر سکتا۔

بنا بریں قرآن کے تصور ملکیت کی بحث میں، اس پہلو پر بحث کرنا کہ قرآن مجید شخصی ملکیت کو مانتا ہے یا نہیں مانتا؟ ایک بدیہی چیز کو نظری بنانا اور خواہ مخواہ وقت ضائع کرنا ہے، اس بحث میں میرے پیش نظر جو پہلو ہیں اُن میں سے ایک یہ کہ قرآن مجید کے نزدیک انسان کی شخصی ملکیت کی اصل حقیقت کیا ہے۔ اور دوسرا پہلو یہ کہ قرآن حکیم کے نزدیک وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر کوئی شخص کسی چیز کا مالک قرار پاتا ہے ابتدائی ملکیت کے اسباب کیا ہیں اور انتقال ملکیت کے اسباب کیا؟ اور پھر تیسرا پہلو یہ کہ قرآن مجید، ذرائع پیداوار اور اشیائے صرف دونوں کے متعلق فرد کی شخصی ملکیت تسلیم کرتا ہے یا بعض چیزوں کے متعلق تسلیم کرتا ہے اور بعض کے متعلق نہیں کرتا؟ فقط یہ تین پہلو ہیں جن پر مجھے اس مقالے میں کچھ عرض کرنا ہے۔

اوّل الذکر کے متعلق عرض ہے کہ جہاں تک حقیقی، کامل اور دائمی ملکیت کا تعلق ہے وہ صرف اللہ تعالےٰ کے لئے مخصوص ہے دوسرا کوئی اُس کے ساتھ اس میں شریک نہیں، صرف وہی ہر شے کا حقیقی، مستقل، کامل اور دائمی مالک ہے انسان اس معنے کر کے نہ کسی شے کا مالک ہے اور نہ ہو سکتا ہے بلکہ دوسری تمام اشیاء کی طرح وہ خود بھی اللہ تعالےٰ کا مملوک ہے، کیونکہ حقیقی ملکیت کا مطلب ہے کسی شے میں تصرف کر سکنے کا ذاتی اختیار جو کسی کو دوسرے کی طرف سے نہیں بلکہ خود بخود حاصل ہوا ہو، کامل ملکیت کا مطلب ہے کسی شے میں تصرف کر سکنے کا پورا اور کلی اختیار جس میں دوسرے کی طرف سے کسی تصرف پر کوئی پابندی نہ

ہو۔ اور دائمی ملکیت کا مطلب ہے کسی شے میں تصرف کا ابدی اور دائمی اختیار جو کبھی بھی زائل اور ختم نہ ہو سکتا ہو، اور چونکہ ایک انسان کو کسی شے میں تصرف کا جو اختیار حاصل ہوتا ہے وہ اُس کا ذاتی نہیں ہوتا بلکہ مالک حقیقی کا عطا کردہ ہوتا ہے، اسی طرح اسے ہر تصرف کا کلی اختیار نہیں ہوتا بلکہ بعض تصرفات کا جزوی اور ناقص اختیار ہوتا ہے یعنی وہ ہر تصرف میں آزاد نہیں ہوتا بلکہ بعض تصرفات میں آزاد اور بعض میں مالک حقیقی کی طرف سے پابند ہوتا ہے، نیز اُسے جو اختیار تصرف حاصل ہوتا ہے وہ دائمی اور ناقابل زوال نہیں ہوتا بلکہ وقتی اور قابل زوال ہوتا ہے لہذا کوئی انسان کسی شے کا حقیقی، کامل اور دائمی مالک نہیں ہوتا اور نہ کبھی ہو سکتا ہے، اس لئے کہ کسی شے کا حقیقی مالک صرف وہ ہو سکتا ہے جس نے اُس شے کو پیدا کیا اور عدم سے وجود میں لایا ہو، اور چونکہ اللہ ہی نے ہر شے کو پیدا کیا اور وہی ہر شے کا خالق اور پروردگار ہے اس کے سوا دوسرا کوئی کسی شے کا خالق اور پروردگار نہیں لہذا ہر شے کا حقیقی مالک بھی اللہ تعالےٰ ہے۔ اسی طرح ہر شے کا کامل مالک بھی صرف وہ ہو سکتا ہے جو اُس میں ہر تصرف کی قدرت رکھتا اور جس کا ہر تصرف صحیح اور درست ہو، اور چونکہ یہ شان بھی صرف اللہ تعالےٰ ہی کی ہے وہ ہر شے میں ہر تصرف کی کامل قدرت بھی رکھتا ہے اور اُس کا ہر تصرف ہمیشہ صحیح اور درست بھی ہوتا ہے، اللہ کے سوا دوسرا کوئی نہ تو ہر تصرف کی قدرت رکھتا اور نہ کسی کا ہر تصرف صحیح و درست ہوتا ہے لہذا اللہ تعالےٰ ہی ہر شے کا کامل مالک ہے کوئی انسان کسی چیز کا کامل مالک نہیں، نیز ہر شے کا دائمی مالک بھی صرف وہ ہو سکتا ہے جو ہمیشہ قائم اور باقی رہنے والا ہو اور جس کے لئے فنا اور ہلاکت نہ ہو، اور چونکہ یہ شان بھی صرف اللہ تعالےٰ ہی کی ہے وہی ہمیشہ زندہ اور باقی رہنے والا ہے اُس کے سوا اور کسی کے لئے دائمی حیات و بقا نہیں کُلُّ شَیْءٍ هَالِكٌ اِلَّا وَجْهَهٗ وَكُلُّ مَنْ عَلَيْهَا فَانٍ وَّيَبْقٰى وَجْهُ رَبِّكَ ذُو الْجَلَالِ وَالْاِكْرَامِ لہذا اللہ تعالےٰ کے سوا دوسرا کوئی کسی شے کا دائمی مالک نہیں۔

غرضیکہ جہاں تک حقیقی، مستقل، کامل اور دائمی ملکیت کا تعلق ہے اللہ تعالےٰ ہی ہر شے کا مالک ہے کوئی انسان اس لحاظ سے کسی چیز کا مالک نہیں۔ قرآن حکیم میں ایسی آیات کی تعداد بیس سے زیادہ ہے جن میں حصر کے ساتھ یہ فرمایا گیا ہے کہ اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ کہ

آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے مثلاً

لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۝ اِنَّ اللّٰهَ هُوَ الْغَنِيُّ الْحَمِيْدُ ۝

اللہ ہی کے لئے ہے جو کچھ کہ آسمانوں میں ہے اور جو کچھ کہ زمین میں ہے بیشک اللہ ہی غنی اور مستحق حمد و ثنا ہے۔

چونکہ اس قسم کی قرآنی آیات میں لام تملیک کے لئے ہے اور ترکیب نحوی کے لحاظ سے خبر، مبتدا پر مقدم ہے لہذا ان سے یہ مطلب پیدا ہوتا ہے کہ آسمانوں اور زمین میں جتنی چیزیں ہیں صرف اللہ ہی کی ملکیت ہیں اور تنہا وہی سب اشیاء کا حقیقی، کامل اور دائمی مالک ہے۔

قرآن مجید میں، اللہ تعالےٰ کی جن صفات کا ذکر ہے اُن میں سے ایک صفت، مالکیت ہے یہ صفت صریح طور پر جن آیات میں مذکور ہے اُن میں سے ایک سورۂ فاتحہ کی آیت مٰلِكِ يَوْمِ الدِّيْنِ ہے اور دوسری سورہ آل عمران کی آیت: اَللّٰهُمَّ مٰلِكَ الْمُلْكِ ہے۔ اور جن آیات میں اس صفت کا دلالۃ ذکر ہے وہ بیسیوں سے زیادہ ہیں، مثلاً لِلّٰهِ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ، اور لَهٗ مَا فِي السَّمٰوٰتِ وَمَا فِي الْاَرْضِ ۝ لہذا ایمان باللہ میں ضروری ہے کہ مسلمان کا دوسری صفات کی طرح اللہ کی صفت مالکیت پر بھی ایمان ہو، یعنی یہ اعتقاد ہو کہ اللہ کو کائنات کی ہر شے میں ہر قسم کے تصرف کا کلی حقیقی اور دائمی اختیار ہے، اس کا ہر تصرف درست ہے اور اُس کے کسی تصرف پر کسی کو اعتراض کا حق نہیں بلکہ ایک مومن کی شان یہ ہے کہ وہ اللہ کے ہر تصرف پر راضی رہے اور اُسے صحیح یقین کرے، نیز یہ اعتقاد رکھے کہ انسان کی ملکیت میں جو اشیاء ہیں اُن کا وہ حقیقی مالک نہیں بلکہ مجازی مالک ہے لہذا وہ اُن میں جو چاہے تصرف نہیں کر سکتا بلکہ صرف ایسے تصرفات کر سکتا ہے جو مالک حقیقی کی مرضی کے مطابق ہوں، بالفاظ دیگر وہ اپنی مملوکہ چیزوں میں ہر تصرف کا اختیار نہیں رکھتا بلکہ صرف اُن تصرفات کا اختیار رکھتا ہے جن کا اللہ مالک حقیقی نے اسے اختیار دیا ہے۔ اور یہ کہ اُس کے بعض تصرفات جائز اور بعض ناجائز ہو سکتے ہیں اور بحیثیت مسلمان کے وہ پابند ہے کہ جائز تصرفات کرے اور

ناجائز تصرفات سے بچے۔

غرضیکہ جس طرح ایک مسلمان کے لئے اللہ تعالےٰ کی دوسری ہر صفت پر ایمان لانا اور اُس کا اقرار کرنا ضروری ہے اس طرح اللہ کی صفت مالکیت پر اعتقاد رکھنا اور اس کا اقرار کرنا بھی ضروری ہے حتیٰ کہ جو اللہ کی اس صفت کا انکار کرے وہ مومن نہیں ہوسکتا بلکہ دائرہ اسلام سے خارج ہوجاتا ہے۔

اور جیسا کہ میں نے عرض کیا کہ حقیقی مالک کسی شے کا وُہ ہوسکتا ہے جس نے اُس شے کو پیدا کیا اور عدم سے وجود میں لایا ہو اور چونکہ اللہ ہی نے ہر شے کو پیدا کیا اور وہی ہر شے کا خالق اور موجد ہے لہٰذا اللہ ہی ہر شے کا حقیقی مالک ہے اور انسان چونکہ کسی چیز کا خالق اور موجد نہیں لہٰذا وہ کسی چیز کا حقیقی مالک بھی نہیں، انسان کسی شے کا خالق نہیں، یہ بات حقیقت واقعہ کے عین مطابق اور بالکل صحیح ہے۔

کیونکہ یہ واقعہ ہے کہ انسان کسی بڑی چیز کو تو کیا ایک ذرے تک کو پیدا نہیں کرسکتا، انسان کو اللہ تعالےٰ نے فکر و عمل کی جو صلاحیتیں بخشی ہیں اُن کے ذریعے جو کچھ کرتا یا کرسکتا ہے صرف یہ کہ تحلیل و ترکیب کے عمل سے مادی اشیاء کی شکلوں کو ادلتا بدلتا ہے اور ان میں نئے نئے تغیر و تبدل کا باعث بنتا ہے، گویا ایک انسان کے ذریعے عالم موجودات میں اگر کسی چیز کا اضافہ ہوتا ہے تو صرف ان تغیرات و تبدلات کا ہوتا ہے جو اس کی سعی و محنت سے وجود میں آتے اور مادی اشیاء کے ساتھ مختلف شکلوں میں قائم ہوجاتے ہیں۔

مثال کے طور پر لوہے کو لیجئے جس سے ہم اپنی زندگی میں بہت کچھ فائدہ اُٹھاتے ہیں۔ جہاں تک اُس کے قدرتی مادے کا تعلق ہے یعنی اُن ذرّات کا جن کے مرکب کو لوہا کہا جاتا ہے انسان اُس کا ایک ذرہ بھی کبھی پیدا نہیں کرسکتا، ایک انسان جو کرتا ۔۔۔۔ ہے وُہ یہ کہ اللہ کے پیدا کردہ لوہے میں عمل ترکیب و تحلیل کے ذریعے تصرف کرکے اُس سے مختلف شکلوں کے آلات و اوزار بناتا اور اپنی ضروریات کے اسباب تیار کرتا ہے، اس طرح انسانی سعی و عمل سے جو نئی چیزیں وجود میں آتی ہیں وُہ صرف وُہ تغیرات و تبدلات ہوتے ہیں جو مختلف شکلوں میں قدرتی مواد کے ساتھ قائم ہوجاتے ہیں، بنا بریں اگر ایک

انسان کسی چیز کا مالک کہلا سکتا ہے تو صرف اُن تغیرات و تبدلات اور اُن مختلف شکلوں کا کہلا سکتا ہے جو بظاہر اُس کی سعی و محنت سے وجود میں آتے ہیں، بظاہر کا لفظ میں نے اس لئے کہا کہ غور سے دیکھا جائے تو حقیقت میں یہ تغیرات و تبدلات بھی اللہ ہی کی تخلیق سے پیدا ہوتے اور وہی اُن کا بھی خالق ہوتا ہے۔ کیونکہ جن بے شمار اسباب و عوامل پر انسانی سعی و محنت کا دار و مدار ہوتا ہے جیسے ہوا، روشنی، حرارت اور غذائی اشیاء وغیرہ ظاہر ہے کہ اگر ان میں سے ایک شے بھی موجود نہ ہو تو نہ صرف یہ کہ انسان کوئی سعی و محنت نہیں کر سکتا بلکہ سرے سے زندہ ہی نہیں رہ سکتا وہ سب کے سب اللہ کے پیدا کردہ اور اسی کی قدرت و اختیار میں ہیں۔ نیز وہ دماغی و جسمانی صلاحیتیں بھی تو اللہ ہی کی پیدا کردہ ہیں جن کے ذریعے انسان سعی و محنت کرتا ہے، چنانچہ قرآن حکیم میں ارشاد باری تعالیٰ ہے: وَاللّٰهُ خَلَقَكُمْ وَمَا تَعْمَلُوْنَ ۝ اور اللہ نے تمہیں پیدا کیا اور اُس کو جو تم کرتے ہو یعنی اللہ ہی تمہارا خالق بھی ہے اور تمہارے اعمال کا خالق بھی، اس آیت سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ انسانی اعمال اور اُن سے پیدا ہونے والے نتائج و اثرات کا خالق بھی دراصل اللہ ہی ہے۔ یہ بات قرآن حکیم کی ایک دوسری آیت سے بھی صاف ثابت ہوتی ہے وہ آیت یہ ہے: اَللّٰهُ خَالِقُ كُلِّ شَيْءٍ ۝ اور اللہ ہی ہر شے کا خالق ہے، اور چونکہ انسانی سعی و محنت اور اُس کے اثرات و نتائج بھی لفظ شے کا مصداق ہیں لہٰذا كُلُّ شَيْءٍ کے اندر وہ بھی آجاتے ہیں لہٰذا اس آیت سے ثابت ہو جاتا ہے کہ انسانی سعی و محنت اور اس کے اثرات و نتائج کا خالق بھی درحقیقت اللہ ہی ہے۔ اور وہی اُن کا حقیقی مالک بھی ہے۔

انسانی ملکیت جیسا کہ میں پہلے عرض کر چکا ہوں حقیقی ملکیت نہیں بلکہ مجازی ملکیت ہے اسی طرح مستقل بالذات ملکیت نہیں بلکہ اللہ کی حقیقی اور مستقل ملکیت کے تابع اور ماتحت ملکیت ہے چنانچہ یہی وجہ ہے کہ ایک ہی شے میں اللہ کی ملکیت اور انسان کی ملکیت دونوں جمع ہو سکتی ہیں اور ایک ہی شے حقیقی ملکیت کے لحاظ سے اللہ کی مملوک اور مجازی ملکیت کے لحاظ سے انسان کی مملوک ہو سکتی ہے اور اُن میں کوئی تعارض اور ٹکراؤ پیدا نہیں ہوتا اس لئے کہ مجازی مالک اپنی مملوکہ شے میں کسی ایسے تصرف کا مجاز نہیں ہوتا جو مالک حقیقی کی

مرضی کے خلاف ہو، اسی طرح چونکہ اللہ کی ملکیت میں ذاتی انتفاع کا تصور نہیں لہذا وہ انسانی ملکیت کے ساتھ جمع ہو سکتی ہے جس میں کہ ذاتی انتفاع کا تصور ہوتا ہے، یہی وجہ ہے کہ دو شخصوں کی دو مستقل ملکیتیں ایک شے میں جمع نہیں ہو سکتیں کیونکہ دونوں کے اندر مالک کے ذاتی انتفاع کا تصور موجود ہوتا ہے لہذا اُن میں ضرور تعارض اور ٹکراؤ پیدا ہوتا ہے اور کسی ایک کی بھی ملکیت عملاً متحقق نہیں ہوتی۔

فقہاء اور علمائے قانون نے شخصی ملکیت کی جو تعریفیں لکھی ہیں ان سب کا حاصل یہ ہے کہ کسی شے کا کسی شخص کے لئے اس طرح مخصوص ہونا کہ وہ شخص تو اُس میں تصرف کر کے اس سے فائدہ اُٹھا سکے لیکن کسی دوسرے کے لئے اُس کی اجازت کے بغیر اُس شے میں تصرف کرنا اور اُس سے فائدہ اٹھانا جائز نہ ہو، بالفاظ دیگر، کسی شے سے انتفاع و استفادے کے حق کا کسی شخص کے لئے مخصوص ہونا کہ دوسرا کوئی اس کی رضامندی کے بغیر اس شے سے انتفاع و استفادہ نہ کر سکے۔

انسان کی شخصی ملکیت کا یہی وہ مفہوم و مطلب ہے جو دنیائے انسانیت میں ہمیشہ متعارف رہا اور سب انسانی معاشرے اسے مانتے اور اس پر عمل کرتے رہے، یہ دوسری بات ہے کہ کہیں اس کو رواج کے تحت، کہیں وضعی قانون کے تحت اور کہیں شریعت الٰہیہ کے تحت مانا اور تسلیم کیا گیا، قرآن حکیم بھی اسی معنے و مطلب کے لحاظ سے فرد کی شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا اور اُس کے متعلق اپنے مخصوص احکام دیتا ہے۔ یعنی قرآن حکیم یہ تسلیم کرتا ہے کہ بعض اسباب کی بنا پر، بعض اشیاء، خاص افراد و اشخاص کے انتفاع و استفادے کیلئے مخصوص ہو جاتی ہیں چنانچہ وہ خاص افراد و اشخاص تو اُن اشیاء میں ہر ایسا تصرف کر سکتے ہیں جو دنیوی یا اُخروی لحاظ سے مفید اور نفع بخش ہو البتہ کوئی ایسا تصرف اُن کے لئے بھی جائز نہیں ہوتا جو مُضر اور نقصان دہ ہو، لیکن دوسرے افراد و اشخاص، اُن اشیاء میں اُس وقت تک نہ کوئی تصرف کر سکتے اور نہ اُن سے فائدہ اٹھا سکتے ہیں جب تک کہ اُن خاص افراد و اشخاص کی طرف سے اُن کو رضامندانہ اجازت نہ ہو۔ اور اگر وہ بلا اجازت کوئی مالکانہ تصرف کریں اور اُن سے فائدہ اٹھائیں تو شرعاً مجرم اور گنہگار قرار پاتے ہیں۔

قرآن حکیم کے نزدیک انسانی ملکیت کی جو حقیقت اور حیثیت اور اُس کا جو مفہوم و مطلب ہے اُس کی کچھ تفصیل اور وضاحت ہو جانے کے بعد اب میں، مسئلہ ملکیت کے دوسرے پہلو پر کچھ عرض کرنا چاہتا ہوں، یعنی یہ کہ وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر قرآن حکیم افراد کی انفرادی اور شخصی ملکیت کو تسلیم کرتا اور وہ اسباب کیا ہیں جن کی بنا پر وہ انفرادی اور شخصی ملکیت کو تسلیم نہیں کرتا، اور میں سمجھتا ہوں یہ پہلو خصوصی اہمیت کا حامل ہے اور اس پر غیر معمولی توجہ دینے کی ضرورت ہے۔

اس سلسلہ میں پہلی بات جس کا ذکر ضروری ہے وہ یہ کہ قرآن مجید میں بکثرت ایسی آیات ہیں جن سے صاف واضح ہوتا ہے کہ کائنات ارضی میں جتنی بھی اشیاء ہیں وہ عناصر ہوں یا جمادات، نباتات ہوں یا حیوانات، وہ سب کی سب اشیاء اللہ تعالیٰ نے بنی نوع انسان کے تمتع و انتفاع کے لئے پیدا فرمائی ہیں، ایسی قرآنی آیات میں سے چند یہ ہیں:

(۱) هُوَ الَّذِیْ خَلَقَ لَكُمْ مَّا فِی الْاَرْضِ جَمِیْعًا ۝ البقرہ — اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے زمین کی سب چیزوں کو پیدا فرمایا۔

(۲) وَلَكُمْ فِی الْاَرْضِ مُسْتَقَرٌّ وَّمَتَاعٌ اِلٰى حِیْنٍ ۝ البقرہ — اور تمہارے لئے زمین میں ٹھہرنا اور فائدہ اٹھانا ہے ایک وقت تک۔

(۳) وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ الرحمٰن — اور زمین، اس کو خاص وضع سے بنایا اور رکھا زندہ مخلوقات کے لئے۔

(۴) وَلَقَدْ مَكَّنّٰكُمْ فِی الْاَرْضِ وَجَعَلْنَا لَكُمْ فِیْهَا مَعَایِشَ ۝ اعراف — اور بے شک ہم نے زمین میں تمہیں ٹھہرایا اور ٹھکانا دیا اور اُس میں تمہارے لئے سامان معاش مہیا کیا۔

(۵) وَالْاَنْعَامَ خَلَقَهَا لَكُمْ فِیْهَا دِفْءٌ وَّمَنَافِعُ وَمِنْهَا تَاْكُلُوْنَ ۝ النحل — اور چوپائے اللہ نے پیدا کیا ان کو تمہارے لئے۔ اُن میں گرمی کا سامان ہے یعنی اُون اور بہت سے منافع ہیں اور بعض اُن میں سے وہ ہیں جنہیں تم کھاتے ہو، یعنی اُن کا گوشت۔

(۶) وَاَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً فَاَخْرَجَ بِهٖ مِنَ الثَّمَرٰتِ رِزْقًا لَّكُمْ ۔ البقرہ و ابراہیم

اور اُس نے برسایا آسمان سے پانی، پس نکالے اُس کے ذریعے مختلف قسم کے پھل رزق کے طور پر تمہارے لئے۔

(۷) هُوَ الَّذِیْٓ اَنْزَلَ مِنَ السَّمَآءِ مَآءً لَّكُمْ مِّنْهُ شَرَابٌ وَّمِنْهُ شَجَرٌ فِيْهِ تُسِيْمُوْنَ ۝ يُنْۢبِتُ لَكُمْ بِهِ الزَّرْعَ وَالزَّيْتُوْنَ وَالنَّخِيْلَ وَالْاَعْنَابَ وَمِنْ كُلِّ الثَّمَرٰتِ ۝

النحل

اللہ وہ ہے جس نے تمہارے لئے آسمان سے پانی اتارا، اس میں سے کچھ تمہارے پینے میں آتا ہے کچھ سے درخت اگتے ہیں جو تم مویشیوں کو چراتے ہو، وہ اس پانی کے ذریعے غلے کی کھیتیاں اگاتا ہے اور زیتون اور کھجور کے درخت اور انگور اور ہر قسم کے پھل میوے، بلاشک اس میں بڑی نشانی اور ہدایت ہے اُن کے لئے جو غور و فکر سے کام لیتے ہیں۔

(۸) اُحِلَّ لَكُمْ صَيْدُ الْبَحْرِ وَطَعَامُهٗ مَتَاعًا لَّكُمْ

حلال کر دیا گیا ہے تمہارے لئے دریا کا شکار اور اُس کا کھانا تمہارے فائدے کے لئے۔

(۹) وَالْاَرْضَ بَعْدَ ذٰلِكَ دَحٰهَا ۝ اَخْرَجَ مِنْهَا مَآءَهَا وَمَرْعٰهَا ۝ وَالْجِبَالَ اَرْسٰهَا ۝ مَتَاعًا لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝

اس کے بعد زمین کو ہموار کر کے بچھایا، اس میں سے پانی نکالا اور چارہ اُگایا اور پہاڑوں کو مضبوطی کے ساتھ جمایا تمہارے فائدے کے لئے اور تمہارے مویشیوں کے لئے۔

(۱۰) اِنَّا صَبَبْنَا الْمَآءَ صَبًّا ۝ ثُمَّ شَقَقْنَا الْاَرْضَ شَقًّا ۝ فَاَنْۢبَتْنَا

بے شک ہم نے خوب پانی برسایا، پھر زمین کو پھاڑا، پھر اس میں اُگایا

فِيهَا حَبًّا وَّ عِنَبًا وَّ قَضْبًا	غلہ، انگور، ترکاریاں زیتون، کھجور
وَّ زَيْتُوْنًا وَّ نَخْلًا وَّ حَدَآئِقَ	اور گھنے باغ اور پھل اور چارہ
غُلْبًا وَّ فَاكِهَةً وَّ اَبًّا مَّتَاعًا	تمہارے فائدہ کے لئے اور تمہارے
لَّكُمْ وَلِاَنْعَامِكُمْ ۝	مویشیوں کے فائدہ کے لئے۔

ان قرآنی آیات کے سیاق و سباق اور مضمون پر غور کیا جائے تو نظر آتا ہے کہ ان میں جو خطاب ہے وہ کسی خاص رنگ و نسل اور خاص زمان و مکان سے تعلق رکھنے والے انسانوں سے مخصوص نہیں بلکہ سب انسانوں کے ساتھ اُس کا یکساں تعلق ہے اس لئے بھی کہ ان آیات میں جن قدرتی اشیاء کا ذکر ہے وہ بعض انسانوں کی احتیاج اور ضرورت سے نہیں بلکہ سب انسانوں کی حاجت و ضرورت سے تعلق رکھتی ہیں، ۔۔۔۔۔ اور ان پر ہر انسان کی حیات و بقا اور نشو و نما کا دارو مدار اور انحصار ہے۔ اور اس لئے بھی کہ جس اللہ کی طرف ان اشیاء کے پیدا اور مہیا کرنے کی نسبت ہے وہ بعض انسانوں کا نہیں بلکہ سب انسانوں کا یکساں رب اور پروردگار ہے۔ نیز اسلئے بھی کہ قرآن مجید، کسی زمان و مکان سے تعلق رکھنے والے مخصوص افراد کی ہدایت کے لئے نہیں بلکہ ہر زمان و مکان اور ہر نسل و قوم سے تعلق رکھنے والے سب انسانوں کے لئے کتاب ہدایت ہے، لہٰذا مذکورہ قرآنی آیات کا مطلب یہ قرار پاتا ہے کہ ان کے اندر جن اشیاء اور وسائل رزق کا ذکر ہے وہ تمام بنی نوع انسان کے تمتع اور انتفاع کے لئے عام ہیں اور نوع انسان کا ہر ہر فرد اُن سے متمتع ہونے اور فائدہ اٹھانے کا مساوی حق رکھتا ہے، اس طرح ان آیات میں گویا اس اصول کا اعلان ہے کہ قدرتی اشیاء سے فائدہ اٹھانے اور نفع حاصل کرنے کا دنیا کے ہر انسان کو یکساں حق ہے اور ہر انسان کیلئے ان سے فائدہ اٹھانے کا موقع ہونا چاہیئے۔

اسی طرح قرآن حکیم میں کچھ آیات اس قسم کی بھی ہیں جن سے ثابت ہوتا ہے کہ اللہ تعالیٰ نے جو کائنات ۔۔۔۔ کا حقیقی حکمراں اور اصل بادشاہ ہے انسان کو زمین میں خلیفہ اور بادشاہ بنایا ہے، اس کا ایک مطلب یہ کہ اُس نے انسان کو ایسی دماغی اور جسمانی صلاحیتیں اور ایسی فکری و عملی قوتیں عطا فرمائی ہیں جن کے ذریعے وہ کائناتِ ارضی کی تمام مخلوقات میں تصرف

کر سکتا اُن سے خدمت لے سکتا اور فائدہ اُٹھا سکتا ہے چنانچہ یہ وُہ حقیقت ہے جس کا عام طور پر مشاہدہ ہو رہا ہے، اس حقیقت کو لفظِ خلافت سے تعبیر کر کے گویا انسان کو اس پر متنبہ کیا گیا ہے کہ وُہ اپنے تصرفات میں بالکل آزاد اور خود مختار نہیں بلکہ حقیقی بادشاہ کی مرضی کا پابند ہے اور اللہ چونکہ فساد و تخریب نہیں چاہتا بلکہ اصلاح و تعمیر چاہتا ہے لہذا انسان کو چاہیئے کہ وُہ ایسے تصرفات عمل میں لائے جو تعمیری اور مفید ہوں، اور ایسے تصرفات سے بچے جو تخریبی اور مُضر ہوں، بالفاظ دیگر صرف ایسے تصرفات کرے جن سے قدرتی اشیاء کی قدرتی افادیت میں زیادہ سے زیادہ اضافہ ہو اور انسان کو زیادہ سے زیادہ فائدہ پہنچے۔ اِس قسم کی قرآنی آیات کی تعداد آٹھ ہے اور اُن میں سے بعض یہ ہیں۔

(۱) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ الْاَرْضِ ۝ الانعام — وُہ اللہ جس نے تمہیں زمین کے خلیفے اور بادشاہ بنایا۔

(۲) اَمَّنْ یُّجِیْبُ الْمُضْطَرَّ اِذَا دَعَاهُ وَیَكْشِفُ السُّوْٓءَ وَیَجْعَلُكُمْ خُلَفَآءَ الْاَرْضِ ۝ النمل — اللہ کے سوا کون ہے جو پریشان حال کو اس کی پکار کا جواب دیتا اور اس کی پریشانی کو دُور کرتا ہے اور جو تمہیں زمین کے خلفاء اور بادشاہ بناتا ہے؟

(۳) هُوَ الَّذِیْ جَعَلَكُمْ خَلٰٓئِفَ فِی الْاَرْضِ فَمَنْ كَفَرَ فَعَلَیْهِ كُفْرُهٗ ۝ فاطر — وُہ اللہ وُہ ہے جس نے تمہیں زمین میں خلیفے اور بادشاہ بنایا، پس جس نے اس نعمت کی ناشکری کی، اُس کی ناشکری کا ضرر اس پر ہوگا۔

اس مضمون کی آیات سے جہاں یہ ظاہر ہوتا ہے کہ اللہ نے انسان کو اپنی مخلوقات میں تصرف کی قدرت اور اجازت عطا فرمائی ہے وہاں یہ بھی ثابت ہوتا ہے کہ یہ اجازت انسان کو صرف ایسے تصرف کیلئے عطا فرمائی گئی ہے جو مفید اور نفع بخش ہو اور جس سے قدرتی اشیاء کی افادیت میں اضافہ ہوتا ہو، نیز ان آیات سے یہ بھی مفہوم ہوتا ہے کہ قدرتی اشیاء

میں مفید تصرف کی اجازت چونکہ نوع انسان کے لئے ہے لہٰذا ہر فرد انسان کو یہ اجازت حاصل ہے، اور یہ کہ اللہ تعالےٰ یہ چاہتا ہے کہ ہر انسان اس اجازت سے فائدہ اُٹھائے تاکہ اللہ تعالےٰ نے اس کو جو دماغی وجسمانی اور فکری وعملی صلاحیتیں دی ہیں وہ بے کار ضائع نہ ہوں۔

اس پہلی بات میں جو دو قسم کی قرآنی آیات پیش کی گئی ہیں اُن کے مضمون کا خلاصہ یہ ہے کہ اللہ تعالےٰ نے جو ہر شے کا خالق اور حقیقی مالک اور اصل بادشاہ ہے اپنی مملوکہ اشیاء سے نوع انسان کے ہر ہر فرد کو فائدہ اُٹھانے اور فائدے کی خاطر اُن میں مفید تصرف کرنے کی اجازت عطا فرمائی ہے لہٰذا ہر انسان ہر قدرتی شے میں تصرف کرکے اس سے فائدہ اٹھا سکتا ہے اور اس میں کسی کو کسی پر کوئی ترجیح وتخصیص حاصل نہیں بلکہ سب انسان یکساں اور برابر ہیں، بالفاظ دیگر ان آیات سے یہ اصولی تصوّر پیدا ہوتا ہے کہ جب تک کوئی قدرتی چیز اپنی قدرتی حالت اور شکل پر باقی اور برقرار ہو کوئی انسان اُس کا مالک نہیں کہلا سکتا اور یہ نہیں کہہ سکتا کہ وہ چیز صرف اسکے انتفاع واستفادے کے لئے مخصوص ہے۔

اس سلسلہ میں دوسری بات جو قرآن حکیم سے دلالۃً اور احادیث نبویہ سے صراحۃً سامنے آتی ہے وہ یہ کہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل وسبقت کرکے کسی قدرتی شے میں ایسا تصرف کرتا ہے جس سے اس کی قدرتی ہیئت وشکل بدل جاتی اور اُس کی افادیت میں اضافہ ہو جاتا ہے تو وہ شے اس شخص کے انتفاع واستفادے کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے اور اب دوسرا کوئی شخص اس شخص کی رضامندی کے بغیر اُس شے سے استفادہ نہیں کر سکتا، بالفاظ دیگر وہ شخص اس شے کا مالک بن جاتا ہے اور وہ اس کے مالکانہ تصرف کے لئے مخصوص ہو جاتی ہے۔

مثال کے طور پر دریا کے پانی کو لیجئے جب تک وہ دریا میں اپنی قدرتی حالت پر رہتا ہے اُس کا ایک ایک قطرہ نوع انسان کے ہر ہر فرد کے استفادہ کے لئے مباح عام ہوتا ہے لیکن جب کوئی شخص آگے بڑھ کر دریا کا کچھ پانی اپنے چُلّو وغیرہ میں اٹھا لیتا ہے تو چونکہ اس سے اس کی قدرتی حالت میں تغیر اور افادیت میں کچھ اضافہ ہو جاتا ہے لہٰذا یہ اُٹھایا ہوا پانی اس شخص کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتا ہے اور وہ اس کا مالک قرار پاتا ہے، ایسی

ہی مثال جنگلی جانوروں، قدرتی پھلوں اور ترکاریوں وغیرہ کی ہے جب کوئی شخص دوسرے سے سبقت کرکے جنگل جاتا اور وہاں سے کوئی جانور پکڑا اور پھل وغیرہ توڑ کر آبادی میں لے آتا ہے تو ظاہر ہے کہ اس سے اس کی قدرتی حالت بدلتی اور اس میں ایک نئی افادیت پیدا ہوتی ہے یعنی اب اُس جانور یا پھل وغیرہ سے فائدہ اٹھانا آسان ہوجاتا ہے نسبت اس کے کہ وہ جنگل میں اپنی قدرتی حالت پر تھا لہذا یہ جانور یا پھل جو پہلے مباح عام کی حیثیت رکھتا اور ہر انسان کے فائدے کے لئے عام تھا اب اُس خاص شخص کے فائدہ کے لئے مخصوص ہوجاتا ہے۔

مذکورہ اصول جن احادیث نبویہ سے صراحتہً ثابت ہوتا ہے ان میں سے ایک حدیث یہ ہے: مَنْ سَبَقَ الی مالم یسبق الیہ احد فھولہ جو تصرف کے لئے پہلے پہنچ گیا اُس شے کی طرف جس کی طرف کوئی دوسرا نہیں پہنچا تھا پس وہ شے اُس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہوگئی، ایک اور حدیث جو زمین کے متعلق ہے فرمایا: مَنْ اَحْیَا اَرْضًا مَیِّتَۃً فَھِیَ لَہٗ ہ جس نے شجر وغیرہ آباد زمین کو آباد کیا وہ اُس کے لئے مخصوص ہوگئی۔ دوسری حدیث کے الفاظ ہیں فَھُوَ اَحَقُّ بِھَا، پس وہ اُس خطہ زمین کا بنسبت دوسروں کے زیادہ حقدار ہو گیا ہے، یعنی اس خطہ زمین سے انتفاع و استفادے کے حق میں اس کو دوسروں پر ترجیح و تخصیص حاصل ہوجاتی ہے جس کا دوسرا نام شخصی ملکیت ہے۔

قرآن حکیم میں اس اصول کا ذکر اگرچہ صراحتہً موجود نہیں لیکن التزاماً اور دلالتہً ضرور موجود ہے وہ اس طرح کہ قرآن حکیم میں اس حقیقت کا بار بار بیان ہے کہ ہر انسان اپنے اچھے بُرے اور مفید و مضر اعمال و افعال کے نتائج و اثرات کا خود حقدار ہے، اچھے اور مفید اعمال پر دُنیا اور آخرت میں جو اچھے اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بھی اُس کیلئے اور بُرے اور مضر اعمال پر دنیا و آخرت میں جو بُرے اثرات و نتائج مرتب ہوتے ہیں وہ بھی خود اُس کیلئے ہیں، سورۂ بقرہ میں فرمایا:

(۱) لَھَا مَا کَسَبَتْ وَعَلَیْھَا مَا اکْتَسَبَتْ، اُس کے اچھے عمل و کسب کا فائدہ بھی اسی کے لئے اور بُرے کسب

و عمل کا ضرر بھی اُسی کی گردن پر،

(۲) مَنْ عَمِلَ صَالِحًا فَلِنَفْسِهٖ ۚ وَمَنْ اَسَآءَ فَعَلَيْهَا ؕ
جس نے اچھا کام کیا اُس کا فائدہ اُس کے لئے ہے اور جس نے بُرا کام کیا اُس کا ضرر اُس پر ہے۔

۱۵ ۔ فُصِّلَتْ والجاثیۃ

اس بارے میں قرآن مجید کی وُہ آیت خاص اہمیت رکھتی ہے جس میں حصر کے ساتھ فرمایا گیا ہے کہ ہر انسان کی سعی و محنت کا فائدہ صرف اسی کے لئے ہے دوسرے کے لئے نہیں، وُہ آیت یہ کہ: لَيْسَ لِلْاِنْسَانِ اِلَّا مَا سَعٰى[۱] ، انسان کے لئے نہیں مگر وُہ جو اُس نے سعی کی۔ یہاں یہ عرض کر دینا ضروری ہے کہ قرآن حکیم کی اس قسم کی آیات کا مطالب نہائت وسیع اور جامع ہے اور انسان کی دنیوی اور اُخروی دونوں زندگیوں سے تعلق رکھتا اور دونوں کے امور و معاملات پر حاوی ہے، لہذا اُس کو صرف اُخروی زندگی یا صرف دنیوی زندگی سے مخصوص کر دینا صحیح نہیں، اسلئے کہ قرآنی تعلیمات کا مقصد محض انسان کی اُخروی فوز و فلاح نہیں بلکہ اُخروی کے ساتھ دنیوی فوز و فلاح بھی ہے اگرچہ وُہ اُخروی فوز و فلاح کو اصل اور بنیادی اہمیت دیتا ہے، لہذا مذکورہ قسم کی آیات کا مطلب یہ بنتا ہے کہ جس انسان کی فکری اور عملی سعی و محنت پر جو اچھے اور مفید اثرات و نتائج دنیا میں مرتب ہوتے ہیں یا جو آخرت میں مرتب ہوں گے وُہ سب اُس کی ذات کے لئے ہیں اور اسی کو اُن سے فائدہ اٹھانے کا حق ہے، اور یہ کہ کسی انسان کے لئے یہ جائز نہیں کہ وُہ دوسرے کی سعی و محنت کے اثرات و نتائج سے بغیر اس کی رضامندانہ اجازت کے فائدہ اُٹھائے۔ غور سے دیکھا جائے تو قرآن حکیم کا یہ تصور انسانی فطرت کے عین مطابق اور عقلی طور پر ایک بالکل صحیح تصور ہے، کیونکہ یہ ایک واقعہ ہے کہ انسان شعوری اور اختیاری طور پر جو بھی سعی و عمل کرتا ہے صرف اُس وقت کرتا ہے جب اس کو یہ یقین یا ظنِ غالب ہوتا ہے کہ اُس سعی و عمل کے اثرات و نتائج سے اُس کو مادی یا روحانی اور دنیوی یا اُخروی کوئی فائدہ پہنچے گا بلکہ ذرا اور گہرائی میں جا کر دیکھا جائے تو ذاتی فائدے کا شعور ہی وُہ اصل محرک نظر آتا ہے جو انسان کو کسی اختیاری اور ارادی

سعی وعمل پرآمادہ کرتا ہے اور جس کی تحریک سے انسان مشکل سے مشکل کام بخوشی کرلیتا ہے، ایک انسان بظاہر دوسروں کے فائدہ کے لیے جو سعی وکوشش کرتا ہے دراصل اُس کی تہہ میں بھی یہ خیال کارفرما ہوتا ہے کہ اس سے اُس کو اللہ کی خوشنودی، اُخروی نجات سعادت، دنیوی عزت وشہرت حاصل ہوگی، گویا وُہ اپنے اختیار اور ارادے سے جو کچھ بھی کرتا ہے اپنی ذات کے لیے کرتا ہے، لہذا قرآن حکیم کا یہ فرمانا کہ ہر انسان کی سعی اس کے لئے اور اس کا فائدہ اس کے لئے مخصوص ہے انسانی فطرت کی صحیح ترجمانی ہے۔

اسی طرح یہ بات عقل ودانش اور عدل انصاف کے بھی عین مطابق ہے کیونکہ ایک انسان جب کوئی دماغی جسمانی محنت ومشقت کرتا ہے تو اس میں اس کی انرجی و توانائی صرف ہوتی اور وُہ زحمت وتکلیف اٹھاتا ہے لہذا عقل اور انصاف کا تقاضا یہ ہے کہ اس محنت ومشقت کا ثمرہ اور فائدہ بھی اسی کیلئے ہو ۔۔۔۔ دوسرے کسی کے لئے جائز نہ ہو کہ وُہ اس کی اجازت اور رضامندی کے بغیر اُس سے فائدہ اٹھائے۔

اور ظاہر ہے کہ ایک انسان کے لئے اس کی سعی ومحنت کے اثرات وثمرات مخصوص اور محفوظ ہونے کی جو عملی صورتیں ہوسکتی ہیں اُن میں سے ایک صورت یہ ہے کہ جس قدرتی شئے کے ساتھ کسی انسان کی سعی ومحنت کے اثرات وابستہ ہوجائیں وُہ شئے اُس انسان کے فائدہ کے لئے مخصوص اور محفوظ ہو ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ ۔ اور چونکہ یہ بھی ایک کھلی ہوئی بات ہے کہ جب کوئی شخص دوسروں سے پہل اور سبقت کرکے کسی قدرتی شئے کو اپنے قبضہ میں لیتا اور اپنے تصرف اور ردوبدل سے اس میں ایک نئی افادیت پیدا کرتا ہے تو اس میں اسے سعی ومحنت کرنی پڑتی ہے جس کے اثرات اُس قدرتی شئے کے ساتھ خاص شکل میں وابستہ ہوجاتے ہیں: مثلاً جب وہ جنگل جاتا اور وہاں سے کوئی لکڑی اُٹھاکر شہر میں لے آتا ہے تو اس جانے آنے اور لکڑی اٹھاکر لانے میں اسے محنت ومشقت کرنی پڑتی ہے اور اس محنت ومشقت کے اثرات اُس تغیر وتبدّل کی شکل میں اس لکڑی کے ساتھ وابستہ ہوجاتے ہیں جو آبادی میں آنے کے بعد اس میں رونما ہوتا ہے۔ لہذا اس شخص کے لئے اُس کی اس سعی محنت کے اثرات صرف اسی طرح مخصوص اور

محفوظ ہوسکتے ہیں کہ وُہ لکڑی اُس کے لئے مخصوص اور محفوظ ہو اور اس سے فائدہ اٹھانے کے حق میں اُس کو دوسروں پر ترجیح اور تخصیص حاصل ہو، اسی طرح جو شخص ایک بنجر و غیر آباد خطۂ زمین کو آباد کرتا ہے ظاہر ہے کہ اس خطۂ زمین کے ساتھ اس کی سعی و محنت کے اثرات قائم اور وابستہ ہو جاتے ہیں لہذا ان خاص اثرات کے اُس شخص کے حق میں محفوظ اور اس کے فائدہ کے لئے مخصوص ہونے کی صرف یہی صورت ہوسکتی ہے کہ وُہ خطۂ زمین اُس کے استفادہ کے لئے مخصوص ہو جس کے ساتھ اسکی سعی و محنت کے اثرات وابستہ ہوگئے ہیں، لہذا مذکورہ قرآنی آیات سے جہاں بطور اقتضاء النص اور دلالت التزامی کے یہ ثابت ہوتا ہے کہ جس قدرتی شے کے ساتھ کسی شخص کی سعی و محنت کے مفید اثرات وابستہ ہو جائیں وُہ شے اُس شخص کے انتفاع و استفادہ کے لئے مخصوص ہو جاتی اور وُہ شخص اُس کا مالک بن جاتا ہے، وہاں آیاتِ قرآنیہ سے یہ بھی واضح ہوتا ہے کہ جس سبب کی بنا پر کوئی شخص کسی قدرتی شے کا مالک قرار پاتا ہے وُہ سبب صرف انسانی سعی و محنت ہے جبکہ وُہ مفید ہو، مطلب یہ کہ صرف وُہ سعی و محنت سبب ملکیت بنتی ہے جو مفید ہو جس سے اُس قدرتی شے میں کچھ نئی افادیت پیدا ہوئی ہو، مُضر محنت، سببِ ملکیت نہیں بنتی اور اُس کی بنا پر کوئی شخص کسی قدرتی شے کا مالک نہیں قرار پاتا۔

اس دوسری بات میں جو کچھ عرض کیا گیا ہے اُس کا حاصل یہ کہ قرآن و حدیث کی رو سے ابتدائی ملکیت، جو کسی شخص کو کسی قدرتی شے کے متعلق حاصل ہوتی ہے اُس کا سبب صرف انسان کی مفید سعی و محنت ہے دوسری کوئی چیز نہیں، یعنی محض ایسے قبضہ سے کوئی شخص کسی قدرتی چیز کا مالک نہیں قرار پاتا جس سے اُس شے کی قدرتی حالت اور شکل میں کوئی مفید تغیر و تبدل پیدا نہ ہوا ہو، نیز ایسے تغیر و تبدل سے بھی کوئی شخص کسی قدرتی شے کا مالک نہیں بنتا جو مُضر اور نقصان دہ ہو یعنی جس سے اسکی قدرتی افادیت میں کمی واقع ہوگئی ہو۔

پھر جب انسان کی مفید محنت کو کسی قدرتی شے کی شخصی ملکیت کا اصل سبب تسلیم کرلیا جائے تو اُس سے عقلی طور پر یہ بھی ثابت ہو جاتا ہے کہ شخص کی یہ ملکیت دائمی اور ناقابلِ زوال نہیں ہوتی بلکہ صرف اُس وقت تک کے لئے ہوتی ہے جب تک اُس قدرتی مادے کے ساتھ اُس کی سعی و محنت کے اثرات قائم رہتے ہیں چنانچہ جب وُہ اثرات کسی وجہ سے زائل

ہو جائیں تو وہ ملکیت بھی زائل ہو جاتی ہے، مثلاً کسی شکار کو جنگل یا دریا سے پکڑ کر لانے کے بعد وہ شخص اس کو واپس چھوڑ دیتا ہے اور وہ پھر جنگل یا دریا میں چلا جاتا ہے تو اس کے متعلق جو ملکیت حاصل ہوئی تھی وہ زائل اور ختم ہو جاتی ہے۔ یا ایک غیر آباد خطۂ زمین کو آباد کرنے کے بعد بہت عرصہ تک معطل چھوڑ دیتا ہے یہاں تک کہ اس کی تقریباً وہ شکل ہو جاتی ہے جو آباد کرتے وقت تھی تو سبب ملکیت یعنی محنت کے مفید اثرات ختم ہو جانے سے اس شخص کی ملکیت بھی ختم ہو جاتی ہے، اب دوسرا جو اس کو آباد کرے وہ اس کا مالک بن جاتا ہے۔

تیسری بات اس سلسلہ میں یہ کہ ایک شخص کو اپنی مفید سعی و محنت کے اثرات کیوجہ سے کسی قدرتی شے کے متعلق جو ملکیت حاصل ہوتی ہے قرآن حکیم کے نزدیک وہ قابل انتقال ہوتی ہے یعنی وہ شخص اپنی ملکیت کو دوسرے شخص کی طرف منتقل کر سکتا ہے اور وہ دوسرے کی طرف منتقل ہو جاتی ہے البتہ قرآن حکیم کے نزدیک انتقال کے صرف وہی طریقے جائز اور صحیح ہیں جن میں مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے: قرآن مجید میں ہے:

یٰاَیُّهَا الَّذِیْنَ اٰمَنُوْا لَا	اے ایمان والو آپس میں ایک
تَاْكُلُوْٓا اَمْوَالَكُمْ بَیْنَكُمْ	دوسرے کا مال ناحق نہ کھاؤ مگر یہ
بِالْبَاطِلِ اِلَّآ اَنْ تَكُوْنَ	کہ وہ تجارت کے ذریعے باہمی
تِجَارَةً عَنْ تَرَاضٍ مِّنْكُمْ	رضامندی سے ہو۔ (النساء)

ایک حدیث نبوی میں ہے: لَا یَحِلُّ مَالُ امْرِءٍ مُسْلِمٍ اِلَّا بِطِیْبِ نَفْسِهٖ ۔ کسی مسلمان کا مال لینا حلال نہیں مگر یہ کہ اس کی رضامندی سے ہو۔ بہرحال قرآن و حدیث کی رو سے انتقال ملکیت کے صرف وہی طریقے صحیح ہیں جن میں مالک کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے اور چونکہ

حقیقی رضامندی صرف اُن ہی طریقوں میں موجود ہوتی ہے جن میں مالک کے لئے مادی یا روحانی، دنیوی یا اُخروی معاوضہ موجود ہوتا ہے، مطلب یہ کہ ایک انسان اپنی مملوکہ شے دوسرے کو رضا و خوشی کے ساتھ صرف اُس وقت دیتا ہے جب اُسے وثوق اور اطمینان ہوتا ہے کہ اس کو کسی نہ کسی شکل میں اُس کا معاوضہ ملے گا، وہ معاوضہ زر و نقدی

کی شکل میں ہو یا اجناس اور ساز و سامان کی شکل میں، خدمت و راحت کی شکل میں ہو یا عزت و شہرت کی شکل میں، اللہ کی رضا و خوشنودی کی شکل میں ہو یا اُخروی اجر و ثواب کی شکل میں، بہرحال کسی نہ کسی شکل میں اپنی مملوکہ شے کا معاوضہ ضرور چاہتا ہے اور یہ چاہنا اس کی فطرت ہے جو کبھی بدل نہیں سکتی، لہٰذا قرآن حکیم نے انتقال ملکیت کے صرف وہی طریقے جائز قرار دیئے ہیں جن میں مالک کے لئے کسی نہ کسی شکل میں معاوضہ موجود ہوتا ہے، اور عام حالات میں ایسے طریقے اُس کے نزدیک پانچ ہیں:

پہلا طریقہ، تجارت اور بیع و شراء کا طریقہ ہے جس میں دونوں فریق، اپنی مرضی خوشی سے اپنی اپنی چیز کا ایک دوسرے سے تبادلہ کرتے ہیں۔ اور چونکہ اس میں ہر مالک کے لئے اس کی مملوکہ چیز کا مادی معاوضہ موجود ہوتا ہے ایک کے لئے نقد کی صورت میں اور دوسرے کے لئے کسی جنس اور سامان کی شکل میں، لہٰذا اس میں فریقین حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے، قرآن حکیم اور احادیث نبویہ میں تجارت اور بیع و شراء کی جو تعلیم اور ترغیب ہے اس سے صاف ظاہر ہوتا ہے کہ یہ معاملہ ایک بالکل صحیح اور مشروع معاملہ ہے۔

دوسرا طریقہ، نوکری اور ملازمت کا طریقہ ہے جس میں ایک شخص کی طرف سے خدمت ہوتی ہے اور دوسرے کی طرف سے اس کا مادی معاوضہ ہوتا ہے، چونکہ اس میں ہر فریق کے لئے اس کی چیز کا معاوضہ موجود ہوتا ہے لہٰذا حقیقی رضامندی پائی جاتی ہے، قرآن مجید میں متعدد آیات اور کتب حدیث میں بکثرت روایات ہیں جن سے اس معاملہ کے جائز اور مشروع ہونے پر روشنی پڑتی ہے۔

تیسرا طریقہ، صدقے اور ہدیے کا طریقہ ہے جس میں ایک شخص اپنی مملوکہ چیز دوسرے کو تبرعاً دیتا ہے احتراماً پیش کرتا ہے، اس طریقہ میں مالک کے لئے گو مادی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لیکن معنوی اور روحانی معاوضہ ضرور موجود ہوتا ہے، اُسے یقین ہوتا ہے کہ اس کو آخرت میں اس کا اجر و ثواب ضرور ملے گا اور دنیا میں بھی عزت کی نظر سے دیکھا جائے گا۔ قرآن حکیم اور حدیث نبوی میں صدقے اور ہدیے کی تاکید اور ترغیب اور اس پر بڑے اجر و ثواب کی بشارت ہے جو اُس کے نہ صرف مشروع بلکہ عظیم نیکی ہونے پر دلالت کرتی ہیں۔

چوتھا طریقہ، قرض داد ھار کا طریقہ ہے جس میں ایک شخص اپنا مال دوسرے ضرورتمند شخص کو ازراہ ہمدردی وخیرخواہی اس عہد وپیمان کے ساتھ دیتا ہے کہ مقررہ میعاد کے بعد وُہ مال یعنی اس کا مثل اُسے واپس لوٹانا پڑے گا، چونکہ اس طریقہ میں بھی مالک کو مقررہ وقت کے بعد مال واپس مل جاتا ہے نیز وُہ سمجھتا ہے کہ اس ہمدردی اور نیک تعاون کے بدلے اُسے آخرت میں بھی اجروثواب ملے گا لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی موجود ہوتی ہے، قرآن وحدیث میں بکثرت ایسی نصوص ہیں جن میں قرض حسنہ کا حکم اور اس کی فضیلت اور اس پر اُخروی اجروثواب کا وعدہ ہے۔

پانچواں طریقہ، وصیت اور وراثت کا طریقہ ہے جس میں ایک شخص کی موت کے بعد اُس کی متروکہ اشیاء اُس کے ورثاء کو ملتی ہیں۔ اس طریقہ میں بھی غور سے دیکھا جائے تو متوفی کی رضامندی موجود ہوتی ہے وُہ اس طرح کہ جس کے لئے وصیت کی جاتی ہے وُہ یا تو اُس کی کسی خدمت اور اہلیت کی وجہ سے کی جاتی ہے یا اس کی ہمدردی اور خیرخواہی کی غرض سے کی جاتی ہے۔ بہرحال موصی یعنی وصیت کرنے والے کے لئے ماضی میں یا مستقبل میں مادی یا روحانی بدلہ موجود ہوتا ہے، اسی طرح ایک مُورِث یہ جانتے ہوئے کہ اس کے مرنے کے بعد اُس کی متروکہ املاک اس کے ورثاء کو مل جائیں گی۔ مال جمع کرتا اور محفوظ رکھتا ہے تو وُہ گویا صلہ رحمی کے جذبہ سے یہ چاہتا ہے کہ مرنے کے بعد اس کا مال اس کے ورثاء کو ملے اور وُہ اس کے مالک قرار پائیں اور بلاشبہ اس پر وُہ اُخروی اجروثواب کا بھی مستحق قرار پاتا ہے جیسا کہ بعض احادیث میں ہے۔

بہرحال عام اور پُرامن حالات میں یہ ہیں وُہ پانچ طریقے جن کو اسلام انتقال ملکیت کا سبب مانتا اور اُن کے ذریعے منتقل شدہ شے کا ایک شخص کے بعد دوسرے شخص کو مالک تسلیم کرتا ہے، جنگ کی حالت میں، کفار کا جو مال بطورِ غنیمت مسلمانوں کو ملتا ہے اُس کے متعلق ـــــ مسلمانوں کی ملکیت ایک دوسرے اصول کے تحت ثابت ہوتی ہے اور وُہ یہ کہ: کفار کے اعتداء کے جواب میں اعتداء اور ان کی بُرائی کے بدلے میں بُرائی جائز ہے، قرآن حکیم میں ہے:

(۱) فَمَنِ اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ فَاعْتَدُوْا عَلَیْهِ بِمِثْلِ مَا اعْتَدٰی عَلَیْکُمْ ، (البقرہ)

جو تم پر زیادتی کرے تم اس پر زیادتی کرو لیکن اتنی ہی جتنی کہ وہ کرے،

(۲) جَزٰٓؤُا سَیِّئَةٍ سَیِّئَةٌ مِّثْلُهَا ۔ (الشوریٰ)

برائی کا بدلہ برائی جائز ہے لیکن برابر ہونا ضروری ہے ۔

ظاہر ہے کہ جو کفار مسلمانوں سے جنگ کرتے ہیں اُن کا یہی عزم ہوتا ہے کہ وہ غلبہ پانے کے بعد مسلمانوں کے اموال کو اپنی ملکیت میں لے لیں گے لہٰذا مذکورہ اصول کے تحت مسلمانوں کے لئے بھی جائز ہو جاتا ہے کہ وہ فتح پانے کے بعد کفار کے اموال کے مالک قرار پائیں اور یہ اصول عقل و قیاس اور عدل و انصاف کے عین مطابق ہے ۔

اس کے برعکس قرآن حکیم انتقال ملکیت کے ایسے طریقوں کو جائز اور صحیح تسلیم نہیں کرتا جن میں مالک کے لئے اس کی شے کا کسی شکل میں بھی معاوضہ موجود نہیں ہوتا لہٰذا اس کی حقیقی رضامندی مفقود ہوتی ہے جیسے سرقہ، غصب، خیانت، رشوت، سُود اور قمار وغیرہ سودا اور جوئے میں جو رضامندی ہوتی ہے وہ ظاہری طور پر ہوتی ہے حقیقی طور پر نہیں ہوتی، اس کی دلیل یہ ہے کہ جس کے پاس اپنا مال حسب ضرورت موجود ہو وہ کبھی کسی سے سود پر مال نہیں لیتا، اسی طرح اگر جوئے میں حقیقی رضامندی ہوتی تو جوئے بازوں کے درمیان ہار جیت کے بعد لڑائی جھگڑے ظہور میں نہ آتے، مطلب یہ کہ سرقہ، غصب، خیانت، رشوت سُود اور جوئے کے ذریعے جو شخص دوسرے کا مال لیتا ہے قرآن حکیم کے نزدیک وہ اس مال کا مالک نہیں بن سکتا اور اس کی طرف پہلے شخص کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی ۔

اس بارے میں قرآن حکیم سے جو اصولی ضابطہ سمجھ میں آتا ہے وہ یہ کہ جو شخص، کسی دوسرے کا مال اُس کی بے خبری میں پوشیدہ طور پر چُراتا، یا دھوکا و فریب دے کر ظاہری طور پر اُس سے لے لیتا ہے یا جو اپنی طاقت کے بل بوتے پر کمزور سے زبردستی چھین لیتا ہے، یا دوسرے کی مجبوری سے ناجائز فائدہ اٹھاتے ہوئے اس کا کچھ مال وغیرہ لے لیتا ہے وہ اُس مال کا مالک نہیں قرار پاتا اور اُس کی طرف ——— اُس

مال کی ملکیت منتقل نہیں ہوتی بلکہ حسب سابق وہ ملکیت پہلے مالک ہی کو حاصل رہتی ہے

واضح رہے کہ موجودہ دور میں دوسرے کی مجبوری سے فائدہ اٹھانے کی جائز انتفاع کی جو بہت سی شکلیں ہیں ان میں سے ایک نمایاں شکل وہ ہے جو ذرائع پیداوار کے مالکان اور اُن کے ہاں کام محنت کرنے والے مزدوروں کے درمیان پائی جاتی ہے، مزدوروں کی محنت کی حقیقت میں جتنی اُجرت ہوتی ہے کارخانہ دار وغیرہ ان کو کبھی وہ پوری اُجرت نہیں دیتے بلکہ اس کا ایک حصہ دیتے اور باقی خود رکھ لیتے ہیں، مالکان اور مزدوروں کے درمیان جو معاہدے طے پاتے ہیں اُن میں مزدوروں کی جہالت اور مجبوری کا صرور دخل ہوتا ہے، مزدور جب یہ دیکھتے ہیں کہ وہ مستأجر کی مقرر کردہ اُجرت پر کام نہیں کریں گے تو معاشی پریشانی میں مبتلا ہوں گے اور بھوکوں مریں گے تو مجبوراً مستاجروں کی مرضی کے مطابق کام کرنے پر آمادہ ہوجاتے ہیں، غرضیکہ مالکان مزدوروں کی مجبوری کی بنا پر اُن کے حق کا جو حصہ ان کو نہیں دیتے بلکہ خود رکھ لیتے ہیں اُس کے وہ جائز مالک نہیں ہو سکتے۔

آخر میں مسئلہ ملکیت کے تیسرے پہلو کو لیجئے یعنی یہ کہ قرآن حکیم جس شخصی ملکیت کا قائل ہے کیا اُس کا دائرہ صرف اشیائے صرف اور ذاتی استعمال کی چیزوں تک محدود ہے یا ذرائع پیداوار بھی اُس میں شامل ہیں؟ اس کے متعلق جو کچھ کہ میں سمجھ سکا ہوں وہ یہ کہ قرآن کا فلسفۂ ملکیت جو اسباب ملکیت کی بحث میں عرض کیا گیا ہے اُس کی رو سے جس طرح کوئی شخص اشیائے صرف اور نجی استعمال کی چیزوں کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح ذرائع پیداوار اور وسائل آمدنی کا بھی مالک قرار پا سکتا ہے مثلاً جس مفید محنت کی بنا پر دریا سے پکڑی ہوئی ایک مچھلی کا مالک قرار پاتا ہے اسی طرح وہ اس خطۂ زمین کا بھی مالک قرار پاتا ہے جس کو وہ اپنی محنت سے آباد کرتا اور قابل کاشت بناتا ہے، نیز جس طرح وہ خرید و فروخت کے ذریعے اپنے استعمال کی گھڑی کا مالک بنتا ہے اسی طرح وہ ایک فیکٹری اور کارخانے کا بھی بن سکتا ہے جس کو اس نے اپنے جائز مملوکہ مال سے خریدا ہو۔

ذرائع پیداوار میں سے جہاں تک زمین کا تعلق ہے اُس کی شخصی ملکیت کے بارے میں قرآن و حدیث میں نہایت واضح نصوص ہیں جن سے صاف معلوم ہوتا ہے کہ اسلامی شریعت

کی رُو سے زمین کی شخصی ملکیت جائز اور درست ہے، اس بارے میں کچھ قرآنی نصوص یہ ہیں:

(۱) وَاضْرِبْ لَهُمْ مَّثَلًا رَّجُلَيْنِ جَعَلْنَا لِاَحَدِهِمَا جَنَّتَيْنِ مِنْ اَعْنَابٍ وَّحَفَفْنٰهُمَا بِنَخْلٍ وَّجَعَلْنَا بَيْنَهُمَا زَرْعًا
الکہف

اُن سے بیان کیجئے دو شخصوں کا قصہ ایک کے لئے ان میں سے ہم نے بنائے دو باغ انگوروں کے، جن کے گرد کھجوروں کی باڑھ لگائی اور درمیان کاشت کی کھیتی رکھی۔

(۲) وَاَوْرَثَكُمْ اَرْضَهُمْ وَدِيَارَهُمْ وَاَمْوَالَهُمْ وَاَرْضًا لَّمْ تَطَئُوْهَا۔
الاحزاب

اور اللہ نے تمہیں یہود کی زمینوں، اُن کے مکانوں اور دوسرے ہر قسم کے مالوں کا وارث بنایا، اور ایسی زمین کا بھی جس پر تم نے پہلے قدم نہ رکھا تھا۔

(۳) اَنِ اغْدُوْا عَلٰى حَرْثِكُمْ اِنْ كُنْتُمْ صَارِمِيْنَ ۝

صبح سویرے چلو تم اپنے کھیت پر اگر تم اس کو کاٹنے والے ہو۔

پہلی آیت میں لفظ "لِاَحَدِهِمَا" میں جو لام ہے وہ تملیک و تخصیص کے لئے ہے۔ لہٰذا مطلب یہ ہوتا ہے کہ وہ شخص باغوں اور زمینوں کا مالک تھا، اس قصے میں آگے بھی کئی الفاظ ہیں جو ملکیت پر دلالت کرتے ہیں جیسے "اَنَا اَكْثَرُ مِنْكَ مَالًا" اور جَنَّتَهٗ اور جَنَّتَكَ کیونکہ یہ اضافت تملیک ہی کے لئے ہو سکتی ہے۔

دوسری آیت میں لفظ اَوْرَثَ بھی ملکیت پر دلالت کرتا ہے اور اَرْضَهُمْ کی اضافت سے بھی زمین کا یہود کی ملکیت میں ہونا ثابت ہوتا ہے کیونکہ ایسی اضافت ملکیت ہی کے لئے ہو سکتی ہے۔ چنانچہ عملاً ہوا بھی ایسا ہی کہ یہود کے جانے کے بعد ان کی جائیدادوں وغیرہ کے مالک مسلمان قرار پائے۔

تیسری آیت میں لفظ حَرْثِكُمْ بھی زمین کی ملکیت پر دلالت کرتا ہے کیونکہ اس میں جو اضافت ہے وہ تملیک و تخصیص کے لئے ہی ہو سکتی ہے۔

بہرکیف، شخصی ملکیت کے متعلق قرآن مجید کا جو کلی اور اصولی تصور ہے اُس سے بھی اور مذکورہ جزوی آیات سے بھی زمین کی شخصی ملکیت ثابت ہوتی ہے، اگر زمین کی شخصی ملکیت قرآن حکیم کے نزدیک جائز نہ ہوتی تو وہ ضرور اس کو بیان کرتا اور نہایت واضح الفاظ میں بیان کرتا کیونکہ اُس کے نزول کے وقت عرب اور مدینہ منورہ میں ملکیت زمین کا عام رواج اور اس پر پوری طرح عمل درآمد تھا، مزارعت کا رواج بھی ملکیت زمین کی دلیل تھا، باقاعدہ اس کی خرید و فروخت ہوتی اور ہبہ اور وقف بھی کی جاتی تھی اس بارے میں کتب حدیث کے اندر بکثرت روایات ہیں اسی طرح اگر ملکیتِ زمین ناجائز اور ممنوع ہوتی تو رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم نے جس طرح بعد میں مزارعت کو ممنوع قرار دیا اس طرح ملکیتِ زمین کو بھی ضرور ممنوع قرار دیتے لیکن ایسا نہیں ہوا، یعنی کوئی حدیث ایسی نہیں ملتی جس سے ملکیتِ زمین کا ناجائز ہونا ثابت ہوتا ہو۔

جو حضرات ملکیت زمین کے قائل نہیں وہ اپنے موقف کی تائید میں بعض دفعہ قرآن حکیم کی یہ آیت پیش کرتے ہیں اِنَّ الْاَرْضَ لِلّٰهِ بے شک زمین اللہ کے لئے ہے، حالانکہ اس آیت سے ان کے موقف کی تائید نہیں ہوتی، اس لئے کہ آیت کا دوسرا ٹکڑا ہے: یُوْرِثُهَا مَنْ یَّشَآءُ مِنْ عِبَادِهٖ ۚ وہ اس کا وارث بناتا ہے اپنے بندوں میں سے جس کو چاہتا ہے، اس سے نہ صرف یہ کہ انسانی ملکیت کی نفی نہیں ہوتی بلکہ الٹا اثبات ہوتا ہے کیونکہ وراثت کے مفہوم میں ملکیت داخل ہے، اور پھر جیسا کہ پہلے تفصیل کے ساتھ عرض کیا گیا ایک شے بیک وقت حقیقی معنے کے لحاظ سے اللہ کی ملکیت اور مجازی معنی کے لحاظ سے انسان کی ملکیت ہو سکتی ہے ان کے درمیان کوئی تعارض واقع نہیں ہوتا اور ایک کا ثبوت سے دوسری کی نفی نہیں ہوتی جیسا کہ کسی شے کے متعلق ایک شخص کی ملکیت کے اثبات سے دوسرے شخص کی ملکیت کی نفی ہو جاتی ہے۔

اسی طرح بعض حضرات زمین کی شخصی ملکیت کی نفی میں قرآنی آیت: وَالْاَرْضَ وَضَعَهَا لِلْاَنَامِ ۝ کو بھی پیش کر دیتے ہیں حالانکہ یہ درست نہیں کیونکہ اس آیت کے معنی ہیں: اللہ نے زمین کو خاص وضع سے بنایا، یا رکھا مخلوقات کے لئے، یعنی تمام جاندار مخلوق کے لئے، کیونکہ انام کے معنے صرف انسانوں کے نہیں بلکہ تمام زندہ مخلوقات کے ہیں۔ اس

آیت کا جو معنی و مفہوم ہے حقیقت واقعہ کے عین مطابق ہے وہ اس طرح کہ کرۂ زمین کی جو قدرتی بناوٹ و ساخت اور طبعی وضع و شکل ہے اور نظام شمسی میں اُسے جہاں رکھا گیا ہے اُس کے ساتھ جانداروں کی زندگی، نشوونما اور فطری ضرورتوں کا نہایت گہرا تعلق ہے اور گوناگوں قدرتی فائدے ہیں جو جانداروں کو از خود زمین سے حاصل ہوتے ہیں، اور یہ فائدے اس صورت میں بھی حاصل رہتے ہیں جب اُس کا کوئی قطعہ کسی شخص کی ملکیت میں ہو۔ کیونکہ ہم دیکھتے ہیں کہ ایک شخص کی ملکیت دیگر جانداروں کو اس زمین کے عام اور خاص فائدوں سے محروم نہیں کرتی بلکہ کچھ ممد و معاون ہی بنتی ہے مثلاً ایک شخص اپنی مملوکہ زمین کاشت کرکے اس سے جو غلہ وغیرہ پیدا کرتا ہے اس سے بے شمار جاندار فائدہ اٹھاتے ہیں جن میں وہ خود اور اس کا خاندان وغیرہ بھی ہوتا ہے، غرضیکہ زمین کا جانداروں کے فائدہ کے لئے ہونا، زمین کے کسی ٹکڑے کی شخصی ملکیت کے منافی نہیں یہ دونوں چیزیں ایک ساتھ جمع ہو سکتی ہیں۔

بہرحال یہ حقیقت ہے کہ قرآن و حدیث کے نظریۂ ملکیت کی رو سے جس طرح کوئی شخص، ذاتی استعمال کی کسی چیز کا مالک بن سکتا ہے اسی طرح ذرائع پیداوار یعنی زمین اور فیکٹری وغیرہ کا بھی مالک بن سکتا ہے، البتہ عقلی طور پر کچھ فرق ہو سکتا ہے تو وہ صرف تصرف کے لحاظ سے ہو سکتا ہے، اس اجمال کی کچھ تفصیل یہ کہ جن چیزوں کے وجود کا اصل مقصد شخصی فائدہ ہوتا ہے جیسے اشیائے صرف، عقل کی رو سے مالک ان کے اندر ہر وہ تصرف کر سکتا ہے جو اُن کے مقصدِ وجود کے مطابق اور شخصی فائدے کے لئے ضروری ہو، لیکن جن اشیاء کے وجود کا مقصد عامۃ الناس کا فائدہ ہوتا ہے اور عام لوگوں کی ضرورت ان سے وابستہ ہوتی ہے اُن کے اندر ان کا مالک صرف ایسے تصرفات کا مجاز ہوتا ہے جو مفاد عامہ کے منافی نہ ہوں بلکہ اُس کے موافق ہوں، یعنی وہ اُن میں اپنے ذاتی مفاد کی خاطر کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا جس سے مفاد عام کو نقصان پہنچا ہو، مثلاً زمین ایک ایسا ذریعہ پیداوار اور ایک ایسی چیز ہے جس کی پیداوار عامۃ الناس کی ضرورت سے تعلق رکھتی اور جس کا مقصد وجود، عام لوگوں

کا فائدہ ہے لہٰذا اگر عامۃ الناس کو مثلاً گیہوں یا چاول کی ضرورت ہے تو مالک زمین محض اپنے فائدہ کی خاطر اُس میں گنے تمباکو وغیرہ کی کاشت نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک اپنے مل میں کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا جو مقصدِ مل کے منافی ہو اور جس سے عامۃ الناس کو ضرر اور نقصان پہنچتا ہو مثلاً کپڑے کی ضرورت ہو تو وہ اس کو بند نہیں رکھ سکتا جس کپڑے سے اجتماعی ضرورت پوری ہو سکتی ہو وہی تیار کر سکتا ہے دوسرا نہیں کر سکتا، اس طرح اُن مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے جو ذرائع پیداوار کی شخصی ملکیت سے پیدا ہوا کرتے ہیں جب کہ اُن کا مالک اُن میں ہر تصرف کے لئے آزاد ہوتا ہے۔

لہٰذا اگر مثلاً عامۃ الناس کو غلہ کی ضرورت ہو تو مالک زمین اپنی مملوکہ زمین کو بغیر کاشت کے نہیں چھوڑ سکتا، اسی طرح اگر مثلاً معاشرے کو گیہوں کی ضرورت ہو تو مالک زمین محض اپنے فائدہ کے لئے دوسری چیز کی کاشت نہیں کر سکتا، اسی طرح ایک ٹیکسٹائل مل کا مالک محض اپنے فائدہ کے لئے اس میں کوئی ایسا تصرف نہیں کر سکتا جو مل کے مقصد وجود کے منافی ہو اور جس سے عام لوگوں کو ضرر و نقصان پہنچتا ہو مثلاً کپڑے کی ضرورت ہو تو وہ اس کو بند نہیں رکھ سکتا، نیز وہی کپڑا تیار کر سکتا ہے جس کی عام لوگوں کو ضرورت ہو،

علاوہ ازیں اسلام ذرائع پیداوار کے مالکوں پر کچھ دوسری پابندیاں بھی عائد کرتا ہے مثلاً یہ کہ زمین کا مالک اپنی زمین مزارعت اور بٹائی پر نہیں دے سکتا، کارخانے کا مالک کاریگروں اور مزدوروں سے ایسا معاملہ نہیں کر سکتا جو ظلم و استحصال پر مبنی ہو لہٰذا اس سے ان مفاسد کا سدباب ہو جاتا ہے جو ذرائع پیداوار کی شخصی ملکیت سے اس وقت ضرور پیدا ہوتے ہیں جب ان کے مالکوں کو اُن میں ہر تصرّف کی پوری آزادی ہوتی ہے۔

تحریر: محمد طاسین

اِحْیائے اِسْلام اور تجْدیدِ ملّت

کیلیے

شیخ الہند مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

کا تجویز کردہ طریقِ کار

بروایت مولانا مفتی محمد شفیع صاحب مدظلہ

"میں نے جہاں تک جیل کی تنہائیوں میں اس پر غور کیا کہ پوری دُنیا میں مسلمان دینی اور دنیوی ہر حیثیت سے کیوں تباہ ہو رہے ہیں تو اس کے دو سبب معلوم ہوئے - ایک ان کا قرآن چھوڑ دینا، دُوسرے آپس کے اختلافات اور خانہ جنگی - اس لیے میں وہیں سے یہ عزم لے کر آیا ہوں کہ اپنی باقی زندگی اس کام میں صرف کروں کہ قرآنِ کریم کو لفظاً و معناً عام کیا جائے - بچّوں کے لیے لفظی تعلیم کے مکاتب ہر بستی بستی میں قائم کیے جائیں - بڑوں کو عوامی درسِ قرآن کی صورت میں اس کے معانی سے روشناس کرایا جائے - اور قرآنی تعلیمات پر عمل کے لیے آمادہ کیا جائے - اور مسلمانوں کے باہمی جنگ و جدال کو کسی قیمت پر برداشت نہ کیا جائے"

شیخ الہند حضرت مولانا محمود حسن دیوبندیؒ

ماخوذ از وحدتِ امّت، تالیف مولانا مفتی محمد شفیع صاحب، شائع کردہ مکتبہ 'المنبر' لائلپور

ہماری جملہ خامیوں اور ناتجربہ کاریوں ——— اور تقصیروں اور کوتاہیوں کے باوجود نہ صرف یہ کہ اس 'ہدف کمترین' (MINIMUM TARGET) تک رسائی ہو گئی بلکہ نَافِلَةً لَّكَ ط کے درجے میں تنظیم اسلامی کے تحت ایک نہایت کامیاب تربیتی پروگرام گذشتہ سال ماہِ جولائی میں کوئٹہ میں منعقد ہوا ——— اور پھر مارچ ۱۹۷۶ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کی تیسری سالانہ قرآن کانفرنس کے متصلاً بعد تنظیم اسلامی کا پہلا سالانہ اجتماع منعقد ہوا اور اس میں ع "ہوتا ہے جادہ پیما پھر کارواں ہمارا" کے سے انداز میں ایک عزمِ نو کے ساتھ آگے قدم بڑھانے کا فیصلہ ہو گیا۔

لہٰذا ——— اِنْ شَاءَ اللّٰہُ الْعَزِیْز ——— آئندہ 'میثاق' بھی تنظیم اسلامی کے ترجمان اور 'دعوتِ تجدیدِ عہدِ اَلَست و میثاقِ ایمان' کے علمبردار کی حیثیت سے شائع ہوگا۔ بِیَدِہِ التَّوْفِیْق وَعَلَیْہِ التُّکْلَان !

جس طرح آنحضور صلی اللہ علیہ وسلم نے حجۃ الوداع کے موقع پر فرمایا تھا کہ نَسِی کے ہیر پھیر سے قمری کیلنڈر میں جو گڑبڑ واقع ہو گئی تھی وہ اللہ تعالیٰ کی حکمتِ بالغہ اور قدرتِ کاملہ سے آج رفع ہو گئی اور زمانہ گردش کر کے دوبارہ اُسی حساب پر آ گیا جس پر اللہ نے آسمانوں اور زمین کی تخلیق کی تھی ——— اسی طرح پورے سترہ سال تک اِدھر اُدھر کی خاک چھاننے کے بعد اللہ کے فضل و کرم سے اب 'میثاق' پھر اُسی مقصدِ اصلی کے جانب رُجوع کر رہا ہے جس کے پیشِ نظر اس کا اجراء عمل میں آیا تھا۔

اللہ تعالیٰ ہمیں اس نئے دَور کے تقاضے پورے کرنے کی توفیق عطا فرمائے ! اے اللہ ! ہم تیرے نہایت عاجز و حقیر بندے ہیں۔ تو نے ہی اپنے فضل و کرم سے ہمیں راہ سُجھائی اگر تو ہدایت نہ دیتا تو ہم ہرگز ہدایت یافتہ نہ ہو سکتے ! اب تیری ہی تائید و نصرت اور تیسیر و توفیق پر تمام تر اعتماد اور بھروسہ ہے ! اگر تو نے دستگیری نہ فرمائی تو ہم کبھی منزل پر نہ پہنچ سکیں گے بلکہ راستے ہی میں بھٹک کر رہ جائیں گے۔ ہمیں اُس صراطِ مستقیم پر قائم رکھ جس پر تیرے وہ مُنْعَمْ عَلَیْہِمْ بندے چلے، جو نہ مَغْضُوْبِ عَلَیْہِمْ میں شامل ہوئے نہ ضَآلِّیْن میں ! آمین یَا رَبَّ الْعٰلَمِیْن !

رفقائے کار
دعوت رجوع الی القرآن

(۱) رُودادِ کراچی

از جُون ۷۵ء تا مئی ۷۶ء

ناظم ذیلی دفتر کراچی ، مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب صدر مؤسس مرکزی انجمن خدام القرآن کی کراچی تشریف آوری اور یہاں پر ان کی تقاریر اور درس قرآن کا سلسلہ گذشتہ سالوں کی طرح اس سال بھی جاری رہا۔ جس کی مختصر رُوداد درج ذیل ہے :-

جون ۷۵ء یکم تا ۴ رجون ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے جمعیت الفلاح ہال کراچی میں سورۃ الحدید کے پہلے تین رکوع کا درس دیا۔ یہ چہار روزہ اجلاس عصر تا عشاء منعقد ہوئے۔ اس سے ایک روز قبل یعنی ۳۱ رمئی کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے تھیوسوفیکل ہال میں سیرت النبیؐ کے موضوع پر تقریر ارشاد فرمائی۔ اس جلسہ کی صدارت کراچی کے ایک معروف وکیل جناب نیاز احمد خاں صاحب سابق سیکرٹری کراچی بار ایسوسی ایشن نے فرمائی۔

جولائی ۱۹۷۵ء ۵ رجولائی کو ڈاکٹر صاحب محترم کوئٹہ سے کراچی تشریف لائے۔ آپ جولائی کے آخری ہفتہ میں آٹھ روزہ قرآنی تربیت گاہ کے انعقاد کے سلسلہ میں جگہ وغیرہ کا جائزہ لینے کے لیے کوئٹہ تشریف لے گئے تھے یہاں کے رفقاء

نے اس موقع سے فائدہ اٹھاتے ہوئے ڈاکٹر صاحب موصوف کے درس قرآن کا پروگرام بھی رکھ لیا تھا۔

کراچی میں ۵ رجولائی بروز ہفتہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے فیڈرل بی ایریا کی ایک مسجد میں بعد نماز عشاء "مقامِ صدیقیت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اس جلسہ کا اہتمام مقامی نوجوانوں کی ایک تنظیم شبّان المسلمین نے کیا تھا۔ اس تنظیم کے ایک رہنما جناب محمد ایوب نے ڈاکٹر صاحب کی تقریر سے قبل اور بعد کئی ماہ تک اس مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے منتخب نصاب کے کئی اسباق بذریعہ ٹیپ ہفتہ وار اجتماعات میں سنائے۔ مسجد میں ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے سلسلہ میں جناب محمد ایوب کو ایک خاص جماعت کے مقامی کارکنوں کی جانب سے خاصی مخالفت کا سامنا کرنا پڑا۔ اگر اس جماعت کے امیر مداخلت نہ کرتے یا ایوب صاحب کا صبر جواب دے جاتا تو صورتِ حال خاصی ناخوشگوار ہو سکتی تھی۔

ستمبر ۷۵ء

۳ رستمبر بروز بدھ ہمارے ایک رفیق جناب مسرور حسین صدیقی کے مکان پر ڈاکٹر صاحب نے درسِ قرآن دیا۔ مقامی رفقاء کی کوششوں سے علاقہ کے لوگوں کی ایک بڑی تعداد نے درس میں شرکت فرمائی۔

۵ رستمبر کو ڈاکٹر صاحب نے بخاری مسجد نزد بولٹن مارکیٹ میں خطبۂ جمعہ سے قبل "روزہ کی حکمت" کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ اسی صبح ہی کو ڈاکٹر صاحب کی ایک نوجوان عزیزہ کا انتقال ہو گیا تھا۔ اللہ انہیں غریقِ رحمت فرمائے۔ مرحومہ کو جو قلب کی مریضہ تھیں چند ہی روز قبل لاہور سے کراچی لاکر امراضِ قلب کے ہسپتال میں داخل کرایا گیا تھا جہاں ان کا آپریشن ہوا لیکن وہ کامیاب نہ ہو سکا۔ اور مرحومہ اپنے خالقِ حقیقی سے جا ملیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّآ اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ط بخاری مسجد میں خطاب سے تھوڑی دیر قبل ہی ڈاکٹر صاحب تدفین سے فارغ ہو کر آئے تھے۔ دل پر خاصا اثر تھا۔ رات بھر کی بیداری کی وجہ سے شدید نقاہت تھی۔ ڈاکٹر صاحب کو کھڑا ہونا مشکل ہو رہا تھا لیکن اس کے باوجود اُنہوں نے تقریر فرمائی اور خوب فرمائی۔ مسجد کاروباری علاقہ کے مرکز میں ہے۔ اس کی تینوں منزلیں بھری ہوئی تھیں، تل دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ مسجد سے جو بھی نکلا ڈاکٹر صاحب

کی تقریر کی تعریف کرتے ہوئے نکلا۔

نومبر ۷۵ء مدینہ مسجد (آرٹیلری میدان) میں درسِ قرآن کے چار روزہ اجلاس منعقد ہوئے جو عصر تا عشاء ہوتے تھے۔ ان میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے سورۂ انفال کا درس دیا اور پوری سورۃ ختم کی۔ سورۂ انفال کے بعد ڈاکٹر صاحب نے وعدہ فرمایا کہ آئندہ ماہ اسی مسجد میں سورۂ توبہ زیرِ مطالعہ رہے گی۔ اِنشاء اللہ

دسمبر ۷۵ء وعدہ کے مطابق ڈاکٹر صاحب محترم دسمبر میں تشریف لائے، اور مدینہ مسجد میں درسِ قرآن کی آٹھ روزہ مجالس منعقد ہوئیں۔ جن میں سورہ توبہ زیرِ درس رہی۔ درسِ قرآن کی یہ مجالس ۲۳ر دسمبر تا ۳۰ر دسمبر منعقد ہوئیں۔ ۲۳ر اور ۲۴ر دسمبر کو درس عصر تا عشاء اور ۲۵ر دسمبر تا ۳۰ر دسمبر مغرب تا عشاء ہوتا تھا۔ ۲۵ر دسمبر کو عام تعطیل کی وجہ سے صبح کے وقت ایک اضافی نشست بھی ہوئی۔

۲۵ر دسمبر سے ۳۰ر دسمبر تک عصر تا مغرب اسی مسجد میں حیدر آباد (سندھ) کے ایک معروف عالمِ دین اور مدرسہ عربیہ اسلامیہ حیدر آباد کے ناظم و مہتمم مولانا سیّد وصی مظہر صاحب ندوی نے روزانہ درسِ حدیث دیا۔

۲۶ر دسمبر کو مدینہ مسجد ہی میں خطبۂ جمعہ سے قبل ڈاکٹر صاحب محترم نے خطاب فرمایا۔ ۲۸ر دسمبر بروز اتوار صبح مدینہ مسجد میں نکاح کی ایک مجلس میں ڈاکٹر صاحب نے خطاب فرمایا۔ خطاب کا موضوع تھا "اسلام کا معاشرتی نظام"۔ اس موقعہ پر حاضرین میں ڈاکٹر صاحب کا ایک پمفلٹ "دعوت اِلی اللہ" ایک صاحبِ خیر کی جانب سے مفت تقسیم کیا گیا۔ ان اجتماعات میں شرکت کے لیے لاہور سے دس حضرات مستقل طور پر اور سکھر سے ایک صاحب جزوی طور پر شریک ہوئے۔

جنوری ۷۶ء پچھلے ماہ چونکہ سورۃ توبہ کا درس نامکمل رہ گیا تھا اس لیے ڈاکٹر صاحب وعدہ کے مطابق اس ماہ تشریف لائے اور مدینہ مسجد ہی میں ۲۶ر جنوری تا ۲۸ر جنوری (پیر تا بدھ) سورۃ توبہ کے درس کی تکمیل کی۔ درس کی یہ مجالس عصر تا عشاء منعقد ہوتی تھیں۔ ۲۸ر جنوری کو درس مکمل کرنے کے

بعد ڈاکٹر صاحب موصوف نے حاضرین سے فرمایا کہ جو حضرات ہمارے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور ہمارے کام کو سمجھنا چاہتے ہیں۔ وہ دوسرے دن شام کو شیخ جمیل الرحمٰن صاحب کے مکان جاپان میلنش تشریف لے آئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے فرمایا کہ میں مناسب نہیں سمجھتا کہ مساجد کو کسی انجمن یا جماعت کے پلیٹ فارم کے طور پر استعمال کیا جائے۔ میں یہاں صرف تعلیم و تعلّم قرآن ہی بہتر سمجھتا ہوں اور اسی پر میرا عمل ہے۔

۲۹ر جنوری کو شیخ جمیل الرحمٰن کے مکان پر اچھی خاصی تعداد میں لوگ موجود تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے انہیں ان کی ذمہ داری یاد دلائی جو ان پر خدا اور خلق کی جانب سے عائد ہوتی ہے۔ مرکزی انجمن خدام القرآن کے مقاصد بیان کیے اور جو لوگ ان مقاصد سے متفق ہوں انہیں دعوت دی کہ وہ اس میں شامل ہو کر نیکی کے کام میں ہاتھ بٹائیں۔ الحمدللہ ڈاکٹر صاحب کے خطاب کے اچھے اثرات مرتب ہوئے۔

فروری ۷۶ء

۲۳ر فروری کو ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کی کراچی تشریف آوری ہوئی۔ موصوف کراچی پہنچتے ہی سیدھے دہلی کالونی تشریف لے گئے، جہاں ایک اجتماعِ خصوصی کا اہتمام تھا۔ دراصل ایک صاحبِ خیر نے عشائیہ پر اپنے حلقۂ تعارف میں سے چند حضرات کو مدعو کیا تھا تاکہ وہ ڈاکٹر صاحب سے ملاقات کر سکیں اور ڈاکٹر صاحب اُن تک انجمن کی دعوت پہنچا سکیں۔

۲۳ر فروری تا ۲۶ر فروری (پیر تا جمعرات) محمدی مسجد دستگیر سوسائٹی میں سہ روزہ درسِ قرآن کی مجالس منعقد ہوئیں۔ جن میں ڈاکٹر صاحب موصوف نے قرآن کریم کے حسبِ ذیل مقامات کا درس دیا۔

سُورۂ والعصر۔ سُورۂ حج کی آخری دو آیات، سُورۂ حجرات کی آیات ۱۴، ۱۵ سورۂ صف (مکمّل)۔ سورۂ جمعہ آیات ۱ تا ۵۔ درسِ قرآن کی یہ مجالس عصر تا عشاء منعقد ہوتی تھیں۔ ۲۳ر فروری کو سورۂ والعصر کے درس کے بعد حاضرین میں ڈاکٹر صاحب کے اس درس کا پمفلٹ "راہِ نجات" مفت تقسیم کیا گیا۔

۲۴ر فروری کو ڈاکٹر صاحب نے سویڈش پاک انسٹی ٹیوٹ میں سیرت النبیؐ کے ایک

جلسہ کو خطاب کیا۔ یہ جلسہ یوم فاروقِ اعظمؓ آرگنائزنگ کمیٹی کے زیرِ اہتمام منعقد ہوا تھا۔ اس جلسہ میں ڈاکٹر صاحب کے علاوہ دیگر مقررین بھی تھے۔ اس لیے کم وقت میں ڈاکٹر صاحب نے اتنی عمدہ تقریر کی کہ پہلی بار یہ انکشاف ہوا کہ ڈاکٹر صاحب طویل وقت کے بہترین مقرر ہی نہیں بلکہ کم وقت میں بھی بہترین تقریر کر لیتے ہیں۔ ورنہ بعض لوگوں نے تو طویل تقریریں کرنے پر ڈاکٹر صاحب کو واقعی "بدنام" کر دیا ہے۔ دلچسپ بات یہ ہے کہ ان "بعض لوگوں" میں سے ایک صاحب واقعی اس جلسہ میں بھی موجود تھے اور نعت پڑھنے کے لیے بلائے گئے تھے۔ میرا خیال ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی مختصر جامع اور مؤثر تقریر سننے کے بعد شاید انہوں نے اپنی رائے تبدیل کر لی ہو۔

۲۵ر فروری کو ڈاکٹر صاحب موصوف حیدر آباد تشریف لے گئے جہاں انہوں نے چند حضرات سے ملاقاتیں کیں۔

۲۶ر فروری کو ڈاکٹر صاحب موصوف نے این۔ای۔ڈی انجینئرنگ کالج (نیو کیمپس) میں یوم فاروقِ اعظمؓ آرگنائزنگ کمیٹی کے زیرِ اہتمام طلباء کے ایک جلسہ سے خطاب کیا۔ موضوع تھا "فلسفۂ شہادت اور خلافتِ راشدہ" جلسہ کے واحد مقرر ڈاکٹر صاحب تھے۔ ڈاکٹر صاحب بولے اور خوب بولے۔ ہال طلباء سے کھچا کھچ بھرا ہوا تھا، جن طلباء کو سیٹ نہ مل سکی وہ PASSAGE میں کھڑے رہے، کہیں تلِ دھرنے کو جگہ نہ تھی۔ دروازوں اور برآمدوں تک میں طلباء کھڑے تھے۔ ڈاکٹر صاحب کی ڈیڑھ گھنٹہ کی تقریر میں کوئی طالب علم ہلا تک نہیں۔ PIN DROP SILENCE کا عالم تھا، ورنہ ایک دینی موضوع پر کالج کے اس قدر طلباء کہاں جمع ہوتے ہیں اور پھر اُن کا اتنی دیر تک خاموشی سے سنتے رہنا بقول ایک طالب علم کے کالج کی دنیا میں یہ ایک عجوبہ تھا۔ دراصل یہ اللہ تعالیٰ کا خاص فضل ہے وہ عنایت فرماتا ہے جس کو چاہتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے جب فرمایا کہ اگر ملک میں ابتری اور فساد کا برپا ہونا کسی خلیفہ کی نااہلی اور کمزوری کی دلیل ہو سکتی ہے تو اس دلیل سے پھر حضرت عثمانؓ سے زیادہ حضرت علیؓ کو کمزور خلیفہ سمجھا جا سکتا ہے۔ لیکن ایسا نہیں ہے یہ دلیل ہی سرے سے غلط ہے اور صرف حضرت عثمان غنیؓ جیسے خلیفۂ راشد اور مظلوم شہید کی تنقیص کے

لیے وضع کی گئی ہے اور یہ نہیں سوچا گیا کہ اس دلیل کی زد کہاں کہاں پڑے گی۔ ہمارے نزدیک حضرت علیؓ بھی خلیفۂ راشد اور اسد اللہ تھے، فتنہ و فساد ان کی وجہ سے برپا نہیں ہوا تھا بلکہ اس کے کچھ دوسرے اسباب تھے۔ اسی طرح حضرت عثمانؓ پر بھی یہ الزام کذب و افتراء کے سوا کچھ نہیں ——— ڈاکٹر صاحب کا یہ کہنا تھا کہ ہال میں دیر تک تالیاں گونجتی رہیں۔ تالیاں اس وقت بھی دیر تک بجتی رہیں جب ڈاکٹر صاحب نے حضرت عمرؓ کی سادگی اور درویشی کے واقعات بیان کرتے ہوئے یہ فرمایا کہ ہمارے بعض دوست اس بات کا ذکر تو بڑے فخر کے ساتھ کرتے ہیں کہ چوائن لائی کی لڑکی اسکول بائیسکل پر جاتی ہے، حضرت عمرؓ کی زندگی کے واقعات کے ذکر سے اُن کی زبانیں گنگ ہو جاتی ہیں۔

تقریر کے آخر میں ڈاکٹر صاحب سے کچھ سوالات پوچھے گئے جن کے انہوں نے تسلی بخش جوابات دیئے۔ اس جلسہ کی صدارت کالج کے وائس پرنسپل نے فرمائی۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر اس قدر پسند کی گئی کہ ان سے درخواست کی گئی کہ وہ وقتاً فوقتاً کالج میں خطاب فرمانے کے لیے اپنے قیمتی اوقات کا کچھ حصّہ عنایت فرما دیا کریں۔

۲۶ر فروری کو محمدی مسجد (دستگیر سوسائٹی) میں درس کے آخری روز ڈاکٹر صاحب نے اُن حضرات کو جو اُن کے کام سے دلچسپی رکھتے ہیں اور اسے سمجھنا چاہتے ہیں، دعوت دی کہ وہ دوسرے روز جناب مسرور حسین صدّیقی صاحب کے مکان پر تشریف لے آئیں۔ چنانچہ ۲۷ر فروری کو کچھ حضرات تشریف لے آئے جن کے سامنے شیخ جمیل الرحمٰن صاحب نے انجمن کی دعوت پیش کی۔ یہ اجتماع بعد نمازِ مغرب منعقد ہوا۔ ڈاکٹر اسرار احمد علی الصبح ہی پروگرام کے مطابق عازمِ لاہور ہو چکے تھے۔

اپریل ۷۶ء

۲۱ر تا ۲۳ر مارچ لاہور میں تیسری سالانہ قرآن کانفرنس منعقد ہوئی۔ جس میں کراچی سے ۱۹ حضرات نے شرکت کی۔ اس کانفرنس کی وجہ سے مارچ میں کراچی میں ڈاکٹر صاحب کی تشریف آوری نہ ہو سکی۔

کراچی ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن کی دعوت پر ڈاکٹر اسرار احمد صاحب ۳ر اپریل کو کراچی تشریف لائے۔ ۳ر اپریل بروز ہفتہ ہی کو بعد نمازِ عصر ہائی کورٹ بلڈنگ میں ہائی

کورٹ بار ایسوسی ایشن کے ایک جلسہ کو خطاب فرمایا جس کی صدارت سپریم کورٹ کے ریٹائرڈ جسٹس جناب زیڈ۔ بی کیکاؤس نے فرمائی۔ ہال وکلاء سے بھرا ہوا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے علاوہ اس جلسہ کو جناب خالد اسحٰق سابق ایڈووکیٹ جنرل اور جناب نیاز احمد خاں ایڈووکیٹ نے بھی خطاب کیا۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر بہت پسند کی گئی۔ ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب کو دوسری بار خطاب کرنے کی دعوت دی تھی۔ اس سے قبل ڈاکٹر صاحب نے یہاں ۳۱ رمئی ۱۹۷۴ء کو خطاب فرمایا تھا۔

ڈاکٹر صاحب محترم کی کراچی آمد کا فائدہ اٹھاتے ہوئے ہم نے بھی کچھ پروگرام بنا ڈالے۔ ڈاکٹر صاحب نے جامع مسجد بلاک ۵ ناظم آباد میں ۴ر اپریل بروز اتوار کو عصر تا عشاء آیۂ برّ (سورۂ بقرہ آیت ۱۷۷) اور ۵ر اپریل بروز پیر کو مغرب تا عشاء سورۂ حج کی آخری آیات کا درس دیا۔ اور دعوت دی کہ جو حضرات ہمارے کام کو سمجھنا چاہیں وہ دوسرے دن قاضی عبدالقادر کے مکان پر تشریف لے آئیں۔ کیونکہ بقول ڈاکٹر صاحب کے وہ مسجد کو اپنی جماعت کا پلیٹ فارم نہیں بنانا چاہتے۔

دوسرے دن ۶ر اپریل کو عصر تا عشاء ڈاکٹر صاحب نے قاضی عبدالقادر کے مکان پر تشریف لانے والے حضرات سے ملاقاتیں کیں۔ انجمن کے مقاصد بیان کیے اور کام میں تعاون کی مختلف صورتیں پیش کیں۔ اس سلسلہ میں حاضرین کے سوالات کے جوابات دیئے، الجھنوں کو رفع کیا اور آئندہ کے لیے طے کیا گیا کہ قاضی عبدالقادر کے مکان پر ہر ہفتہ بعد نماز عشاء ڈاکٹر صاحب کے منتخب نصاب کے دروس بذریعہ ٹیپ سنایا جایا کریں گے، یہ سلسلہ تاحال جاری ہے۔

۶ر اپریل ہی کو بعد نمازِ عشاء جناب نسیم احمد صاحب فاروقی صدر ہائی کورٹ بار ایسوسی ایشن نے ڈاکٹر صاحب موصوف کو اپنے گھر پر ایک پُرتکلّف دعوتِ طعام دی۔ اس موقعہ پر کراچی کے معروف وکلاء جمع تھے جو دیر تک ڈاکٹر صاحب موصوف سے مختلف مسائل پر تبادلۂ خیال کرتے رہے۔ یہ مجلس کافی رات گئے تک جاری رہی۔ خدا کے فضل وکرم سے ڈاکٹر صاحب اس اعلیٰ علمی مجلس پر چھائے رہے اور ہر مسئلہ کو اتنے شرح

وبسط کے ساتھ بیان کیا کہ میں اور میرے ایک نہایت محترم رفیق عشق عشق کر اُٹھے۔ ڈاکٹر صاحب کی علمیت کا یہ رُخ پہلی بار سامنے آیا تھا۔

۷ر اپریل کو کہ اچی بار ایسوسی ایشن کی جانب سے سٹی کورٹ میں بعد نمازِ عصر ایک جلسۂ عام سے خطاب کیا۔ اس جلسہ کا اہتمام ڈاکٹر صاحب کی آمد کا فائدہ اُٹھاتے ہوئے کہ اچی بار ایسوسی ایشن کے کارپردازوں نے بہت ہی کم وقت میں کیا تھا۔ توازن برقرار رکھنے کے لیئے ڈاکٹر صاحب کے علاوہ چند اور بھی مقرر تھے۔ ہال اور گیلریاں کھچا کھچ بھری ہوئی تھیں۔ جلسہ کے بعد بار ایسوسی ایشن کے عہدیداروں اور دیگر وکلاء کے ساتھ ڈاکٹر صاحب موصوف کی دیر تک تبادلۂ خیال کی نشست رہی۔ بار ایسوسی ایشن کے صدر نے ڈاکٹر صاحب سے معذرت چاہی کہ اس جلسہ میں انہیں خاطر خواہ وقت نہیں دیا جاسکا اور لوگوں میں تشنگی باقی رہی۔ نیز درخواست کی کہ اگلی بار ڈاکٹر صاحب وقت عنایت فرمائیں تو کراچی بار ایسوسی ایشن کی جانب سے ایک اور جلسہ کا اہتمام کیا جائے گا۔ جس میں صرف ڈاکٹر صاحب ہی خطاب فرمائیں گے۔

۷ر اپریل ہی کو ڈاکٹر صاحب قبلہ نے یٰسین مسجد نزد کھجور بازار میں بعد نماز عشاء سیرت النبیؐ کے موضوع پر خطاب فرمایا۔ حاضرین کی علمی استعداد کو دیکھتے ہوئے ڈاکٹر صاحب نے نہایت آسان زبان میں سیرت النبیؐ کے اہم واقعات بیان فرمائے۔ اتنی آسان زبان میں تقریر ڈاکٹر صاحب کی زبانی میں نے پہلی بار سُنی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کہا کرتے ہیں کہ مشکل زبان میں بولنا اور لکھنا آسان ہے لیکن آسان زبان میں بولنا اور لکھنا مشکل ـــــ لیکن ڈاکٹر صاحب مشکل زبان اور آسان زبان دونوں میں بڑی آسانی سے تقریر کر لیتے ہیں ـــــــ یہ اللہ کی دَین ہے، جس سے چاہے اور جس طرح چاہے وہ اپنے دین کی خدمت لیتا ہے۔ آسان کو مشکل بنانے والا بھی وہی ہے اور مشکل کو آسان بنانے والا بھی وہی، اور وہ ہر چیز پر قادر ہے۔

دعوتی کام

یہ اللہ تعالیٰ ہی کا فضل وکرم اور اُسی کی بخشی ہوئی توفیق ہے کہ جنوری ۱۹۷۶ء سے جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب نے کراچی

میں دعوت رجوع الی القرآن کا جو پیغام پیش فرمایا تھا۔ اس کے مطابق کراچی میں اس دعوت کے لیے مسلسل کام ہوتا رہا ہے۔ چنانچہ کمرہ ۲۴ جاپان مینشن میں تقریباً ڈیڑھ سال سے باقاعدگی اور پابندی کے ساتھ ہر اتوار کو موسم گرما میں ۹ بجے صبح اور سرما میں ۹½ بجے صبح ایک ہفتہ واری اجتماع منعقد ہوتا ہے۔ جس میں مطالعہ قرآن حکیم درسِ حدیث اور دیگر تربیتی پروگرام انجام پاتے ہیں۔ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے کراچی کے سب آفس کے ناظمِ عمومی شیخ جمیل الرحمٰن صاحب، محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کے منتخب نصاب کے دروس کے ٹیپ نیز دیگر مشہور و مستند تفاسیر کے مطالعہ سے تیاری کرکے اس منتخب نصاب کا اجتماعی مطالعہ کرا رہے ہیں۔ فی الحال سورۂ نور کے پانچویں رکوع کا درس زیرِ مطالعہ ہے۔ اللہ تعالیٰ ہی کا احسان ہے کہ دعوت رجوع الی القرآن سے متاثر ہو کر جناب مولانا عبدالرحمٰن صاحب نومسلم نے جو ایک مستند عالمِ دین بھی ہیں، اپنی پیرانہ سالی کے باوجود اپنا تعاون پیش کر رکھا ہے۔ چنانچہ ہر اجتماع میں موصوف درسِ حدیث دیتے ہیں۔ اس بات کا اہتمام کرنے کی کوشش کی جاتی ہے کہ مطالعہ قرآنِ حکیم میں جو موضوع زیرِ درس ہو اُسی مطابقت سے درسِ حدیث بھی ہو۔

آج کل منتخب نصاب میں ایمان کے موضوع کا مطالعہ ہو رہا ہے۔ چنانچہ حدیث شریف میں بھی شعب الایمان زیرِ درس ہے۔ شرکاء کی تعداد میں بتدریج اضافہ ہو رہا ہے اور اب ۲۵ سے ۳۰ تک حاضری ہوتی ہے۔ علاوہ ازیں انجمن کے ایک رفیق ہر ہفتہ اپنے مکان پر خواتین کا ایک اجتماع کرکے ان کو دین کے مسائل پر خطاب کرتے ہیں۔ خواتین کی حاضری بھی اوسطاً ۳۰-۴۰ ہوتی ہے۔ ڈرگ روڈ میں ایک رفیق ہر ہفتہ ایک اجتماع کرتے ہیں۔ جس میں منتخب نصاب کے دروس کے ٹیپ سنائے جاتے ہیں۔ ایک رفیق ایک مسجد میں خطبۂ جمعہ سے قبل دعوتِ رجوع الی القرآن پر خطاب کرتے ہیں۔ ناظم آباد میں بھی ایک ہفتہ وار اجتماع کا آغاز ہو گیا ہے جس میں منتخب نصاب کے ٹیپ سلسلہ وار سنائے جا رہے ہیں۔ تقریباً تمام ہی

رفقاء بحمد اللہ اپنے اپنے حلقۂ تعارف واثر میں دعوت کا کام انجام دے رہے ہیں۔

مکتبہ

یکم جون ۷۵ء سے کراچی میں مکتبہ دراصل مکتبہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے ایک سیل ڈپو کے طور پہ کام کر رہا ہے۔ جتنی کتب کی ضرورت ہوتی ہے لاہور سے منگوالی جاتی ہیں اور فروخت کی رقم ہر ماہ معہ ضروری گوشواروں کے لاہور ارسال کر دی جاتی ہے۔

جیسا کہ اُوپر تحریر کیا جا چکا ہے کہ مکتبہ قاضی عبدالقادر صاحب کے گھر کے ایک کمرہ میں قائم ہے اور قاضی صاحب اُس کے اعزازی نگران ہیں۔

یکم جون ۱۹۷۵ء سے ۳۱ر مئی ۱۹۷۶ء تک کراچی ڈپو نے کتب کی فروخت کے ضمن میں مبلغ ۱۹/۳۵۰۰ر ۱۴۳ روپے مرکزی مکتبہ کو ارسال کئے۔

اجتماعات کے سلسلہ میں اعلانات

ڈاکٹر صاحب کی کراچی تشریف آوری کے موقع پہ پروگراموں کی اطلاع پابندی کے ساتھ بذریعہ ڈاک اُن تمام حضرات کو دی جاتی رہی جن کے پتے سینکڑوں کی تعداد میں ہمارے پاس ہیں۔ کراچی کے ایک کثیرالاشاعت روزنامہ کے ایک کارکن کے تعاون کی وجہ سے پروگراموں کی اطلاع باقاعدگی سے اس اخبار میں شائع ہوتی رہی۔ اللہ تعالیٰ انہیں اجر عظیم عطا فرمائے۔

پروگراموں کے سلسلہ میں پوسٹر چھپوائے جاتے رہے جو ہمارے رفقاء نے مساجد اور شہر کے نمایاں مقامات پہ چسپاں کئے۔ ہینڈ بل بھی چھپوائے گئے جو رفقاء نے اپنے احباب میں تقسیم کئے۔ ڈاکٹر صاحب کے درسِ قرآن اور تقاریر کے سلسلہ میں علاقہ کی مساجد کے خطیب اور ائمہ حضرات کو خطوط لکھے جاتے رہے جن میں اُن سے استدعا کی گئی کہ وہ خصوصاً جمعہ کے اجتماعات میں اس بارے میں اعلان فرمادیں

متفرق

ایک صاحب جو دارالسلام (تنزانیہ) یونیورسٹی میں پروفیسر تھے، اور رخصت پہ پاکستان آئے ہوئے تھے، انہیں ڈاکٹر صاحب موصوف کے منتخب نصاب اور دیگر درسِ قرآن اور تقاریر ٹیپ کرائی گئیں۔ تاکہ وہ یونیورسٹی میں اُردو [illegible] سنا سکیں۔ معلوم ہوا ہے کہ اب وہ صاحب جدہ آگئے ہیں۔

(۲) رُودادِ سکھر

از قلم: نجیب صدیقی

۱۹۵۷ء کے اوائل میں جماعتِ اسلامی سے پالیسی اور طریقِ کار بالخصوص دعوت کے تکمیلی مراحل سے قبل ملک کے عام الیکشن میں عملی حصّہ لینے کے فیصلے سے اختلاف کی بنا پر جو رفقاء جماعت سے الگ ہو چکے تھے وہ یہ آس لگائے بیٹھے تھے کہ کوئی تحریک اُنہیں بنیادوں پر اٹھے جو جماعتِ اسلامی کے دورِ اوّل کی دعوت تھی اور وہ اس پر لبیک کہیں یا ان کی شخصیتوں میں سے کوئی شخصیت میدان میں آئے اور اپنے اعوان و انصار جمع کرے اور انہیں خطوط پر اپنے کام کا آغاز کرے جس کی کمی کے سبب انہوں نے جماعتِ اسلامی کو خیرباد کہا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ جماعت اسلامی سے نکلنے کے بعد ہی مطلوبہ طرز پر کام شروع ہو جانا چاہئے تھا مگر یہ آرزو، آرزو ہی رہی۔ شروع شروع میں اس سلسلے میں مختلف کوششیں ہوتی رہیں، لاہور، لائل پور، رحیم یار خاں سکھر میں اجتماعات بھی ہوئے، سر جوڑ کر بیٹھے بھی مگر اس زمین سے کوئی کونپل اُبھری اور نہ وہ برگ و بار لا سکی۔

اس سعی و جہد کے زمانے میں راقم الحروف کا رابطہ ان تمام اصحاب سے رہا جو بہرحال کچھ نہ کچھ کرنا چاہتے تھے اور خاص کر محترم ڈاکٹر اسرار احمد صاحب سے رہا جنھیں یہ فکر کشاں کشاں لیے پھر رہا تھا۔ اِن وجوہ سے قطعِ نظر کہ ڈاکٹر صاحب نے تنِ تنہا اِس عظیم بوجھ کو اپنے کاندھوں پر اٹھانے کی ہمّت کی۔ ہمارے لیے اُن کی اس دعوت میں صرف کشش ہی نہ تھی بلکہ اپنی پیاس کی تسکین کا سامان بھی تھا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی دعوت کی بنیاد کتابُ اللہ سے اٹھائی جو حقیقتاً دین کی بنیاد ہے اور اُس کتاب سے جتنا تعلق بڑھتا جائے گا، بنیاد پختہ ہوگی اور پختہ بنیاد ہی پر عظیم عمارت اٹھائی جا سکتی ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے امتِ مسلمہ کے امراض کی جو تشخیص کی ہے اُس کی تفصیل تو "اسلام کی نشاۃِ ثانیہ" نامی کتابچہ میں دیکھی جاسکتی ہے اور مختصر جملہ میں یوں سمجھئے کہ اللہ، اُس کے رسولؐ، اُس کی کتاب اور یومِ آخرت پر اس امتِ مسلمہ کا ایمان محض قولی رہ گیا ہے جس کے نتیجہ میں دنیا پرستی آگئی ہے اور یہ اُمّت اپنے مقصدِ بعثت کو بھول چکی ہے۔

ڈاکٹر صاحب کے نزدیک اِس کا علاج صرف ایک ہے وہ یہ کہ قرآن مجید جو سرچشمۂ ایمان ویقین ہے اُس کو پڑھا جائے، اُس کی ہدایت کو مشعلِ راہ بنایا جائے، اسی سے قلب واذہان منوّر ہوں گے، انسان خود قرآن کے تقاضے کے مطابق بدلے اور اپنے معاشرے کو بدلنے کی کوشش کرے۔ اِس کے بغیر یہ امّت اپنی کھوئی ہوئی توقیر حاصل نہیں کر سکتی !!

اِس قحط الرّجال کے دَور میں جب کہ ہر شخص دُنیا بنانے کی فکر میں بھاگ رہا ہے اُس کی تمام سعی وجہد دولت سمیٹنے اور معیارِ زندگی بلند کرنے پر مرکوز ہے، جس کی اندرونِ پاکستان رسائی ہے اُس کی تمام صلاحیّت اِسی پر صرف ہو رہی ہے، کوئی مشرق وسطیٰ اور دنیا کے دُور دراز گوشوں سے سمیٹ لانے کی فکر میں سرگرداں ہے۔ ایک تنہا شخص کھڑا ہوتا ہے اور پکارتا ہے: مَنْ اَنْصَارِیْٓ اِلَی اللّٰہِ؟ اے لوگو اللہ کے راستے میں میرے مددگار بنو، اُس کا دین آج پامال ہے، دیکھتے نہیں چہار طرف اُس کے دین کی خلاف ورزی ہو رہی ہے اور تم ہو کہ اپنے دھندوں میں مگن ہو۔

اے لوگو! دنیا تمھاری منزل نہیں یہ تو نشانِ منزل بھی نہیں محض گردِ راہ ہے۔ کتنے نادان ہیں وہ لوگ جو محض گردِ راہ سمیٹنے میں اپنی تمام صلاحیّت ضائع کر رہے ہیں۔ بساطِ عالم میں تمہارا مقام کیا ہے؟ پہچانو! اقوامِ عالم کی رہنمائی تمھارے سپرد کی گئی تھی تمھیں کیا ہو گیا ہے کہ کشکولِ گدائی لیے دَر دَر کی بھیک مانگتے پھر رہے ہو۔ تمہاری بغل میں زندہ کتاب موجود ہے اور تم دوسروں کی طرف رہنمائی کے لیے دوڑ رہے ہو۔ یہ وہی کتاب ہے جس نے ایک عظیم انقلاب برپا کیا تھا، ایسا انقلاب کہ نہ زمین نے ایسا دیکھا تھا نہ آسمان نے ایسا سُنا تھا۔

تمہارا ایمان مضمحل ہو چکا ہے، کہتے تو ہو کہ خدا پہ ایمان ہے، اُس کے رسول پر ایمان ہے اور اُس کی کتاب پر ایمان ہے۔ مگر حقیقتِ حال دوسری ہے۔ تم نے اُس کے اوامر و نواہی کو الگ رکھ دیا ہے اسے محض حصولِ برکت کا ذریعہ سمجھ رکھا ہے کیا اسے ایمان کہتے ہیں؟

ڈاکٹر صاحب نے تعلیم و تربیت کے لیے قرآن مجید سے ایک نصاب منتخب کیا اور اس نصاب کا درس لاہور میں شروع کیا، ایک قلیل عرصہ میں متعدد حلقہ ہائے درس وجود میں آ گئے اور شائقین کتابُ اللہ نے جواب دیا: "نَحْنُ اَنْصَارُ اللّٰہِ"

الحمدللہ کہ آج لاہور کا حلقہ ڈاکٹر صاحب کے اخلاص اور قرآن مجید کی برکت کا جیتا جاگتا نمونہ ہے۔ سکھر ایک چھوٹا شہر ہے اس کی آبادی اڑھائی لاکھ سے متجاوز نہیں۔ دینی اعتبار سے پاکستان کے تمام شہروں میں ممتاز ہے۔ اس شہر میں معروف دینی مکتبۂ فکر کے متعدد مضبوط حلقے موجود ہیں، یہ حلقے سرگرم عمل رہتے ہیں اس لیے دینی چہل پہل دوسرے شہروں سے نسبتاً زیادہ ہے۔

ڈاکٹر صاحب غالباً ۱۹۷۰ء میں جب سکھر تشریف لائے تو سب سے پہلی تقریر آپ نے تعمیرِ نو ہائی اسکول میں کی، یہ تقریر "مسلمانوں پر قرآن مجید کے حقوق" کے عنوان سے شائع ہو چکی ہے۔ اس تقریر کو اساتذہ اور طلباء نے بے حد پسند کیا۔ اسی سفر میں ڈاکٹر صاحب نے مکی مسجد سکھر میں سورۃ العصر کا درس دیا جو اپنی نوعیت کا منفرد درس تھا۔ سامعین حیران تھے کہ اتنی مختصر سورۃ میں کیا کیا عظیم دفتر پنہاں ہیں، کوزے میں دریا نہیں سمندر بند ہے۔ اِس سورۃ کا مرکزی مضمون یا اُس کا مرکزی فکر اور ہماری زندگی کا مرکزی فکر دونوں کے درمیان کتنا بُعد ہے، گویا کہ گھاٹا ہی گھاٹا ہے، خُسران ہی خُسران ہے۔ اگر ہم نے سورۃ کی مرکزی فکر سے اپنی مرکزی فکر کو ہم آہنگ نہ کیا۔ اس مضمون نے اہلِ محفل کو جھنجوڑ کر رکھ دیا، چونکا دیا۔ مگر جس دل پہ برسوں کا زنگ لگا ہوا ہو وہ ایک آدھ بار مانجنے سے صیقل نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب لاہور تشریف لے گئے اور لوگ اپنے اپنے کاموں میں لگ گئے۔ ہاں اتنا ضرور ہوا کہ ذہن پہ ایک نہ مٹنے والا نقش ضرور اُبھر آیا۔

۱۹۷۱ء سے ڈاکٹر صاحب کی گاہے گاہے سکھر میں آمد و رفت جاری رہی جمعیت پنجابی سوداگران دہلی کے نو تعمیر ہسپتال میں ایک تقریر ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب نے نیکی کے مروجہ تصور پر تنقید کی، اور قرآن مجید نے نیکی کا جو تصور دیا ہے اُس کی سورۂ بقرہ کی آیت برّ نمبر ۱۷۷ کی روشنی میں وضاحت فرمائی کہ زمانۂ انحطاط میں نیکی کا ایک محدود تصور رائج ہوا اور وہ نسلاً بعد نسلٍ منتقل ہوتا چلا آیا، وہ تصور مزاجوں میں اتنا رچ بس گیا ہے کہ وہ ایک مضبوط عقیدہ سا بن گیا ہے۔ ذہن کے گرد اس کی اتنی موٹی فصیل ہے جس کا توڑنا آسان نہیں ڈاکٹر صاحب کی اس وضاحت سے اس فصیل میں شگاف تو پڑ گئے مگر باپ دادا سے جو عمل متواتر چلا آرہا تھا اُسے یک لخت رد کر دینا بڑا مشکل امر تھا۔ لوگوں نے محسوس کیا بات تو ٹھیک ہے مگر بقولِ غالبؔ :۔ ؎

جانتا ہوں ثوابِ طاعت و زُہد
پر طبیعت اِدھر نہیں آتی

ڈاکٹر صاحب کی آمد کا انتظار رہنے لگا، احباب کی طرف سے تقاضے ہونے لگے۔ متعدد وجوہات کے سبب ڈاکٹر صاحب کی آمد معطّل رہی۔ کبھی سفر حج درپیش آیا کبھی دیگر مصروفیات یا صحت کی خرابی مانع رہی۔ پھر بھی سال میں متعدد پروگرام ہو جاتے تھے۔ ریلوے انسٹی ٹیوٹ جو سکھر کی معروف جگہ ہے وہاں ڈاکٹر صاحب نے متعدد درس دیئے۔ ڈھائی تین صد افراد پابندی سے شریک ہوتے رہے۔ اسی طرح ہمایوں جیم خانہ، فاران کلب میں ڈاکٹر صاحب نے تقریریں کیں۔

قرآن مجید کا تعارف اُس حلقے میں ہوا جو مساجد میں منعقد ہونے والے دروس میں کم شریک ہوتا ہے۔ لوگوں نے محسوس کیا کہ قرآن مجید زندہ کتاب ہے، عقیدۃً تو سبھی مانتے ہیں کہ یہ رہنما کتاب ہے مگر اس عقیدے کے گرد ریب و شک کے غیر مرئی تانے بانے ہیں اور موجودہ پڑھا لکھا طبقہ تو معاشرے کے خوف سے لب کشائی نہیں کرتا ورنہ اس کا حقیقی ایمان تو متزلزل ہو چکا ہے اور وہ اسے "اساطیر الاوّلین" کے زمرہ میں شمار کرتا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے اس دشت کی سیّاحی بھی کی ہے۔ وہ مغربی مادّہ پرستانہ فکر کے

فریبِ نفس، ریب وتشکیک سے خوب واقف ہیں۔ اُن کے ذہن میں جو جو نظریات بسے ہوئے ہیں اُن کو پہچانتے ہیں۔ وہ بات کرتے ہیں تو اُن کی ذہنی سطح کو سامنے رکھتے ہیں۔ چنانچہ ایسا ہوا کہ گذشتہ دنوں جب روٹری کلب والوں نے ڈاکٹر صاحب کو دعوت دی اور ایک اجتماع "ہوٹل انڈس پاک ان" میں منعقد ہوا اور ڈاکٹر صاحب نے سورۃ العصر پر تقریر فرمائی تو اُن کے ایک معزّز ممبر نے تقریر کے بعد کھلا اعتراف کیا کہ ہم اسے یعنی قرآن مجید کو اس سے پہلے اس طرح کی کتاب نہیں سمجھتے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے چن چن کر ریب وتشکیک کے کانٹے اُن کے ذہنوں سے نکالے۔ ان نظریات کی غلطی واضح کی جن پر موجودہ پڑھا لکھا طبقہ فخر کرتا ہے۔

سچّی بات یہ ہے کہ شیطان نے ذہنوں میں غلط نظریات کے جنگل کے جنگل اگا دیئے ہیں ان کا کاٹنا کچھ آسان نہیں۔ لیکن ہمیں مایوس نہیں ہونا چاہیئے، انشاء اللہ وہ دن آئے گا جب یہ جنگل کٹ جائیں گے اور ان کانٹے دار جھاڑیوں کی جگہ یقین کے بوٹے اُبھریں گے اور ان میں ایمان کے تروتازہ پھول کھلیں گے۔

جون ۱۹۷۴ء میں جب ڈاکٹر صاحب سکھّر تشریف لائے اُس وقت قادیانی مسئلہ اسمبلی میں پیش ہو چکا تھا۔ ڈاکٹر صاحب نے جامع مسجد بندر روڈ میں دورانِ تقریر فرمایا کہ قادیانی مسئلہ تقریباً ایک صدی سے چلا آ رہا ہے، اب اس مسئلے کو حل ہونا ہے اِس لیے کہ یہ مسئلہ قدرت نے اُٹھایا ہے کسی سیاسی یا دینی جماعت نے نہیں اُٹھایا۔ اس وقت فضا پرسکون تھی یہ مسئلہ بحیثیت ایک زندہ مسئلہ کے کہیں موجود نہ تھا۔ قادیانیوں نے کبھی جارحانہ انداز اختیار نہیں کیا۔ واقعۂ ربوہ اس اعتبار سے نہایت اہم ہے کہ خود قادیانیوں نے اس مسئلہ کو زندہ کر کے اپنی موت کو دعوت دی ہے گویا کہ قدرت کی طرف سے یہ بات طے ہو چکی ہے کہ اس مسئلہ کو حل ہونا ہے۔

جون ۱۹۷۴ء کے بعد ڈاکٹر صاحب کی آمد کچھ مہینوں کے لیے معطّل رہی۔ نومبر ۷۵ء سے باقاعدہ ہر مہینے ڈاکٹر صاحب تشریف لا رہے ہیں۔

۲۷ نومبر ۱۹۷۵ء کو ڈاکٹر صاحب نے رفیق ہال سکھّر میں "دنیائے اسلام کی مشکلات کا حل" کے عنوان پر تقریر فرمائی۔

۲۸ نومبر ۱۹۷۵ء کو بعد نمازِ فجر درسِ قرآن مجید دیا جس میں اللہ کی وحدانیت اور اس کے اللہ ماننے کے مفہوم کی وضاحت فرمائی۔ ۱۲½ بجے خطبۂ جمعہ دیا جس میں جمعہ کی اہمیت بیان کی اور یہ بھی فرمایا کہ احادیث سے پتہ چلتا ہے کہ نبی اکرم صلی اللہ علیہ وسلم خطبۂ جمعہ میں قرآن مجید کی تلاوت فرماتے تھے اور اسی سے تذکیر فرماتے تھے۔ اب تو خطبۂ جمعہ کے لیے کچھ رسمی الفاظ رہ گئے ہیں۔ اکثر پڑھنے والوں کا یہ حال ہے کہ وہ خود نہیں سمجھتے کہ کیا پڑھ رہے ہیں اور نہ سامعین جانتے ہیں کہ کیا تعلیم دی جا رہی ہے، کیا تذکیر کی جا رہی ہے اور کس چیز سے منع کیا جا رہا ہے؟ ہر جمعہ کو یہ اہم اجتماعات منعقد ہوتے ہیں مگر اُن سے اُمّتِ مسلمہ کو کوئی فائدہ نہیں پہنچتا۔

اسی شام کو بعد نمازِ مغرب جامع مسجد بندر روڈ کے دالان میں درس کی ایک نشست ہوئی۔ سامعین دو صد سے زیادہ تھے۔ ڈاکٹر صاحب کا درس اپنی نوعیت کا واحد درس ہوتا ہے۔ وہ سامعین کو اپنی طرف اس طرح متوجّہ کر لیتے ہیں کہ وہ اِدھر اُدھر دیکھنا بھی گوارا نہیں کرتے اور ہمہ تن منہمک اور ہمہ تن متوجّہ رہتے ہیں کہ گویا قرآن مجید کی آیاتِ بیّنات کی وضاحت انہوں نے اِس انداز سے اِس سے پہلے کبھی نہ سنی تھی اور پھر اُن آیات کا ربط، نظمِ کلام زمانۂ نزول کی وضاحت کے ساتھ، الفاظ کی تشریح اور معانی در معانی یعنی معارف کا دریا موجیں مارتا ہوا نظر آتا ہے۔ پھر یہی نہیں موجودہ دور میں اِن آیات کا مصداق کون ہے؟ اس کے تقاضے کیا ہیں؟ کرنے سے کیا ملے گا اور نہ کرنے سے کیا نقصانات ہوں گے؟ یہ سب چیزیں جب ایک ترتیب کے ساتھ سامعین کے سامنے رکھ دی جاتی ہیں تو وہ اپنے ذہن کو سپرد کرنے کے سوا چارہ نہیں پاتے وہ کھلا اعتراف کرتے ہیں کہ بات بالکل ٹھیک ہے، ایسا ہی ہونا چاہیے۔

ڈاکٹر صاحب کی آمد کا سلسلہ جاری رہا، فروری ۱۹۷۶ء میں سورۂ تغابن تین نشستوں میں بیان ہوئی پھر مارچ ۱۹۷۶ء میں سورۃ الصف اور سورۃ المنافقون تین دن مسلسل زیرِ درس رہیں۔ سامعین دُور دراز سے بڑے شوق اور لگن سے آتے تھے۔ اپریل ۱۹۷۶ء میں سورۂ جمعہ کی کچھ آیات کی تفصیل بیان ہوئی۔

جیسا کہ پہلے عرض کر چکا ہوں کہ روٹری کلب کی طرف سے ایک نشست اپریل ۱۹۷۶ء میں "ہوٹل انٹرپاک اِن" میں منعقد ہوئی تھی اور ڈاکٹر صاحب نے سورۃ العصر کی توضیح فرمائی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کی تقریر ختم ہونے کے بعد والعصر کا پمفلٹ جو "راہِ نجات" کے نام سے مطبوعہ شکل میں موجود ہے۔ تقریباً ۱۰۰ کی تعداد میں سامعین میں تقسیم کیا گیا۔ اس پمفلٹ پر ڈاکٹر صاحب کے دستخط لینے کے لیے لوگ ٹوٹ پڑے۔ جس طرح طلبا اپنی محبوب شخصیتوں کو آٹو گراف کے لیے گھیر لیتے ہیں۔

اپریل ہی میں سکھر میں انجمن خدام القرآن سکھر کی بنیاد رکھنے کے مسئلہ پر غور ہوا۔ ۱۸۔ افراد نے عملی تعاون کی پیش کش کی اس طرح ایک اجتماعی نظم قائم ہونے کی شکل پیدا ہوئی۔ مئی ۱۹۷۶ء میں جب ڈاکٹر صاحب تشریف لائے تو ایک پروگرام روٹری کلب والوں نے روہڑی سیمنٹ فیکٹری میں رکھا۔ ۵-۶ مئی بدھ، جمعرات سورۃ الحدید کا درس ہوا اور جمعہ کو قبل از نماز جمعہ مکی مسجد میں تقریر ہوئی۔ پھر شام کو طے شدہ پروگرام کے مطابق ایک سیرت کا جلسہ ہوا۔ روہڑی سیمنٹ فیکٹری والوں نے ایک بس اہل سکھر کے لیے بھیج دی تھی۔ اہلِ شوق زیادہ اور جگہ کم۔ بس میں کچھ لوگ کھڑے ہو کر گئے۔ کچھ لوگ رکشے سے پہنچے، کچھ کار سے پھر بھی کچھ لوگ باقی رہ گئے جو سواری نہ ملنے کی وجہ سے واپس ہو گئے۔ قرآن مجید سننے کے لیے یہ ذوق و شوق بڑی اچھی علامت ہے۔ ؎

ذرا نم ہو تو یہ مٹی بہت زرخیز ہے ساقی!

سیمنٹ فیکٹری روہڑی میں بعد نمازِ مغرب ڈاکٹر صاحب نے سیرت کے ایک جلسے سے خطاب کیا۔ سامعین میں سے جو لوگ بھی ملے وہ یہی کہتے تھے کہ آج سے قبل سیرت پر ایسی تقریر نہیں سُنی۔ ایک صاحب تو ڈاکٹر صاحب سے یہ کہہ رہے تھے کہ جی چاہتا ہے کہ سب کام کاج چھوڑ کر آپ کے ساتھ لگ جاؤں۔

ڈاکٹر صاحب نے ایک سوالیہ نشان لوگوں کے سامنے رکھ دیا اور پھر ایک کسوٹی اُن کے ہاتھوں میں دیکر پوچھا کہ اب کون ہے جو اس کسوٹی پر اپنے آپ کو پرکھتا ہے دوسروں کو نہ پرکھئے خود کو اس میزان پر تولیے اگر پورے اترتے ہیں تو خدا کا شکر بجا لائیے، ورنہ اپنی فکر کیجیے۔

یادِ رفتگاں

اسرار احمدؒ

"اِک دیا اور بجھا اور بڑھی تاریکی"

مولوی محی الدین سلفی مرحوم کی وفات پر ایک تعزیتی نوٹ راقم نے جنوری ۷۶ء ہی میں لکھ دیا تھا اور اس کی کتابت بھی اسی وقت ہو گئی تھی۔ اب جو پرچے کی طباعت کی نوبت آئی اور کاپیاں جوڑنے کا مرحلہ آیا تو اچانک ایک مقام پر مولانا سید ابوبکر غزنوی کا نام پڑھنے میں آیا۔ نتیجۃً اس عالمِ فانی اور دارِ غرور کی بے ثباتی کی ایک اور شہادت سامنے آئی اور ایک گھونسا سا کلیجے میں لگا کہ اس نوٹ کی طباعت سے پہلے ہی مولانا موصوف بھی 'مرحومین' کی فہرست میں شامل ہو گئے ـــــ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیْہِ رَاجِعُوْنَ ـــــ بقول شاعر:

؎ مقدور ہو تو خاک سے پوچھوں کہ اے لئیم!
تو نے وہ گنج ہائے گرانمایہ کیا کئے؟

واقعہ یہ ہے کہ تاحال یقین نہیں آتا کہ خانوادۂ غزنویہ کا وہ دُرِّ آبدار، خاندانی شرافت اور وجاہت کا وہ پیکرِ مجسّم، میدانِ خطابت کا وہ شہسوارِ عظیم، لاہور کی دینی، علمی، ادبی اور ثقافتی مجالس کا وہ چہچہاتا عندلیب اور الفاظِ نبویؐ "وَاِنَّ مِنَ الْبَیَانِ لَسِحْرًا" کا وہ مجسّم ثبوت ہم سے ہمیشہ کے لئے جدا ہو گیا۔ شاید اسی قسم کی کیفیت میں کہا تھا علامہ اقبالؒ نے:

؎ مرنے والے مرتے ہیں لیکن فنا ہوتے نہیں ۔۔۔ یہ حقیقت میں کبھی ہم سے جدا ہوتے نہیں
ہستیٔ عالم میں ملنے کو جدا ہوتے ہیں ہم ۔۔۔ عارضی فرقت کو دائم جان کر روتے ہیں ہم

؎ "فاش گویم آنچہ در دل مضمر است!" کے مصداق عرض کر ہی دیا جائے کہ راقم تو منتظر تھا کہ کب خاندانِ غزنویہ کا یہ شاہزادہ کپل وستو کے ولیعہد کے مانند اطوارِ شاہزادگی تج کر اور انٹرکانٹی نینٹل ہوٹل کی تعقدِ نور مجالس کو ترک کر کے کسی نیم تاریک گوشے کی بوریہ نشینی اختیار کرے اور ہمہ وقت و ہمہ تن قلوب کی دنیا میں علم و عرفان کی قندیلیں روشن کرنے اور عشق کا تلاطم برپا کرنے میں مصروف ہو جائے لیکن:

؎ "اے بسا آرزو کہ خاک شدہ!"

بہرحال اِنَّ الْعَیْنَ تَدْمَعُ وَالْقَلْبَ تَحْزَنُ وَلٰکِنَّا لَا نَقُوْلُ اِلَّا مَا یَرْضٰی رَبُّنَا ـــــ مَآ اَصَابَ مِنْ مُّصِیْبَۃٍ اِلَّا بِاِذْنِ اللّٰہِ وَمَنْ یُّؤْمِنْ بِاللّٰہِ یَھْدِ قَلْبَہٗ وَاللّٰہُ بِکُلِّ شَیْءٍ عَلِیْمٌ

یادِ رفتگاں
اسرار احمد

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مولوی محی الدین مرحوم

مولوی محی الدین سلفی کو مرحوم کہنے یا لکھنے پر واقعہ یہ ہے کہ زبان تو تاحال بالکل تیار نہیں ہے، قلم بھی مشکل ہی سے آمادہ ہوا ہے۔ اور ان سطور کی تحریر کے وقت بھی بالکل ایسے محسوس ہو رہا ہے جیسے وہ سامنے بیٹھے پوری شگفتگی کے ساتھ کہہ رہے ہوں "چھوڑیئے ڈاکٹر صاحب! آپ کو ان باتوں کی طرف متوجہ ہی نہیں ہونا چاہیئے، آپ نہ کسی کی آمد و رفت کا خیال کریں نہ خوشی یا ناخوشی کا، بلکہ ہمہ تن اپنے کام میں لگے رہیں، آپ کے کاندھوں پر بہت بھاری بوجھ ہے!"

قارئین 'میثاق' جانتے ہیں کہ رسمی تعزیتی مضامین 'میثاق' کی روایات سے خارج رہے ہیں، لیکن مولوی محی الدین مرحوم کا معاملہ استثنائی ہے۔ ان کا ان سطور کے راقم پر تو حق ہے ہی 'میثاق' پر بھی نہایت ثابت و قائم حق ہے۔ اس لیے کہ یوم اجراء سے لے کر آج تک وہی اس کے پبلشر رہے اور ان کا نام مسلسل اٹھارہ برس 'میثاق' کی پرنٹ لائن کا جزوِ لاینفک رہا۔ یہی نہیں، وہ 'میثاق' کے دورِ اوّل میں جبکہ یہ مولانا امین احسن اصلاحی مدظلہ کے زیرِ اہتمام شائع ہوتا تھا اس کی طباعت اور انتظامی امور کے ضمن میں مولانا کے دستِ راست رہے اور بعد ازاں جب وسطِ ۱۹۶۶ء میں 'میثاق' راقم کی تحویل میں آیا تب سے لے کر آج تک انھوں نے جب بھی بن پڑا تعاون ہی کیا، کبھی کسی مرحلے پر کسی بھی درجے میں کوئی مشکل راقم الحروف کے لیے پیدا نہ کی ——— ! ایک بزرگ فرمایا کرتے ہیں کہ شریف انسان وہ ہے جس

سے کسی کو تکلیف نہ پہنچے، اس معنی میں مَیں گواہی دیتا ہوں کہ مرحوم ایک حد درجہ شریف انسان تھے!

راقم الحروف سے انھیں ایک خصوصی لگاؤ تھا۔ اور اس کا اصل سبب یہ ہے کہ جماعتِ اسلامی سے علیحدگی کے بعد جو لوگ جماعت کی غلط روی ہی کو اپنے تعطل اور جمود کے لیے کافی وجہِ جواز بنا کر یا اُس سے بھی آگے بڑھ کر کوئی نیا فلسفیانہ حیلہ تراش کر یا تو ہمہ تن دنیا کمانے میں مشغول ہو گئے یا کسی جزوی سی دینی خدمت پر مطمئن ہو کر بیٹھ رہے مولوی صاحب مرحوم ان سے معاشرتی روابط یا محبت و عقیدت کے تعلق کے باوصف شاکی ہی رہے ——— اور اگرچہ وہ خود بھی عملاً کچھ کر نہ پائے لیکن انہوں نے اس پر شدید حسرت اور گہرے تأسف کو بہرحال حرزِ جاں بنائے رکھا اور اس "احساسِ زیاں" ہی کی حفاظت اسے "متاعِ کارواں" سمجھتے ہوئے کرتے رہے۔

یہی وجہ ہے کہ جب راقم لاہور سے تقریباً بارہ سال کی غیر حاضری کے بعد دوبارہ ۱۹۶۶ء میں اس عزم کے ساتھ وارِدِ لاہور ہوا کہ اُس اصل تحریکِ اسلامی کے اِحیاء کی کوشش کی جائے جو جماعتِ اسلامی کے غلط رُخ پر مُڑ جانے کے باعث ختم ہو چکی ہے تو جس شخص کو سب سے زیادہ مسرت ہوئی وہ مولوی محی الدین مرحوم ہی تھے ——— چنانچہ انہوں نے ہی میری تالیف "تحریکِ جماعتِ اسلامی: ایک تحقیقی مطالعہ!" کی طباعت و اشاعت کے لیے بھاگ دوڑ کی اس لیے کہ میں خود اس وقت تک اس میدان کے اَسرار و رُموز سے قطعاً ناواقف تھا۔ اس کے بعد انہوں نے ہی مجھے آمادہ کیا کہ ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن حاصل کروں اور اس سلسلے کی بھاگ دوڑ بھی خود انہوں نے ہی کی۔ پھر جب راقم کو "الرسالہ" کے نام سے ایک ماہنامے کا ڈیکلریشن مل گیا لیکن مولانا اصلاحی صاحب نے خواہش ظاہر کی کہ میں بجائے ایک نیا پرچہ جاری کرنے کے "میثاق" ہی کو زندہ کروں اس لیے کہ اس کی اشاعت کا سلسلہ کچھ عرصے سے بالکل بند ہو چکا تھا، چنانچہ مَیں نے "اِمْتِثَالاً لِلْاَمْرِ" "میثاق" کو اپنی تحویل میں لے لیا۔ تب تو مولوی محی الدین مرحوم

کی مسرّت کا کوئی ٹھکانہ نہ رہا ——— چنانچہ وہ دن اور آج کا دن وہ مسلسل اس کے پبلشر کی حیثیت سے ہر مرحلے پر کامل تعاون کرتے رہے۔

جس زمانے میں مَیں لاہور آیا تھا، وہ ہفت روزہ 'الاعتصام' کے مُدیر تھے۔ انھوں نے باصرار مجھ سے مضامین لکھوائے اور اپنے پرچے میں شائع کئے ——— اب سوچتا ہوں تو محسوس ہوتا ہے کہ اس سے ان کو اصلاً مطلوب یہ تھا کہ میرے قلم کا جمود ختم ہو جائے اور مجھے اظہارِ مافی الضّمیر کے لیے قلم کے استعمال کی عادت ہو جائے ——— ان میں سے ایک مضمون تو وہ تھا جو 'میثاق' کے میرے زیرِ ادارت شائع ہونے والے پہلے پرچے میں شائع ہُوا یعنی "حقیقتِ زندگی" (اور یہی ثبوت ہے اس کا کہ "الاعتصام" سے یہ مختصر سا قلمی تعاون ہی اصلاً تمہید بنا میری اس تحریر و تالیف کا جس کا تسلسل بعد میں 'میثاق' کے ذریعے قائم رہا۔) اور دوسرا مضمون جو "مولانا داؤد غزنوی مرحوم کی یاد میں" تحریر کیا گیا تھا اب مولانا سیّد ابوبکر غزنوی کی تالیف "سیّدی ابی" کا جزو ہے۔

مولوی صاحب مرحوم کی اس تحریک اور راقم کی اُن مساعی کے نتیجے میں، یاد ہوگا، اواخر ۱۹۶۷ء میں جماعتِ اسلامی کے سابق رہنماؤں اور کارکنوں کا ایک اجتماع رحیم یار خان میں منعقد ہوا تھا جس میں 'تنظیمِ اسلامی' کے قیام کا فیصلہ کیا گیا تھا ——— لیکن افسوس کہ ع "چلنے نہ پائے تھے کہ گرفتار ہم ہوئے" کے مصداق کچھ ایسے حوادث رُونما ہوئے کہ یہ قافلہ سفر کا آغاز کرنے سے بھی پہلے درہم برہم ہو گیا۔

اس پر جو صدمہ راقم کو ہُوا وہ تو ہوا ہی، واقعہ یہ ہے کہ مولوی محی الدّین سلفی مرحوم کو بھی بہت رنج پہنچا ——— اور اس کے بعد انہوں نے میرے اس فیصلے کی کامل توثیق کی کہ اب جو کچھ کرنا ہے اپنے ہی بل بوتے پر اور اپنی ہی ہمّت و وسعت کے مطابق کرنا ہے! چنانچہ جنوری ۱۹۶۸ء ہی سے راقم نے اپنے اس فیصلہ پر عمل شروع کر دیا اور تن تنہا اس کام کی ابتدا کر دی جو حلقہ ہائے مطالعۂ قرآن کے قیام اور مرکزی انجمن خُدّامُ القرآن لاہور کی تاسیس سے ہوتا ہُوا بالآخر 'تنظیمِ اسلامی' کے قیام (یا احیاء)

پر منتج ہوا ۔ ؎

میں اکیلا ہی چلا تھا جانبِ منزل مگر
راہرو ملتے گئے اور قافلہ بنتا گیا!

اس پورے سفر کے دوران مولوی صاحب مرحوم میرے ساتھ تعاون بھی کرتے رہے اور تحسین اور تائید سے حوصلہ بھی بڑھاتے رہے ـــــ چنانچہ بارہا ایسا ہوا کہ جب کسی مشکل کا سامنا ہوا یا خصوصاً کسی بزرگ یا رفیق کی طرف سے حوصلہ شکن طرزِ عمل کا اظہار ہوا تو انھوں اُس قسم کے جملوں سے ہمت بندھانے کی کوشش کی جو اس تحریر کے آغاز میں درج کئے گئے ہیں۔

وہ عمر میں مجھ سے بہت بڑے تھے اور علوم دینی کی باضابطہ تحصیل کی بنا پر ایک مزید درجۂ فضیلت بھی انھیں حاصل تھا۔ لیکن مجھ سے گفتگو انہوں نے ہمیشہ چھوٹوں کی طرح کی۔ اور ظاہر ہے کہ یہ احترام میری ذات کا نہیں بلکہ میری مساعی کا تھا۔

سعودی عرب جانے کی صورت بنی تو میرے پاس تشریف لائے اور 'میثاق' کے پبلشر کی حیثیت سے ڈیکلریشن کی میرے نام منتقلی کے کاغذات اس طرح مکمل کر کے دے دیئے جیسے "حق بحقدار رسید!" کا معاملہ ہو گیا ہو اور وہ ایک امانت کے بار سے سبکدوش ہو گئے ہوں ـــــ اس موقع پر بھی کسی معاوضے کا تو کیا سوال کوئی ایک حرف تک ایسا نہ کہا جس سے احسان جتانے کی بُو آتی ہو! حالانکہ دریں زمانہ جرائد کے ڈیکلریشن کی جتنی کچھ قدر و قیمت ہے وہ سب کو معلوم ہے ـــــ یہ معاملہ بھی میں سمجھتا ہوں ذاتی طور پر مجھ سے نہ تھا ـــــ بلکہ 'میثاق' کے مقاصد کے ساتھ وابستگی کا نتیجہ تھا!

چونکہ اُن کے اور میرے روابط کی پوری تاریخ ایک ہی شہر یعنی لاہور سے متعلق ہے لہٰذا کبھی ہمارے مابین خط و کتابت کا موقع ہی نہیں آیا۔ چنانچہ میرے پاس اُن کا ایک ہی خط ہے (اور وہ بھی صرف اس لیے محفوظ رہ گیا کہ اُس میں دفترِ "میثاق" کے متعلق بعض اُمور درج تھے۔) جو من و عن ہدیۂ قارئین 'میثاق' ہے۔

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

"سفارت خانۂ پاکستان، جدّہ

۱۹ر نومبر ۱۹۷۵ء

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر صاحب! السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ،

عرفت دبی بفسیخ العزائم، پختہ ارادہ تھا کہ آتی دفعہ مل کر آؤں لیکن کاموں کا اتنا ہجوم اور رشتہ داروں کا اس طرح ازدحام ہوگیا کہ میں ارادے کے باوجود نہ نکل سکا، یہ ایک کوتاہی ہوئی ہے اُمید ہے آپ درگزر فرمائیں گے۔ یہاں آکر بھی مکان اور دفتر کے مسائل میں اُلجھا رہا۔ اب بحمد اللہ کچھ سیٹ ہوگیا ہوں پھر یہ خیال بھی تھا کہ ڈاکٹر صاحب کو خط اس وقت لکھوں جب میں بھی اُن کی پسند کا کوئی کام شروع کر لوں تاکہ اُنھیں بھی خوشی ہو۔ جدّہ کی مارکیٹ میں ایک بہت بڑی مسجد ہے۔ یہاں بُدھ کے روز بعد از نمازِ مغرب درسِ قرآن پاک شروع کیا ہے۔ سُورۂ یُوسُف کو لیا ہے اس لیے کہ میں رحمان پورہ میں اس کا درس دے کر آیا تھا۔ آپ کے ملنے والے حضرات کو اگر اطلاع ہو جائے یا مجھے اُن کے پتے معلوم ہو جائیں تاکہ رابطے کی کوئی صورت بن سکے۔

'میثاق'، رحمان پورہ میں تو جایا کرتا تھا۔ کیا وہ یہاں بھی پہنچ سکتا ہے اگر یہ ممکن ہو تو مجھے مسرّت ہوگی۔ ایک تو آپ کی تحریریں نظر سے گزرتی رہیں گی اور دوسرے خود کاشتہ پودے کی زیارت ہوتی رہے گی۔ اُمید ہے کہ آپ کا دعوتی کام بڑھ رہا ہوگا۔ اللہ تعالےٰ آپ کو عزم و ہمّت اور استقلال عطا فرمائے اِس لیے کہ آپ نے جس کام کا بیڑا اُٹھایا ہے وہ بلاشُبہ مِن عزم الاُمُور ہے۔

قمر صاحب، مختار صاحب اور دیگر احباب کی خدمت میں سلام۔ بچّوں کو دعوات

نیازمند محیّ الدّین السّلفی

ضابط الاتّصال، سفارتِ پاکستان، جدّہ (سعودی عرب)

'تنظیم اسلامی' کا فائل دیکھتے ہوئے برادرم مکرم شیخ جمیل الرحمٰن صاحب ناظم عمومی 'تنظیم اسلامی' کے نام بھی ایک خط سلفی صاحب مرحوم کا نظر آیا ـــــ محسوس ہوا کہ یہ تو ایک دستاویز ہے جسے محفوظ ہو جانا چاہیئے، وَھُوَ ھٰذَا :

بِسۡمِ اللّٰہِ الرَّحۡمٰنِ الرَّحِیۡمِ

محی الدین سلفی مورخہ ۳۱ر دسمبر ۱۹۷۴ء

۸ ـ اے، رحمان پورہ، لاہور

برادرِ مکرم ! السلام علیکم

تازہ 'میثاق' نظر سے گزرا ـ آپ کا تعاقب بسلسلۂ مضمون ماہر القادری صاحب پڑھا ـ بہت لطف آیا آپ نے خوب گرفت کی ہے ـ مجھے یہ معلوم نہ تھا کہ آپ تنظیمی صلاحیتوں کے ساتھ ساتھ اس طرح کا ادبی ذوق بھی رکھتے ہیں ـ یہ کام اگرچہ مستحسن نہیں کہ رسائل و اخبارات میں دینی حلقے آپس میں دست و گریباں ہوں ـ لیکن اگر ایک فریق زیادتی پر اُتر ہی آئے تو دوسرا لازمًا لَا یُحِبُّ اللّٰہُ الۡجَھۡرَ بِالسُّوۡٓءِ مِنَ الۡقَوۡلِ اِلَّا مَنۡ ظُلِمَ کے تحت کچھ نہ کچھ کرتا ہی ہے ـ اللہ تعالیٰ آپ کی کوششوں کو بار آور کرے اور کوئی ٹھوس تنظیمی ڈھانچہ معرض وجود میں آجائے ـ ہم تو آپ کے لیے دعا گو ہیں ـ وَمَا تَوۡفِیۡقُنَآ اِلَّا بِاللّٰہِ

آپ کی مصروفیات مسلّم لیکن مجھے خط کا جواب ضرور مرحمت فرمائیں ـ شکریہ

نیازمند محی الدین

معاصر عزیز ہفت روزہ 'الاعتصام' نے مولوی محیؒ الدین سلفی مرحوم کا حقِ تعلق بحمد اللہ باحسنِ وجوہ ادا کیا ہے ـ چنانچہ اس کی اشاعت بابت ۴ر محرم الحرام ۱۳۹۶ھ میں جناب علیم ناصری صاحب کے کچھ اشعار ان کی یاد میں شائع ہوئے ہیں جن میں سے چند قارئینِ 'میثاق' کی خدمت میں بھی پیش ہیں :

زندگی اک وقفۂ شام و سحر کا نام ہے ‌ ‌ ‌ موت کیا ہے دہر سے عزمِ سفر کا نام ہے

لاکھ روکیں جانے والوں کو رُکے رہتے نہیں
خود ہی چپکے سے چلے جاتے ہیں کچھ کہتے نہیں
جو چلے جاتے ہیں واپس لوٹ کر آتے نہیں
کیا گزرتی ہے وہاں کوئی خبر لاتے نہیں
آہ! محیؔ الدین بھی اُس صف میں شامل ہو گیا
چھوڑ کر ارضِ وطن طیبہ میں جا کر سو گیا
رُوح کو جنّت نعیم اور جسم کو جنّت بقیع
واہ یہ شانِ عظیم اللہ یہ شانِ رفیع
موت سے پہلے اسی خاطر وہ بلوایا گیا
اُس پہ خاص الخاص یہ انعام فرمایا گیا

خُلد میں اُس کو میسّر صحبتِ ابرار ہو
اُس کا مرقد نورِ حق سے بُقعۂ انوار ہو

اور اشاعت بابت ۱۲ محرّم الحرام ۱۳۹۶ھ میں ایک تحریر حافظ صلاح الدّین یوسف صاحب کے قلم سے شائع ہوئی ہے۔ اس کے بھی بعض مقامات درج ذیل ہیں:

"قارئینِ 'الاعتصام' تک یہ دلخراش خبر پہنچ چکی ہے کہ ہماری جماعت کے ایک فعّال اور صاحبِ درد عالم مولانا محیؔ الدین سلفی جدّہ میں انتقال کر گئے ہیں۔ اِنَّا لِلّٰہِ وَاِنَّا اِلَیۡہِ رَاجِعُوۡن!

مرحوم ابھی عمر کی اڑتالیسویں (۴۸) بہار میں ہی داخل ہوئے تھے۔ عام حالات میں تو یہ عمر کوئی مرنے والی نہیں، بلکہ بھرپور کام کرنے کی ہے۔ اسی عمر میں انسان کے قوائے عملی و فکری نقطۂ عروج کو پہنچتے ہیں اور عہدِ شباب کے جذباتی اقدامات کی حقیقت سے واقف ہو کر وہ سنِ شعور کی پختگی کو پہنچتا ہے۔ لیکن قسّامِ ازل نے اُن کی زندگی جس قدر لکھی تھی، اُس سے آگے یا پیچھے تو نہیں ہو سکتا تھا، وہ اچانک چل دیئے اور اپنے پیچھے سوگوار پسماندگان کے علاوہ سینکڑوں احباب کو بھی روتا چھوڑ گئے۔ غفر اللہ لہٗ۔

ان کی موت اس طرح ناگہانی ہوئی کہ جس نے بھی سُنا، سکتے میں آ گیا۔ یقین نہیں آتا تھا کہ وہ محیؔ الدین سلفی جو ابھی تین مہینے قبل ہی سعودی عرب گئے تھے، بڑے خُوش و خُرّم، شاداں و فرحاں سینے میں عزائم کی دُنیا لیے ہوئے، دفعتًہ اس طرح اپنا دامن جھاڑ کر شہرِ خموشاں کی زینت بن جائیں گے اور اس قرآنی حقیقت پر مہرِ تصدیق

ثبت کر جائیں گے کہ " وَمَا تَدْرِیْ نَفْسٌ بِاَیِّ اَرْضٍ تَمُوْتُ " (لقمان)

مرحوم ایک سیماب آسا طبیعت کے مالک تھے اور اس کے ساتھ دین و ملت کی خدمت کے جذبے سے بھی حظِ وافر پایا تھا، یہی جذبہ انہیں مختلف اشخاص اور تحریکوں میں لے گیا۔

میٹرک کرنے کے بعد انہوں نے کچھ زمانہ ریاست مالیر کوٹلہ (مشرقی پنجاب) میں گذارا، جہاں مولانا عبدالغفار حسن صاحب (حال اُستاذ مدینہ یونیورسٹی) نے "کوثر العلم" کے نام مدرسہ جاری کیا ہُوا تھا (اس دور کے ان کے رفیق مولانا عاصم الحداد ہیں جو رابطۃ العالم الاسلامی مکہ معظمہ میں ہیں) وہاں سے مدرسہ غزنویہ امرتسر چلے گئے۔

قیامِ پاکستان کے بعد حضرت مولانا محمد عطاء اللہ صاحب حنیف دامت برکاتہم کے پاس گوندلانوالہ (گوجرانوالہ) پہنچ گئے۔ وہاں سے مولانا دام ظلہ العالی کے ساتھ دارالعلوم تقویۃ الاسلام شیش محل روڈ آگئے جہاں حضرت مولانا کئی سال شیخ الحدیث کے منصب پر فائز رہے۔ یہیں پر اُن سے عُلوم کی تکمیل کی، مؤطا امام مالک سیدنا مولانا داؤد غزنویؒ سے پڑھا تھا۔ بعد میں غالباً بی۔ اے تک انگریزی پڑھ لی تھی۔

خدمتِ دین کا یہی جذبہ انہیں جماعتِ اسلامی میں لے گیا اور کئی سال اُس میں کام کیا۔ بالآخر مولانا امین احسن اصلاحی اور مولانا عبدالغفار حسن وغیرہ کے ساتھ جماعتِ اسلامی سے وہ بھی نکل آئے۔"

اور اشاعت بابت ۵ رصفر ۱۳۹۶ھ میں مولانا محمود احمد میر پوری مقیم مدینہ منوّرہ کے قلم سے ایک تحریر شائع ہوئی ہے جس میں سلفی صاحب مرحوم کے انتقال اور تجہیز و تکفین سے متعلق بعض تفاصیل درج ہیں جو ذیل میں نقل کی جا رہی ہیں :

سلفی مرحوم کی موت بالکل اچانک ہوئی حالانکہ بظاہر وہ بالکل صحت مند اور توانا تھے۔ ان کی بیماری کے بارے میں ان کے بڑے بچے سالم محیُ الدین

جس کی عمر چودہ سال ہے اُس نے مجھے بتایا کہ مرحوم ایک عرصہ سے پیٹ میں کبھی کبھی درد محسوس کرتے تھے۔ مگر معمولی علاج سے اِفاقہ ہو جاتا۔ جس رات کے پچھلے پہر اُن کی موت واقع ہوئی اُسی رات عشاء سے پہلے گھر میں بچّوں کو جنّت البقیع کے بارے میں بتاتے رہے مگر انہیں یہ معلوم نہ تھا کہ ایک دن کے بعد وہ خود جنّتُ البقیع میں پہنچ جائیں گے۔ عشاء سے پہلے کچھ درد ہُوا۔ دوائی استعمال کی تو افاقہ ہو گیا اور سو گئے ۹ بجے اُٹھ کر عشاء کی نماز ادا کی اور پھر لیٹ گئے فجر کی اذان سے تقریباً ایک گھنٹہ پہلے درد کا شدید حملہ ہوا۔ سالم کہتا ہو کہ مجھے کہا کہ جاؤ ڈاکٹر کو بُلا کر لاؤ مَیں دروازے سے باہر نکلا تو میرے پیچھے آ گئے اور کہنے لگے واپس آ جاؤ اور پھر پیچھے مڑے۔ ابھی چارپائی کے قریب پہنچے ہی تھے کہ ملک الموت آ پہنچا اور دوبارہ چارپائی پر لیٹنے کی مہلت نہ دی اور اس طرح رُوح قفسِ عنصری سے پرواز کر گئی اور ایک بیوہ اور پانچ بچّوں پر مشتمل خاندان کو پردیس میں سوگوار چھوڑ کر الوداع ہو گئے۔ اللّٰھم اغفرلہ وارحمہ وعافہ واعف عنہ۔

صبح جمعرات تھی اور سعودی عرب میں جمعرات اور جمعہ کو تعطیل ہوتی ہے اس لیے بہت کم لوگوں کو ان کے انتقال کی خبر مل سکی۔ اس روز حُسنِ اتّفاق سے محترم مولانا عبدُالغفّار حسن (اُستاذ مدینہ یونیورسٹی) جدّہ میں تھے۔ مولانا فرماتے ہیں کہ جس رات محیُّ الدّین صاحب کا انتقال ہُوا اس رات میری طبیعت میں اُن سے ملنے کا بہت اشتیاق رہا اور صُبح ہوتے ہی مَیں نے اپنے لڑکے شعیب صاحب کو اُن کے گھر پتہ کرنے بھیجا اور یہ بھی کہا کہ آج دوپہر کا کھانا وہ ہمارے ساتھ کھائیں۔ شعیب جب ان کے گھر پہنچے تو وہاں پر موجود لوگوں نے اُن کے انتقال کی خبر دی وہ فوراً واپس آئے اور مولانا صاحب کو ساتھ لے کر گئے تو پھر تجہیز و تکفین کا انتظام مولانا محترم کی نگرانی میں ہُوا اور جدّہ میں نمازِ جنازہ بھی مولانا عبدالغفّار صاحب نے پڑھائی۔ اس کے بعد وزارتِ حج کے آفیسران نے آپ کی میّت جنّتُ البقیع میں دفن کے لیے مدینہ منوّرہ

روانہ کی اور جمعۃ المبارک کو نمازِ فجر کے بعد مسجدِ نبوی میں آپ کی نمازِ جنازہ ادا کی گئی اور اس کے بعد جنّتُ البقیع میں دفن کر دیئے گئے۔ ؎

حکم المنیّۃ فی البریّۃ جار
ما ھذہ الدّنیا بدار قرار

"مرحوم بحیثیت رابطہ افسر پاکستانی سفارت خانے میں گئے تھے لیکن اس منصبی ذمہ داری کے علاوہ ان کے کئی دیگر دینی و کاروباری پروگرام بھی تھے جس کا اظہار وہ جانے سے کچھ عرصہ قبل اپنے دوستوں سے کرتے رہے تھے لیکن شنید یہ ہے کہ وہاں جانے کے بعد اُن کے دل کی دُنیا ہی بدل گئی تھی اور ترکِ ماسوا اللہ کی منزل پر گامزن ہو گئے تھے۔ اُن کے دوست مصطفیٰ صادق صاحب ایڈیٹر روزنامہ 'وفاق' لاہور جو اس دفعہ حج پر اُن کے تقریباً ساتھ ہی رہے، اُن کا بیان ہے کہ مرحوم نے مجھ سے کہا کہ پاکستان سے آتے وقت میرے بہت کچھ عزائم تھے لیکن زیارتِ بیتُ اللہ کے بعد تمام ولولے سرد پڑ گئے ہیں اور اب جی چاہتا ہے کہ ہمہ تن اپنے کو خدمتِ دین کے لیے وقف کر دوں"..........

"اُن کا سانحۂ ارتحال احباب اور قرابت مندوں کے لیے یقیناً افسوسناک ہے لیکن ساتھ ہی قابلِ رشک بھی ہے کہ موت اُن کو دیارِ پاک میں لے گئی — اور جنّتُ البقیع کی ارضِ پاک میں دفن ہوئے جو یقیناً اُن کے مومنِ قانت ہونے کی دلیل ہے۔

مرحوم پتوکی کے موضع گوہڑ کے رہنے والے تھے، اُن کے والد حاجی میاں اللہ بخش صاحب تھے جو اپنے علاقے کی ایک مؤثر رفاہی شخصیت تھے۔ دین و ملّت کے جذبے سے بھی سرشار تھے، انھوں نے اپنے دونوں بیٹوں کو علمِ دین پڑھا کر دین کا خادم بنایا۔ اور حق یہ ہے کہ دونوں بیٹوں نے باپ کی خواہش اور جذبے کے مطابق دین کا قابلِ قدر کام کیا۔ محی الدّین سلفی کے برادرِ اکبر مولانا محمد اسحاق رحمانی تھے جو جماعتِ اہلِ حدیث کے ایک فاضل عالم، بہترین خطیب

خطوط و نکات

(۱)

ایبٹ آباد ۴ مارچ ۱۹۷۶ء

محترمی زاد عنایتہٗ

السلام علیکم۔ امید ہے مزاج گرامی بخیر ہوگا۔ آج طبیعت نے چاہا کہ آپ سے ہم کلامی کا شرف حاصل کروں۔

"میثاق" میں "حفاظتِ متنِ قرآن" کا جو سلسلۂ مضامین آ رہا ہے، وہ حد درجہ قابلِ قدر اور معلومات افزا ہے۔ جب یہ سلسلہ ختم ہو جائے تو صاحبِ مضمون سے استدعا کی جائے کہ اس کو دوامی نفع کے لیے کتابی صورت میں شائع کیا جائے۔

صاحبِ مضمون کا یہ نقطۂ نظر کہ:

"آنحضرت صلی اللہ علیہ وسلم کی زندگی میں حفاظتِ قرآن کے دو بنیادی اُصول طے پا گئے تھے اور نافذ کر دیے گئے تھے (ا) حِفظ، جس کے ذریعے تلفظ اور ترتیب کی حفاظت مقصود تھی (ب) کتابت، جس کے ذریعے ہجا اور رسم سے استناد کو نص پر اعتماد کی بنیاد قرار دیا گیا۔ عہدِ نبویؐ کے بعد سے آج تک حفاظتِ متنِ قرآن کے لیے ان ہی دو اُصولوں سے کام لیا گیا....."

بہت ہی معلومات افزا ہے۔

مَیں نے یہ طولانی تمہید ایک نقطۂ نظر پر تنقید کرنے کے لیے تحریر کی۔ پچھلے دنوں میں نے "افاداتِ مہر" مع اُن کے مکتوبات شائع کی۔ ان مکتوبات میں جہاں مرحوم نے ان شاء اللہ تحریر فرمایا تھا۔ مَیں نے حسبِ رواجِ کتابتِ زمانۂ حال اس کو انشاء اللہ لکھ دیا۔ اس پر ان کے ایک معتقد (مسٹر محمد عالم صاحب دفتر اکاؤنٹنٹ جنرل پنجاب)

نے گرفت فرمائی۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ مولانا مرحوم قرآنی رسم الخط کو سب سے زیادہ صحیح سمجھتے تھے اور اُس کے مطابق قرآنی الفاظ کو اُردو رسم الخط میں لکھتے جیسے ان شاء اللہ قرآن مجید میں جہاں کہیں یہ لفظ وارد ہُوا ہے، مفرد صورت میں ہی تحریر ہے مگر اکثر لوگ اسے مرکّب صورت میں تحریر کر دیتے ہیں یعنی انشاء اللہ۔ آپ مولانا کے خطوط نکال کر دیکھیں گے تو صورتِ حال واضح ہو جائے گی۔ مگر آپ نے 'افاداتِ مہرؒ' میں ہر جگہ مرکّب صورت ہی میں تحریر کیا ہے۔ مَیں نے جب مولانا مہرؒ کے خطوط غور سے دیکھے تو اپنی غلطی پر نادم ہوا۔ اور مولانا مہرؒ کو "حفاظتِ متنِ قرآن" کے بیان کردہ نقطۂ نظر کا حامل پایا۔ آج کل عموماً اس لفظ کو مرکّب صورت میں "انشاء اللہ" ہی لکھا جاتا ہے۔ اس غلط رسم الخط سے اِن شاء اللہ (عربی مفہوم) اور انشاء اللہ (فارسی مفہوم) میں زمین و آسمان کا فرق ہے۔ کیا آپ اس مسئلہ پر زیرِ عنوان "تذکرہ و تبصرہ" کبھی روشنی ڈال کر ممنون فرمائیں گے

جنوری ۱۹۷۶ء کے 'میثاق' میں مضمون زیرِ عنوان "تذکرہ و تبصرہ" عمیق غور و فکر کا مظہر ہے۔ اس مضمون نے "ہندی اسلام" کی بنیاد اور ظاہری پیچیدگی کو کما حقہٗ حل کر دیا، اگرچہ اب وہ حالات نہیں رہے۔ لیکن گذشتہ زمانہ کے علماء و مشائخ کی باہمی ہنگامہ آرائی نے جن مصائب میں مسلمانوں کو مبتلا کیا اُس نے (عربی) اسلام کی بنیادی سادگی، سچائی اور اثر کو زیر و زبر کر دیا۔ اسی لیے علّامہ اقبالؒ نے اس چپقلش کو فِی سَبِیلِ اللّٰہ فساد سے موسوم کیا۔

حج کے زیرِ عنوان، آپ نے اچھوتے انداز میں قلم اٹھایا اور سوانح ابراہیمیؑ کو بڑے دلکش انداز میں پیش فرمایا اور آپ نے لکھا :-

"اِدھر بوڑھا باپ اپنے جوان ہوتے ہوئے بیٹے کو دیکھ دیکھ کر جی رہا تھا اُدھر قدرت مسکرا رہی تھی۔ اُس کے ترکشِ امتحان میں ابھی ایک تیر باقی تھا .....
گویا جس کا امتحان لیا جا رہا تھا اُس نے ہمّت نہ ہاری۔ ممتحنؑ کو ہی بس کرنا پڑی"

بلاغت کی انتہا ہے : ع اللہ کرے زورِ قلم اور زیادہ !

اِس منظر کو مولانا ابوالکلام آزادؒ نے اپنے رنگ میں یوں تحریر کیا :-

" ابراہیمؑ کے دل میں اپنی محبت کے ساتھ بیٹے کی محبت گوارا نہ ہوئی۔ اسمٰعیلؑ کے پہلو میں اپنے گھر کو دیکھا تو محبتِ نفس و جاں کی پرچھائیں نظر آئیں ع "عشق است و ہزار بدگمانی" غیرتِ الٰہی نے اس کو بھی منظور نہیں کیا، حکم ہوا کہ پہلے محبت کے مکان کو ایک ہی مکین کے لیے خالی کر دو پھر اس طرف نظر اٹھا کر دیکھنا کہ " الغیرۃ من صفاتِ حضرۃ الربوبیۃ" محبت کی عشق آموزی کا پہلا سبق غیرت ہے اور یہی معنی ہیں اس آیتِ کریمہ کے کہ :

"اِنَّ اللّٰہَ لَا یَغْفِرُ اَنْ یُّشْرَکَ بِہٖ وَیَغْفِرُ مَادُوْنَ ذٰلِکَ لِمَنْ یَّشَآءُ ط"

سلطانِ محبت تمام گناہوں کو معاف کر سکتا ہے مگر اس کی عدالت میں دل کی تقسیم کا کوئی قانون نہیں ع کہیں مسئلہ در نسخۂ محمود وایاز است

(ماخوذ از : عید الضحیٰ نمبر "الہلال" ۲۷ر نومبر ۱۹۱۲ء)

اس طویل خط کی معافی چاہتا ہوں ع لذیذ بود حکایت، دراز تر گفتم

"میثاق" اور "تدبر قرآن" جلد چہارم کا بے صبری سے انتظار ہے۔

والسلام ! محتاجِ دُعا۔ نیازمند

(ڈاکٹر) شیر بہادر خاں پنی

(۲)

مکہ مکرمہ ۱۵ر اپریل ۷۶ء، الموافق ۱۶ر ربیع الثانی

بسم اللہ الرحمٰن الرحیم

مکرمی و محترمی جناب ڈاکٹر اسرار احمد صاحب دامت فیوضکم

السلام علیکم ورحمۃ اللہ وبرکاتہٗ

امید ہے کہ مزاج گرامی بخیر ہوں گے۔ عرصۂ دراز سے آپ کو لکھنے کا ارادہ کر رہا تھا، دراصل آپ سے جس دن سے ایک تعلق خاطر قائم ہوا ہے، جب بھی کسی دینی و فکری مسئلہ کی طرف ذہن منتقل ہوتا ہے کسی نہ کسی جانب سے آپ کا تصور بھی آ موجود ہوتا ہے۔

گذشتہ عید کے موقع پر پاکستان اتنی مختصر مدت کے لیے آنا ہوا کہ خواہش کے باوجود آپ سے ملنے کا کوئی امکان پیدا نہ ہو سکا ..... واپسی پر دو ماہ تقریباً خلوت میسّر رہی اور اس عرصے میں مَیں نے تقریباً وہ ساری کتب بغور دیکھیں جو آپ کی کتاب 'تحریکِ جماعتِ اسلامی' میں زیرِ بحث آئی ہیں۔ مودودی صاحب کی اُن تحریروں کو دوبارہ پڑھنے کے دوران آپ کی کتاب بھی بطورِ حوالہ مسلسل پیشِ نظر رہی، ساتھ ہی دوسرے تمام مضامین بھی دیکھتا رہا۔ اب آج کل دوسرے علماء کی بھی بعض چیزیں دیکھ رہا ہوں۔ تبلیغی جماعت کی نصابی کتب بھی دیکھ لی ہیں اور اب کچھ تصوّف سے متعلق چیزیں دیکھ رہا ہوں۔

'میثاق' میں جنوری کے شمارے تک جو چیزیں آئی تھیں وہ بھی بہت دلچسپی سے دیکھتا رہا ہوں۔ بالخصوص مولانا آزادؒ سے متعلق شذرات بہت دلچسپی سے پڑھے .... آپ نے مولانا آزادؒ اور مولانا محمود حسنؒ کا ذکر جس رخ سے اپنی دعوت کے اس مرحلے میں کیا ہے وہ میری دلچسپی کا محور رہا۔ 'غلوّ فی الحنفیّت'، وغیرہ کے سلسلے میں آپ نے جو کچھ تحریر فرمایا اور ہندوستان میں وُرودِ اسلام سے متعلق جو اشارات آپ نے فرمائے وہ بھی بہت وقیع ہیں۔ 'بعثتِ نبویؐ کا مقصد' بہت معرکۃ الآراء مضمون تھا۔ روزے کی حقیقت پر بھی مضمون اچھا تھا مگر اس کی بعض چیزیں پسند نہیں آئیں۔

مَیں دراصل یہ سمجھنے کی کوشش کر رہا ہوں کہ جماعت اسلامی کی تحریک سے آپ کی راہ کہاں کہاں الگ ہوئی ہے۔ مَیں نے کئی بار آپ کے مضامین کو اس نظر سے دیکھا اور ساتھ ہی اب کی بار مولانا کی تحریریں بھی غور سے پڑھیں۔ جہاں تک آپ کے اس تجزیے کا تعلق ہے جو ایک 'تحقیقی مطالعہ' میں آپ نے پیش کیا ہے، بات سمجھ میں آتی ہے یعنی حبِّ عاجلہ اور طریقِ کار میں تبدیلی کے بارے میں آپ کے دلائل واضح ہیں۔ مگر اب کچھ محسوس ہوتا ہے کہ غالباً اس تصوّرِ دین سے بھی آپ متفق نہیں ہیں جو ابتدائی کتب میں موجود ہے۔ ..... !

مجھے کچھ دنوں سے یہ احساس شدّت سے ہو رہا ہے کہ اس وقت کرنے کا سب

سے پہلا کام یہ ہے کہ حق جو مختلف افراد اور مجموعہ ہائے افراد میں منتشر اور مختلف اجزا کی صورت میں بکھرا ہوا ہے اس کو یکجا کیا جائے۔ آپ نہیں کہہ سکتے کوئی ایک شخص سراسر حق پر ہے اور اسی طرح یہ بھی صورتِ حال باقی نہیں رہی کہ دین اپنے تمام ہمہ جہتی پہلوؤں کے ساتھ کسی ایک جگہ موجود ہو۔ نئی دعوت سراسر نئی کبھی نہیں ہو سکتی۔ آپ کو اس CONTINUITY میں شامل ہونا چاہیئے جو امت کی تاریخ میں اہلِ حق کی کاوشوں سے عبارت رہی ہے۔ اگر کوئی میزان اجزائے حق کے SORT OUT کرنے کی بنا سکیں تو پھر مختلف افراد اور جمعیتوں سے تعاون کی شکل پیدا کرنے کی کوشش ضروری ہے .....!

جہاں تک میرا خیال ہے آپ کی دعوت لب و لہجہ کے اعتبار سے ضرور مختلف ہو سکتی ہے لیکن اُصولاً وہی دعوت ہے جو اس صدی کی ابتداء سے مولانا ابوالکلام آزاد اور پھر مولانا مودودی نے اسلوب و لہجہ کے فرق سے پیش کی ہے .....

دراصل ہمارے ہاں ہر حلقے میں دینی کام کے ساتھ غُلوّ کا رواج رہا ہے کہیں 'غُلوّ فی الحنفیت' ہے تو کہیں 'غلوّ فی تزکیہ و تربیت' اور کہیں 'غُلوّ فی الحُبّ' اسی طرح مودودی صاحب کے ہاں بھی اگر تھوڑا سا 'غُلوّ فی نظامِ اسلام' پایا جاتا ہے تو اُس کے تاریخی اسباب ہیں۔ جس چیز پر پہلے بالکل توجہ نہیں دی گئی تھی اس پر EMPHASIS دینے والے کے لیے OVER EMPHASIS سے بچنا مشکل ہو تو یہ ایسی کوئی بڑی حیرت ناک بات نہیں ہے۔ البتہ دین کا جو جامع اور ہمہ گیر تصور ہمیں اس واسطے سے ملا، کیا آپ سمجھتے ہیں وہ رجوع الی القرآن کی تحریک میں دلچسپی لینے والے کے لیے قطعاً اہمیت نہیں رکھتا۔ میرا خیال ہے کہ اگر آپ تاریخ کے اس تسلسل پر جس طرح مولانا آزاد کا ذکر کرتے ہیں اور ان کی تحقیر کیے بغیر دینی تحریک کا معنوی رشتہ ان سے جوڑ رہے ہیں۔ اسی طرح یہ بھی صاف صاف کہیئے آپ کی دعوت فی الاصل وہی دعوت ہے جسے مولانا مودودی نے آغازِ کار میں برِّصغیر میں پیش کیا اور تقسیمِ ہند کے بعد گم کردہ راہ ہو گئی۔

دراصل رجوع الی القرآن کی دعوت کے علمی کینوس کو وسیع کرنے کی ضرورت ہے۔ اس صدی کی تحریکوں کو بالکل OWN نہ کریں تو DISOWN بھی نہ کریں۔ دیوبند، حزب اللہ، جماعت اسلامی، اور تبلیغی جماعت سارے ہی کام قابلِ قدر رہے ہیں۔ تحریک میں عصبیت اور یک رُخا پن نہیں آنا چاہیئے۔ "وحدتِ اُمّت" مفتی محمد شفیع صاحب کی تصنیف بھی دیکھی۔ آپ اس راہ میں آگے بڑھیئے۔ آپ جیسا BACKGROUND رکھنے والا شخص اس سلسلے میں کچھ نہ کچھ کر سکتا ہے۔

فقط ــــــــــ والسلام

مخلص زُبیر عمر صدیقی

(بقیہ یادِ رفتگاں)

اور جمعیّتِ اہلِ حدیث کے مرکزی رہنماؤں میں سے تھے۔ مولوی محیّ الدین اُن سے چھوٹے تھے۔ دونوں بھائی اَلْوَلَدُ سِرٌّ لِاَبِیْہِ کا مصداق تھے۔ افسوس ہے کہ یکے بعد دیگرے جماعت ان دونوں بھائیوں سے محروم ہو گئی جو جماعتی درد سے سرشار تھے ـــــ اللہ تعالیٰ دونوں کی مغفرت فرمائے اور دونوں کو اعلیٰ علیّین میں جگہ دے۔"

اللہ تعالیٰ مرحوم کی خطاؤں سے درگذر فرمائے، اُن کی نیکیوں کا اجرِ جزیل عطا فرمائے اور انہیں جنّت الفردوس میں جگہ عطا فرمائے۔ آمین ثم آمین

حاشیہ متعلقہ صہ

لہ مولانا کی اس تحریر سے راقم کو جو تعلقِ خاطر ہے اس کا اندازہ اس سے لگایا جا سکتا ہے کہ جولائی ۱۹۶۶ء میں 'میثاق' کے دَورِ ثانی کے آغاز پر راقم نے اسے دوبارہ شائع کیا۔ پھر ایک بار پچھلے سال کے کسی شمارے میں اسے سہ بارہ شائع کیا۔ اور اب آئندہ ماہ دَورِ نو کا آغاز بھی ان شاء اللہ اسی سے ہوگا۔ (اسرار احمد)

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ

کا ایک اہم سنگِ میل

قرآن اکیڈمی

زیرِ اہتمام

مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور

• ۱۲ • افغانی روڈ • سمن آباد •

(فون: ۸۵۶۰۰۳ ۸۴۱۳۹۴۵)

اسلام کی نشأۃِ ثانیہ کا اہم سنگ میل

قرآن اکیڈمی

ابتدائی تعارف اور اپیلِ تعاون

از قلم

ڈاکٹر نسیم الدین خواجہ

ناظم شعبۂ نشر و اشاعت مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

الحمد للہ والمنۃ کہ مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے زیر اہتمام مجوزہ قرآن اکیڈمی کا سنگ بنیاد اس سال یوم عاشورا (۱۰ محرم الحرام ۱۳۹۶ھ مطابق ۱۳ جنوری ۱۹۷۶ء) کو رکھ دیا گیا تھا۔ اور اب تعمیر کا کام تیزی سے جاری ہے۔

"قرآن اکیڈمی" کے قیام کی تجویز مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کے صدر مؤسس، ڈاکٹر اسرار احمد نے اپنی اس تحریر میں پیش کی تھی جو اوّلاً ماہنامہ "میثاق" لاہور کی اشاعت بابت جون ۱۹۶۷ء میں بطور اداریہ شائع ہوئی تھی اور بعد ازاں "اسلام کی نشأۃ ثانیہ :- کرنے کا اصل کام" نامی کتابچے کی صورت میں طبع ہوئی جس کے اب تک بحمد اللہ تین ایڈیشن شائع ہو چکے ہیں۔

اپنی اس تحریر میں ڈاکٹر صاحب نے اوّلاً امتِ مسلمہ کے موجودہ زوال و انحطاط کے اصل سبب اور اس کے ازالے کے ضمن میں اپنی تشخیص و تجویز پیش

کی ہے ۔ جس کا خلاصہ حسب ذیل ہے :۔

(۱) ہمارے موجودہ دینی انحطاط کا اصل سبب یہ ہے کہ مغرب کی بے خدا سائنس اور یورپ کے ملحدانہ فلسفہ و فکر نے بحیثیت مجموعی پوری اُمّت کے ایمان کی جڑوں کو ہلا ڈالا ہے اور خرمنِ یقین کو جلا کر راکھ کر دیا ہے ۔

(۲) اندریں حالات اسلام کی نشأۃِ ثانیہ اور غلبۂ دینِ حق کی لازمی شرط PRE-REQUISITE) تجدیدِ ایمان ہے اور قصرِ اسلام کی تعمیرِ نو کے لئے ایمان کی ان بنیادوں کی از سرِ نو تعمیر ناگزیر ہے جو صرف مضمحل ہی نہیں منہدم ہو چکی ہیں ۔

(۳) تجدیدِ ایمان کی اس مہم میں اوّلین اہمیت معاشرے کے اس فہیم عنصر INTELLECTUAL) اور ذہین اقلیت INTELLIGENTSIA) MINORITY) کو حاصل ہے جو از خود معاشرے کی ذہنی و فکری قیادت کے منصب پر فائز ہے اور جسے جسدِ ملّت میں وہی مقام حاصل ہے جو ایک فردِ نوعِ بشر کے جسم میں اس کے دماغ (BRAIN) کو حاصل ہوتا ہے ۔

(۴) اس طبقے کے قلوب و اذہان میں ایمان کی تخم ریزی اور آبیاری کیلئے لازم ہے کہ خالصتہً قرآن حکیم کی بنیاد پر اور اُسی کی ہدایت و رہنمائی کی روشنی میں ایک ایسی زبردست علمی تحریک برپا ہو جو ایک طرف وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر ملحدانہ افکار و نظریات کا مؤثر اور مدلّل ابطال کرے ۔ دوسری جانب ٹھوس علمی استدلال کی مدد سے حقائقِ ایمانی کا واضح اثبات کرے تاکہ یقین اور اذعان کی کیفیت پیدا ہو ۔ اور تیسری طرف ثابت شدہ سائنسی حقائق اور حقیقتِ کائنات و انسان کے بارے میں قرآن حکیم کے نقطۂ نظر میں ایسی تطبیق پیدا کرے جس سے قلوب مطمئن ہو سکیں (وَلٰكِنْ لِّيَطْمَئِنَّ قَلْبِيْ)

(۵) اس کے لئے لازم ہے کہ کچھ ایسے نوجوان جو بیک وقت ذہین اور باصلاحیت بھی ہوں اور باہمّت اور صاحبِ عزیمت بھی اور جنہیں اللہ تعالےٰ اپنی کتابِ عزیز

پر خالص ذاتی نوعیت کا ایمان و یقین عطا فرما دے۔ اپنی پوری زندگی کو تعلّم و تعلیم قرآن کے لئے وقف کر دیں اور اس کتاب حکیم کے فلسفہ و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے سوا زندگی میں ان کا مقصود مطلوب اور کچھ نہ رہے۔"

اور پھر "وہ عملی اقدامات" کے عنوان کے تحت تحریر کیا ہے:

"وہ متذکرہ بالا علمی تحریک کے اجراء کے لئے فوری طور پر دو چیزیں لازمی ہیں۔ ایک یہ کہ عمومی دعوت و تبلیغ کا ایک ایسا ادارہ قائم ہو جو ایک طرف تو عوام کو تجدید ایمان اور اصلاح اعمال کی دعوت دے اور جو لوگ اس کی جانب متوجّہ ہوں ان کی ذہنی و فکری اور اخلاقی و عملی تربیت کا بندوبست کرے اور ساتھ ہی اس علمی کام کی اہمیّت ان لوگوں پر واضح کرے جو خلوص اور دردمندی کے ساتھ اسلام کی نشأۃ ثانیہ کے آرزومند ہیں اور دوسری طرف ایسے ذہین نوجوان تلاش کرے جو پیش نظر علمی کام کے لئے زندگیاں وقف کرنے کو تیار ہوں"

"دوسرے یہ کہ ایک قرآنی اکیڈمی کا قیام عمل میں لایا جائے ——— جو ایک طرف علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا بندوبست کرے تاکہ قرآن کا نور عام ہو اور اس کی عظمت لوگوں پر آشکارا ہو اور دوسری طرف ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت کا اہتمام کرے جو بیک وقت علوم جدیدہ سے بھی بہرہ ور ہوں اور قرآن کے علم و حکمت سے بھی براہ راست آگاہ ہوں تاکہ متذکرہ بالا علمی کاموں کے لئے راہ ہموار ہو سکے۔

علوم قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت کا اہم ترین نتیجہ یہ نکلے گا کہ عام لوگوں کی توجّہات قرآن حکیم کی طرف مرکوز ہوں گی، ذہنوں پر اس کی عظمت کا نقش قائم ہوگا، دلوں میں اس کی محبّت جاگزیں ہوگی اور اس کی جانب

ایک عام التفات پیدا ہوگا۔ نتیجۃً بہت سے ذہین اور اعلیٰ صلاحیتیں رکھنے والے نوجوان بھی اس سے متعارف ہوں گے اور کوئی وجہ نہیں کہ ان میں سے ایک اچھی بھلی تعداد ایسے نوجوانوں کی نہ نکل آئے جو اس کی قدر و قیمت سے اس درجہ آگاہ ہو جائیں کہ پوری زندگی کو اس کے علم و حکمت کی تحصیل اور نشر و اشاعت کے لئے وقف کر دیں ——— ایسے نوجوانوں کی تعلیم و تربیت اس اکیڈمی کا اصل کام ہوگا، اور اس کے لئے ضروری ہوگا کہ ان کو پختہ بنیادوں پر عربی کی تعلیم دی جائے۔ یہاں تک کہ ان میں زبان کا گہرا فہم اور اس کے ادب کا ستھرا ذوق پیدا ہو جائے۔ پھر انہیں پورا قرآن حکیم سبقاً سبقاً پڑھایا جائے، اور ساتھ ہی حدیثِ نبوی صلی اللہ علیہ وسلم، فقہ اور اصول فقہ کی تعلیم دی جائے ——— پھر ان میں سے جو لوگ فلسفہ و الٰہیات کا ذوق رکھنے والے ہوں گے۔ ان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ قرآن حکیم کی روشنی میں جدید فلسفیانہ رجحانات پر مدلل تنقید کریں۔ اور جدید علم الکلام کی بنیاد رکھیں اور جو عمرانیات کے مختلف شعبوں کا ذوق رکھنے والے ہوں گے ان کے لئے ممکن ہوگا کہ وہ زندگی کے مختلف شعبوں کے لئے اسلام کی رہنمائی و ہدایت کو اعلیٰ علمی سطح پر پیش کر سکیں۔"

الحمد للہ کہ ڈاکٹر صاحب موصوف نے اس لائحہ عمل کو پیش کرنے کے ساتھ ہی فوری طور پر یعنی اوائل ۱۹۶۸ء ہی سے عملی جدوجہد کا آغاز بھی کر دیا۔ تقریباً پانچ سال تک ڈاکٹر صاحب بغیر کسی ہیئت تنظیمی کے خالصتہً انفرادی حیثیت میں کام کرتے رہے لیکن رفتہ رفتہ اعوان و انصار کی ایک جماعت ان کے گرد جمع ہو گئی جس کے نتیجے میں اواخر ۱۹۷۲ء میں مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور کا قیام عمل میں آگیا جس کے اغراض و مقاصد حسب ذیل معین ہوئے:۔

(اگلے صفحہ پر دیکھئے!)

۱ و عربی زبان کی تعلیم و ترویج
۲ و قرآن مجید کے مطالعے کی عام ترغیب و تشویق
۳ و علومِ قرآنی کی عمومی نشر و اشاعت
۴ و ایسے نوجوانوں کی مناسب تعلیم و تربیت جو تعلیم و تعلّم قرآن کو مقصدِ زندگی بنالیں۔ اور
۵ و ایک ایسی "**قرآن اکیڈمی**" کا قیام جو قرآن حکیم کے فلسفہ و حکمت کو وقت کی اعلیٰ ترین علمی سطح پر پیش کر سکے!

انجمن کے باقاعدہ قیام سے بھی پہلے ایک صاحبِ خیر نے چھ کنال پر مشتمل ایک قطعۂ زمین واقعہ بلاک 'بی'، ماڈل ٹاؤن، **قرآن اکیڈمی**، کے لئے پیش کر دیا تھا۔ لیکن ڈاکٹر صاحب کا ابتدا ہی سے خیال تھا کہ مجوّزہ قرآن اکیڈمی پنجاب یونیورسٹی کے نئے کیمپس کے گرد و نواح میں ہونی چاہیئے تاکہ زیرِ تعلیم نسل کے ساتھ ایک قریبی رابطہ رکھا جا سکے، چنانچہ کافی وقت اس تگ و دو میں صرف ہو گیا کہ کوئی قطعۂ زمین کیمپس سے بالکل ملحق مل جائے، اور جب اس میں ناکامی ہوئی تو بالآخر ماڈل ٹاؤن ہی کے بلاک 'کے'، میں پلاٹ نمبر ۳۶ لگ بھگ ایک لاکھ روپے کے خرچ سے خرید کیا گیا جو یونیورسٹی کے ہاسٹلوں کے پچھواڑے سے صرف نصف میل کے فاصلے پر ہے۔

اس کے بعد کچھ مزید وقت موہوبہ قطعۂ زمین کے انجمن کے نام باقاعدہ انتقال اور پھر اس کی فروخت میں صرف ہو گیا۔ جس سے انجمن کو ڈیڑھ لاکھ روپے حاصل ہوئے۔ تا آنکہ جیسا کہ آغاز میں عرض کیا جا چکا ہے انجمن کی تاسیس کے لگ بھگ سوا تین سال بعد قرآن اکیڈمی کی تعمیر کا آغاز ہو گیا۔ فللّٰہ الحمد والشکر!

تعمیر کا مجوّزہ نقشہ جس کی باضابطہ منظوری حاصل کی جا چکی ہے، چار دیواری اور ٹیوب ویل کے علاوہ حسبِ ذیل تعمیرات پر مشتمل ہے:

۱ ۔ اساتذہ اور اسٹاف کے لئے رہائشی کوارٹرز کا ایک دو منزلہ بلاک جو تین تین کمروں کے آٹھ مکانات پر مشتمل ہے ۔

۲ ۔ پچاس کے لگ بھگ طلبہ کے قیام کے لئے مناسب **دارالمقامہ**[1] ۔

۳ ۔ ایک چالیس فٹ چوڑا اور ستر فٹ لمبا **قرآن ہال** ۔

۴ ۔ ۳۰ × ۲۰ سائز کے دو لیکچر روم ۔

۵ ۔ ایک ۴۰ × ۲۵ کا بڑا کمرہ جس میں عارضی تقسیم سے انجمن اور اکیڈمی کے دفاتر کے لئے گنجائش نکالی جا سکے ۔

اس منصوبے کی تکمیل پر لگ بھگ پندرہ لاکھ روپیہ صرف ہوگا ۔ ان سطور کی تحریر کے وقت تک تقریباً تین لاکھ روپے صرف ہو چکے ہیں اور چار رہائشی کوارٹر، دو لیکچر روم اور ایک بڑا کمرہ برائے دفاتر تکمیل کے قریب ہیں ۔ خیال یہ ہے کہ دارالمقامہ اور قرآن ہال کی تعمیر کو دوسرے مرحلے تک ملتوی کرتے ہوئے اگر بقیہ تعمیرات مکمل ہو جائیں تو انجمن کا دفتر بھی ۱۲ ۔ افغانی روڈ، سمن آباد سے وہاں منتقل کر دیا جائے اور چار رہائشی کوارٹروں کو ہاسٹل کے طور پر استعمال کرتے ہوئے تدریس کا آغاز بھی کر دیا جائے پھر جیسے جیسے اہل خیر سے تعاون حاصل ہوتا جائے تعمیر کے پورے منصوبے کی تکمیل کر لی جائے ۔

لیکن اس پہلے مرحلے کی تکمیل کے لئے بھی فوری طور پر کم از کم تین لاکھ روپے درکار ہیں، اس وقت صورت یہ ہے کہ انجمن کے پاس جتنی رقم تھی وہ سب صرف کی جا چکی ہے اور اگر اہل خیر کا تعاون فوراً حاصل نہ ہوا تو خدشہ ہے کہ یہ پہلا مرحلہ بھی بیچ ہی میں نہ رہ جائے ۔ لہٰذا اس تحریر کے ذریعے ان حضرات سے تعاون کی اپیل کی جاتی ہے جنہیں **قرآن اکیڈمی** کے متذکرہ بالا منصوبے سے اتفاق بھی ہو اور دلچسپی بھی ،

وَمَا تَوْفِيقُنَا إِلَّا بِاللّٰهِ الْعَلِيِّ الْعَظِيمِ

---

[1] ہاسٹل کے لئے عام طور پر مستعمل لفظ دارالاقامہ ہے ۔ لیکن ہم نے یہ نام سورۃ فاطر کی آیت ۳۵ سے اخذ کیا ہے ۔

چند امور مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور سے متعلق

۱ - مرکزی انجمن خُدام القرآن لاہور سوسائیٹز رجسٹریشن ایکٹ ۱۸۶۰ء کے تحت باقاعدہ رجسٹرڈ ہے اور بردست اس کا رجسٹرڈ آفس نمبر ۱۲ - افغانی روڈ، سمن آباد لاہور پر واقع ہے ۔

۲ - ڈاکٹر اسرار احمد صاحب کو اس کے موسّس اور تاحین حیات صدر کی حیثیت حاصل ہے اور پالیسی اور لائحہ عمل کے ضمن میں انجمن ان ہی کی رہنمائی اور صوابدید کے مطابق کام کرتی ہے ۔

۳ - لیکن وہ انجمن کے فنڈز میں سے ایک پیسہ بھی خود خرچ نہیں کرتے بلکہ جملہ اخراجات انجمن کی مجلس منتظمہ (جس کے بارہ اراکین میں سے دس منتخب ہوتے ہیں اور صرف دو نامزد) کے زیر نگرانی انجمن کے ناظم اعلیٰ اور ناظم بیت المال مشترکہ طور پر کرتے ہیں ۔

۴ - انجمن کے حسابات کے ضمن میں ایک داخلی احتساب INTERNAL AUDIT کا نظام بھی قائم ہے اور مزید برآں ہر سال حکومت کے منظور شدہ CHARTER-ED ACCOUNTANTS سے بھی AUDIT کرایا جاتا ہے ۔

۵ - انجمن کو دیئے جانے والے عطیات حکومت پاکستان کے سنٹرل بورڈ آف ریونیو کے ایس - آر - او نمبر ۷۴/ V-T ۱ - (۱۱) ۱۷ مورخہ ۲۰ فروری ۱۹۷۶ء مطابق انکم ٹیکس ایکٹ کی دفعہ (۱ - ۱۵) ۱ کے تحت مستثنیٰ قرار دیئے جاچکے ہیں ۔

۶ - انجمن کا حساب یونائیٹڈ بنک لمیٹڈ کی سمن آباد برانچ میں کرنٹ اکاونٹ نمبر ۱۳۰ پر کھلا ہوا ہے - جو حضرات چاہیں وہاں براہ راست رقوم جمع کرا کے بنک سلپ ہمیں ارسال کر دیں ۔

الداعی الی الخیر

(ڈاکٹر) نسیم الدین خواجہ

ناظم شعبۂ نشر و اشاعت، مرکزی انجمن خدّام القرآن لاہور (رجسٹرڈ)

مطبوعہ: مکتبۂ جدید پریس لاہور

Payments made to Maktaba Markazi Anjuman Khuddamul Quran	1,17,839.52★
Purchase of Assets :	
Books for Library	3,176.75
Furniture and Fixtures	6,243.00
Tape Recorder	2,849.50
Loud-Speaker	2,642.00
Land for Quran Academy	97,312.62
Total Payments Rupees	3,38,574.53
Cash-in-hand and with Bank as at 31-12-75 Rupees	1,72,055.95

★This amount represents the following assets in the books of Maktaba, as on 31-12-75 :

Stock of Books	82,628.83
Furniture	2,921.25
Royalty	15,000.00
Sundry Debtors (Less Creditors)	4,919.05
Loans & Advances	4,798.00
Cash-in-hand & with Bank	7,572.39
Total Rupees	1,17,839.52

Income Tax on donations to the "Anjuman" has been exempted by the Government of Pakistan under Section 15-D of Income Tax Act vide C. B. R. Notification No. S. R. O. 71 (II)-IT-V/74 dated 20-2-76.

CONSOLIDATED STATEMENT OF ACCOUNTS OF MARKAZI ANJUMAN KHUDDAM-UL-QURAN LAHORE

FOR THE PERIOD 4TH NOVEMBER, 1972 TO 31ST DECEMBER, 1975

Duly Audited by HAMEED CHAUDHRI & CO.
Chartered Accountants

RECEIPTS

Initial contributions of Founder Members	1,00,000.00
Initial contributions of Mohsineen	45,000.00
Initial contributions of Permanent Members	26,000.00
Monthly contributions	63,060.00
General contributions	60,467.00
Zakat	14,955.00
Miscel. Receipts	2,135.00
Donations for purchase of plot of land for Quran Academy	36,000.00
Donations for office at Karachi	13,013.48
Proceeds from sale of plot of land donated to Anjuman	1,50,000.00
Total Receipts Rupees	5,10,630.48

LESS : PAYMENTS

Staff Salaries	13,721.35
Postage, Telegrams and Telephone	6,226.77
Stationery and Printing	1,933.72
Office Rent etc.	33,000.00
Zakat	2,420.00
Electricity, Gas and Water Charges	3,593.97
Guest House Expenses	1,903.01
News Papers and Magazines	388.85
Travelling Expenses and Conveyance charges	7,709.71
Miscel. Expenses	6,458.69
Bank Charges	53.60
Quran Conferences Expenses	10,494.75
Al-Kuliat Arabia Expenses	3,268.41
Publicity Expenses	6,080.45
Training Camp and Meetings Expenses	4,946.73
Sundry Debtors (Advances)	6,311.13

ان شاء اللہ العزیز

اتوار ۸ - اگست ۷۶ء سے اتوار ۱۵ - اگست ۷۶ء تک

راولپنڈی میں

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

کے زیر اہتمام

آٹھ روزہ

قرآنی تربیت گاہ

منعقد ہوگی - جس میں

ڈاکٹر اسرار احمد

صدر مؤسس، مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

مطالعہ قرآن کے اپنے مرتب کردہ منتخب نصاب کا سلسلہ وار درس دیں گے روزانہ درس قرآن کی دو نشستیں ہونگی، ایک عصر تا مغرب دوسری مغرب تا عشا

راولپنڈی ، اسلام آباد اور گرد و نواح کے لوگوں سے
شرکت کی درخواست کی جاتی ہے

(نوٹ) باہر سے تشریف لانے والے حضرات کے قیام و طعام کا اجتماعی انتظام ہوگا جس کے لئے مناسب خرچ شرکاء کو ادا کرنا ہوگا ، ایسے حضرات زیادہ سے زیادہ ۳۱ جولائی تک انجمن کے مرکزی دفتر کو اپنے ارادے سے مطلع فرما دیں -

المعلن : ناظم شعبۂ نشر و اشاعت ، مرکزی انجمن خدام القرآن - لاہور

Regd. L. No. 7603

Monthly MEESAQ Lahore

Vol. 23 | JULY '76 | No. 2 to 7

الحمد للہ کہ

مولانا امین احسن اصلاحی

کی تفسیر

تدبرِ قرآن

کی جلد چہارم ، از سورۂ کہف تا سورۂ قصص

شائع ہو گئی ہے

۲۹/۸ × ۲۲ کے ۸۶۴ صفحات ہدیہ ۵۰/-

(محصول ڈاک علاوہ)

(ہم سے براہ راست طلب کرنے پر ۱۵ فیصد رعایت ، البتہ وی پی کی فرمائش کے ساتھ بیس روپے بذریعہ منی آرڈر آنے لازمی ہیں ۔ بصورت دیگر تعمیل نہیں ہو سکے گی)

المعلن : ناظم مکتبہ

مرکزی انجمن خدام القرآن لاہور

ڈاکٹر اسرار احمد (ناشر) نے بااہتمام چوہدری رشید احمد (طابع) مکتبہ جدید پریس شارع فاطمہ جناح لاہور سے چھپوا کر دفتر مرکزی انجمن خدام القرآن، ۱۲- افغانی روڈ ۔ سمن آباد ۔ لاہور سے شائع کیا ۔